تحریکی شعور

نعیم صدیقیؒ

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش کش

بخدمت

ہم مقصد معاصرین!

ان کے بعد آنے والی نسلوں کے نام

نیز ان سے بھی بعد آنے والی نسلوں کے نام

ـــــــ اور دنیا بھر کے علم بردارانِ تحریک اسلامی

کے نام!

[مصنف]

شہداء علی النّاس کی ذمّے داریاں

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ؕ ھُوَ اجْتَبٰکُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰھِیْمَ ؕ ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَ تَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۚ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ ؕ ھُوَ مَوْلٰکُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَ نِعْمَ النَّصِیْرُ ﴿۷۸﴾ (الحج:۷۷-۷۸)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، رکوع اور سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو اور نیک کام کرو، شاید کہ تم کو فلاح نصیب ہو، اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمھیں اپنے کام کے لیے چُن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہوجاؤ اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمھارا نام ”مسلم“ رکھا تھا اور اس [قرآن] میں بھی [تمھارا یہی نام ہے]۔ مدّعا یہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ وہ ہے تمھارا مولیٰ۔ بہت ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور بہت ہی اچھا ہے وہ مددگار!“

سبقِ اوّل

اس کتاب کا اصل مقصد دعوتِ اسلامی کے علم برداروں میں تحریکی شعور کی تجدید کرنا ہے۔ ہم لوگ ایک سچا عقیدہ، روشن نظریہ، پائیدار نصب العین، مستقیم طریق کار، بہترین اخلاقی اقدار اور جذبۂ توسیعِ دعوت لے کے ۱۹۴۱ء میں چلے۔ اور اب ہم ۱۹۸۸ء کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ قریباً ۴۷ سال کی جادہ پیمائیوں اور خاراشگافیوں کے بعد اب ہم کہاں پہنچے ہیں؟

تحریکوں کا اصل پیمانۂ کامیابی یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان کا علم اٹھا کے چلے ہوں وہ اپنے عقیدوں، اصولوں، اخلاقیات اور طریقِ کار پر مضبوطی سے قائم رہ کر اپنا پیغام پھیلائیں۔ خواہ بہت بہت سے لوگ جلد جلد قبول کرلیں، یا تھوڑے تھوڑے لوگ آہستہ آہستہ اختیار کریں۔

ہر مرحلے پر اور ہر قدم پر یہ سوچنا کہ ہم کیا چیزیں لے کے چلے تھے اور ان میں کیا کمی واقع ہوگئی ہے؟ یا کن چیزوں کو ترک کیا تھا اور اب آہستہ آہستہ زندگی میں وہ پھر سر اٹھا رہی ہیں؟ ہم نے جو اصولی طریق کار مختلف انداز کا اختیار کیا تھا اس میں کہاں تک جھول پیدا ہوگئے ہیں اور کہاں تک ہم دوسروں کے طریقہ ہائے کار سے مرعوب و متاثر ہوگئے ہیں؟ جس سیلاب غلاظت کے خلاف ہم ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر اور قدم جما کر مقابلہ کرنے کے لیے اُٹھے تھے، اس کے سامنے جھکنے اور مزاحمت کو کمزور کرنے کے انداز کس حد تک ہم میں گھُسے ہیں؟ نیکی اور سچائی کے بہت سے دینی موقف ایسے ہیں کہ ان پر مضبوطی سے کھڑے رہنے کے خلاف ہمارے پاس 'معذرتیں' جمع ہوگئی ہیں اور وقت کی کتنی طاغوتی ادائیں اور بدعتی رسوم اور ثقافتی دلچسپیاں ہیں کہ جن کے لیے ہم نے اضطرار سے لے کر جواز تک کی ساری راہیں کھول لی ہیں؟

اس طرح کا جائزہ لینے سے تحریکی شعور تازہ ہوتا ہے اور ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ

بار بار ہم اپنے تحریکی شعور کو تازہ کریں۔ کتاب وسنت کے گہرے مطالعہ سے، اسلامی لٹریچر کے پڑھنے سے، تربیت گاہوں کے فیضان سے، قرآن کے درسوں سے، عالموں کی دی ہوئی روشنی سے، جماعت کو بنانے اور اسے صحیح طور پر چلانے والے سابق اکابر کی زندگیوں کے نمونے سے، اپنا احتساب کرنے والی گفتگوؤں سے ہم بھرپور استفادہ کرکے اپنے ایمان اور تحریکی شعور اور تنظیمی لوازم اور اخلاقی وسیاسی کشاکش کے صحیح اصولوں سے آگہی حاصل کریں۔

اپنے ایمانی علم کو بلند تر رکھنے، اپنے تحریکی جذبے کی موجوں کو متحرک رکھنے، اپنے شعور کے فانوس کو روشن کرنے اور اپنے اخلاق کے پھولوں کی نکہت کو پھیلانے اور دنیا بھر کو سچائی، نیکی اور اقامتِ دین کی طرف بلانے کے لیے آئندہ اوراق آپ کی کچھ نہ کچھ مدد کریں گے۔

نعیم صدیقی

نوٹ: اس کتاب کے بیش تر مضامین پاکستان کے پسِ منظر میں لکھے گئے ہیں لیکن اس کی افادیت ہر جگہ کے لیے یکساں ہے۔ ناشر

باتیں اُن کی یاد رہیں گی

[ارشاداتِ مولانا مودودیؒ]

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تلقینات، تعلیمات اور وصیتوں میں سے نہایت اساسی اور اثر انگیز باتیں عنوانات کے ساتھ میں نے اپنے لیے جمع کر رکھی تھیں، کیونکہ اس سے دعوت، تنظیم اور تزکیہ کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ ان تحریروں میں سے ایک حصہ سامنے آ گیا۔ وہ اس مصرع کو گنگناتے ہوئے پیش کر رہا ہوں کہ ع

باتیں ان کی یاد رہیں گی!

درخواست ہے کہ دلی توجہ سے ان عبارتوں کو پڑھیے اور پھر ان کے آئینے میں جھانکیے کہ کیا دکھائی دیتا ہے؟

بڑا دعویٰ بڑا کام

''جماعت کے ارکان کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ایک بہت بڑا دعویٰ لے کر بہت بڑے کام کے لیے اُٹھ رہے ہیں۔ اگر ان کی سیرتیں ان کے دعوے کی نسبت سے اس قدر پست ہوں کہ نمایاں طور پر ان کی پستی محسوس ہوتی ہو تو وہ اپنے آپ کو اور اپنی دعوت کو مضحکہ بنا کر رکھ دیں گے۔ اس لیے ہر شخص کو جو اس جماعت میں شامل ہو، اپنی دوہری ذمے داری محسوس کرنی چاہیے۔ خدا کے سامنے تو وہ بہرحال ذمے دار ہے ہی، مگر خلقِ خدا کے سامنے بھی اس کی ذمے داری بہت سخت ہے۔

جس بستی میں آپ موجود ہوں، وہاں عام آبادی سے آپ کے اخلاق بلند تر ہونے چاہییں،

بلکہ آپ کو بلندیِ اخلاق، پاکیزگیِ سیرت اور دیانت وامانت میں ضرب المثل بن جانا چاہیے۔

اکابر کے دعاوی اور ان کی تعلیمات کیا تھیں؟ قربانیاں کس جذبے سے دی گئیں؟ بعد میں ہوا کیا اور جن سیاست کاروں کے ہاتھ میں میدان ہے وہ کیا کارنامے انجام دے رہے ہیں؟

سوچتے سوچتے آخر یوں محسوس ہوتا ہے کہ مستقبل کی ذمے داری کا زیادہ تر بوجھ خود اپنے ہی سر ہے۔

ہمارے کرنے کا بنیادی کام یہ ہے کہ ہم اپنے خواص وعوام کو توحید کی دعوت دیں۔ ان کے سامنے اقامتِ دین کا مقصد رکھیں اور اس مقصد کے لیے انھیں تیار کریں کہ وہ خود اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ سارے معاشرے میں اسی پیغام کو آگے پھیلائیں۔

ہمیں تحریر اور تقریر کے علاوہ انفرادی سطح پر بات کر کے اپنے اپنے حلقہ ہائے ربط میں تعمیری سیاست اور تعمیر پسند قیادت کا صحیح اسلامی تصور پھیلانا چاہیے۔

بطور خاص یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دوسروں کی مار چونکہ صرف تقاریر اور اخباری بیانات تک ہے اس لیے کہ اگر انفرادی رابطوں کے ذریعے ہر سطح پر تحریکِ اسلامی کے کارکن اصولی و تعمیری سیاست کا شعور پیدا کرنے کی مہم میں لگ جائیں تو ایک سال کے عرصے کا زوردار کام بھی بہت نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

ہمارے لیے کامیابی کی مشکل شرط یہ ہے کہ ہم لوگ دوسروں کی اٹھائی ہوئی غلط رَو میں بہنے سے پرہیز کریں، غلط الفکر عناصر کے ٹیڑھے اندازِ گفتگو کو نہ اپنائیں اور نہ کسی کی ''حمایت برائے حمایت'' اور ''مخالفت برائے مخالفت'' کریں، جو چیز بھی سیاست میں مروّج ومقبول ہوتی نظر آئے، اپنے پچھلے اور موجودہ موقف کو بھول بھلا کر اُس نئی چیز کا علَم نہ اٹھالیں یا اپوزیشن لیڈروں کی زیادہ تعداد جدھر جارہی ہو، اُدھر ہی نہ چل دیں۔

ہم اپوزیشن میں تو ہیں، مگر اپنے دینی اصولوں کی بنیاد پر اور اپنے تعمیری مقاصد کے لیے۔ پس ہمارا تحریکی وجود فضا میں بہت ممتاز اور نمایاں رہنا چاہیے۔

آپ کی ایک معمولی لغزش نہ صرف جماعت کے دامن پر، بلکہ اسلام کے دامن پر دھبّہ لگا دے گی اور بہت سے لوگوں کے لیے سببِ گمراہی بن جائے گی۔''

[روداد اجتماعِ اوّل۔تقریر مولانا مودودیؒ]

مطلوب گہری تبدیلی ہے

''یہاں کا طریقِ کار قرآن اور سیرتِ محمدیؐ اور صحابہؓ کی سیرتوں سے سیکھیے اور اس کی عادت ڈالیے۔ آپ کو زبان یا قلم یا مظاہروں سے عوام پر سحر نہیں کرنا ہے کہ ان کے ریوڑ کے ریوڑ آپ کے پاس آجائیں اور آپ انھیں ہانکتے پھریں۔ آپ کو ان میں حقیقتِ اسلامی کی معرفت پیدا کرنی چاہیے اور عرفانِ حقیقت کے بعد ان میں یہ عزم پیدا کرنا ہے کہ وہ اپنی انفرادی زندگی اور گردوپیش کی اجتماعی زندگی کو اس حقیقت کے مطابق بنائیں اور جو کچھ باطل ہو اُس کو مٹانے میں جان و مال کی بازی لگادیں۔

لوگوں کے اندر گہری تبدیلی ساحری اور شاعری سے پیدا نہیں ہوا کرتی۔''

[روداد اجتماع اوّل، ص ۵۰، تقریر مولانا مودودیؒ]

تعلّق باللہ

''اس تحریک کی جان دراصل تعلق باللہ ہے۔ اگر اللہ سے آپ کا تعلق کمزور ہو تو آپ حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے اور کامیابی کے ساتھ چلانے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا فرض عبادات کے ماسوا نفل عبادات کا بھی التزام کیجیے۔ نفل نماز، نفل روزے اور صدقات وہ چیزیں ہیں جو انسان کے اندر خلوص پیدا کرتی ہیں۔ اور ان چیزوں کو زیادہ سے زیادہ اخفا کے ساتھ کرنا چاہیے، تاکہ ریا نہ پیدا ہو۔'' [روداد اجتماع اوّل، ص ۷۴، تقریر مولانا مودودیؒ]

مطالعۂ قرآن و سیرت النبیؐ

''جماعت کے ارکان کو قرآن اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرتِ صحابہؓ سے خاص شغف ہونا چاہیے۔ ان چیزوں کو بار بار زیادہ گہری نظر سے پڑھا جائے اور محض عقیدت کی پیاس بجھانے کے لیے نہیں، بلکہ ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے پڑھا جائے۔''

[روداد اجتماع اوّل، ص ۷۴، تقریر مولانا مودودیؒ]

نماز میں خشوع و خضوع

''نماز سمجھ کر پڑھیے، اس طرح نہیں کہ ایک یاد کی ہوئی چیز کو آپ زبان سے دوہرا رہے

ہیں، بلکہ اس طرح کہ آپ خود اللہ سے کچھ عرض کر رہے ہیں۔ نماز پڑھتے وقت اپنے نفس کا جائزہ لیجیے کہ جن باتوں کا اقرار آپ عالم الغیب کے سامنے کر رہے ہیں، کہیں آپ کا عمل ان کے خلاف تو نہیں ہے اور آپ کا اقرار جھوٹا تو نہیں ہے، اس محاسبۂ نفس میں اپنی جو کوتاہیاں آپ کو محسوس ہوں ان پر استغفار کرنا چاہیے۔ اور آئندہ ان خامیوں کو رفع کرنے کی کوشش کیجیے۔"

[روداد اجتماع اوّل، ص ۴۷، تقریر مولانا مودودیؒ]

ذکرِ الٰہی

"اس اجتماع کا افتتاح کرتے ہوئے سب سے پہلے میں آپ کو ذکرِ الٰہی کی نصیحت کرتا ہوں۔ یوں تو اللہ کی یاد انسان کی روحانی زندگی کے لیے ہر آن اسی طرح ضروری اور ناگزیر ہے جس طرح ہماری مادّی زندگی کے لیے سانس، لیکن اُن مواقع پر خصوصیت کے ساتھ اس کا اہتمام ہونا چاہیے جہاں خدا سے غفلت کے مختلف اسباب ومحرکات زیادہ جمع ہو جائیں۔ ایسے مواقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو خاص طور پر اللہ کی یاد کے التزام کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ اور چونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کے لیے یہ موقع بھی ان مواقع میں سے ہے جہاں بہت سی چیزیں آپ کو خدا سے غافل کر سکتی ہیں، اس وجہ سے میں خصوصیت کے ساتھ آپ کو اللہ تعالیٰ کی یاد کی تاکید کرتا ہوں یہ یاد ہی آپ کے فکر ونظر کو روشن رکھے گی اور آپ جن باتوں پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں اسی کی مدد سے اُن میں آپ کو صحیح نتائج پر پہنچنے کی توفیق حاصل ہوگی۔ یہی چیز آپ کو اُس وقت ہجو اور غیبت اور دوسروں کی توہین وتحقیر سے بچائے گی۔ جب آپ خیموں اور شامیانوں میں اکٹھے ہوں گے۔ اور یہی چیز آپ کے دلوں اور زبانوں کی ان اوقات میں حفاظت کرے گی جب کہ آپ کی رایوں میں اختلاف اور خیالات میں تصادم کی کوئی وجہ پیدا ہوگی۔ اور اس چیز کی مدد سے آپ اپنی اس مسافرانہ زندگی کے بے شمار مرحلوں میں اپنے اخلاق اور ایمان کو فتنوں سے بچا سکیں گے۔"

[افتتاحی خطاب۔ کل ہند اجتماع جماعتِ اسلامی بمقام الٰہ آباد ۱۹۴۶]

لٹریچر کا مطالعہ

"جماعت کی طرف سے شائع ہونے والے لٹریچر کا مطالعہ کیا جائے۔ نہ صرف تازہ شائع ہونے والی چیزوں کا، بلکہ پہلی مطبوعات کا بھی، تاکہ اُن کے مضامین بار بار ذہن میں تازہ

ہوتے رہیں۔ خصوصاً دستور کو وقتاً فوقتاً جماعت کے اجتماعات میں پڑھا جاتا رہے۔''
[روداد حصہ اوّل، ص ۱۱۵]

اعلیٰ کیریکٹر

''اب اس پہلو پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ اس نصب العین کے لیے جدوجہد کرنا تو درکنار اس کا نام زبان پر لانے کے لیے بھی اعلیٰ کیریکٹر ضروری ہے۔'' [روداد حصہ اوّل، ص ۱۱۵]

قول و فعل کی نگرانی

''آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ آپ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے اُٹھے ہیں، اس طرح کی جماعت کا فرض ہے کہ وہ ہر وقت اپنے قول و فعل کی کڑی نگرانی رکھے کہ اس سے کوئی بات ایسی نہ صادر ہو جائے جو خدا کی مرضی کے خلاف ہو۔'' [روداد حصہ اوّل، ص ۱۱۵]
[افتتاحی خطاب کل ہند اجتماع جماعتِ اسلامی۔ الہ آباد ۱۹۴۶]

ایک ضروری صفت

''کم از کم ہمارے ابتدائی کارکن جو سابقینِ اوّلین کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی تو یہ صفت ہونی چاہیے کہ ان میں سے ہر شخص کے اندر یہ داعیہ موجود ہو کہ اگر کوئی اس راہ پر چلنے والا نہ ہو تو وہ خود چلے گا۔ اور کوئی اکسانے والا نہ ہو تو نہ صرف وہ خود حرکت کرے گا، بلکہ دوسروں کو بھی حرکت دے گا۔'' [روداد حصہ اوّل، ص ۱۰۶]

تحریکِ اسلامی کی نوعیت اور مطلوبہ کارکن

''حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریک عام تحریکوں سے بنیادی اختلافات رکھتی ہے۔ اوّلاً یہ کہ اس کے سامنے پوری زندگی کا مسئلہ ہے، زندگی کے کسی ایک پہلو کا نہیں، ثانیاً یہ کہ خارج سے پہلے یہ باطن سے بحث کرتی ہے۔

جہاں تک پہلے پہلو کا تعلق ہے ہمارے سامنے کام اتنا بڑا اور اہم ہے جو اسلامی تحریک کے سوا دنیا کی کسی تحریک کے سامنے نہیں ہے اور ہم اُس جلد بازی کے ساتھ کام نہیں کر سکتے جس جلد بازی سے دوسرے کر سکتے ہیں۔

پھر چونکہ ہمارے لیے خارج سے بڑھ کر باطن اہمیت رکھتا ہے اس وجہ سے محض تنظیم اور محض ایک چھوٹے سے ضابطہ بند پروگرام پر لوگوں کو چلانے اور عوام کو کسی ڈھرے پر لگا دینے سے ہمارا کام نہیں چلتا۔

ہمیں عوام میں عمومی تحریک (Mass Movement) چلانے سے پہلے ایسے آدمیوں کو تیار کرنے کی فکر کرنی چاہیے جو بہترین اسلامی سیرت کے حامل ہوں اور ایسی اعلیٰ درجے کی دماغی صلاحیتیں بھی رکھتے ہوں کہ تعمیرِ افکار کے ساتھ اجتماعی قیادت کے دوہرے فرائض سنبھال سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ میں عوام میں تحریک کو پھیلانے کے لیے جلدی نہیں کر رہا، بلکہ میری تمام تر کوشش اس وقت یہ ہے کہ ملک کے اہلِ دماغ طبقوں کو متاثر کیا جائے اور ان کو کھنگال کر صالح ترین کو چھانٹ لینے کی کوشش کی جائے۔ جو آگے چل کر عوام کے لیڈر بھی بن سکیں اور تہذیبی وتمدّنی معمار بھی۔ یہ کام چونکہ ٹھنڈے دل سے کرنے کا ہے اور ایک عمومی تحریک کی طرح فوری ہلچل اس میں نظر نہیں آسکتی ہے۔ اس وجہ سے نہ صرف ہمارے ہمدرد وہم خیال لوگ بلکہ خود ہمارے ارکان تک بددِل ہونے لگتے ہیں۔" [روداد جماعت حصہ اوّل، ص ۹۸]

صحیح تصوّرِ دعوت

"تبلیغ صرف تقریر یا گفتگو یا تحریر ہی کے ذریعے سے نہیں ہوا کرتی، بلکہ اصل تبلیغ وہ ہوتی ہے جو ایک تخیّل کے داعی اپنی پوری زندگی سے ہر آن کرتے رہتے ہیں بشرطیکہ ان کی زندگی اس تخیّل کا مجسم ظہور اور اس کی زندہ شہادت بن گئی ہو۔ آپ جس تخیّل کے داعی ہیں، اگر اس کے سانچے میں آپ کی زندگی پوری طرح داخل ہو تو اس تخیّل کے خلاف چلنے والی دنیا میں آپ کی حالت ایسی ہوگی جیسے ایک گول سوراخ میں چوکھونٹی میخ اپنے پورے وجود سے ہر آن، ہر زاویہ پر اس گول سوراخ کے پورے وجود کے ساتھ متصادم ہوتی رہتی ہے اور ہر وقت اپنے اور اس کے اختلاف کا مظاہرہ کرتی رہتی ہے۔ یا جیسے برف خانہ میں چند دہکتے ہوئے انگارے جو اگرچہ کوئی آواز بلند نہ کر رہے ہوں تب بھی اُن کا وہاں محض موجود ہونا ہی بجائے خود برف کے تودوں کے خلاف ایک مستقل اعلانِ جنگ ہے۔ اگر ان کے اردگرد کوئی آتش گیر مواد موجود ہوگا تو وہ کسی وعظ کے بغیر ان سے اثر لے کر مشتعل ہو جائے گا اور برف خانہ آتش کدے میں تبدیل ہو کر رہے گا۔

بے شعوری کے اسلام اور منافقانہ اسلام کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ لیکن جب کوئی اخلاص کے ساتھ شعوری طریقہ سے اسلام قبول کرلیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی افکار، اخلاق، معیشت، معاشرت، تمدن غرض ہر شعبۂ زندگی میں اپنے غیر اسلامی ماحول سے اس کا تصادم شروع ہو جاتا ہے — اس کی پوری ہستی فضائے جاہلیت کے خلاف ایک احتجاج بن جاتی ہے اور اس فضا میں وہ اس طرح اجنبی و نامانوس ہو کر رہ جاتا ہے جیسے سیاہ چادر پر سفید دھبّہ۔

میں چاہتا ہوں کہ اس کفر و جاہلیت کے مارے ہوئے ماحول میں آپ یہی کچھ بن کر رہ جائیں تاکہ اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں اس نظام کے ہر جز سے ہر ہر قدم پر آپ کا تصادم ہو اور اپنے پورے وجود سے آپ اس کے خلاف ایک مستقل اعلانِ جنگ اور ایک ابدی و دائمی احتجاج بن جائیں — اس کے بغیر تبلیغ افکار کی مہم سرانجام نہیں پاسکتی۔" [روداد جماعت حصہ اوّل، ص ۱۱۲ - ۱۱۳]

دعوتِ اسلامی کے فطری تقاضے

"سب سے بڑی چیز جو ہمارے نزدیک ہر دوسرے نتیجہ سے زیادہ قیمتی ہے وہ یہ ہے کہ اس دعوت کا اثر جہاں جہاں بھی پہنچا ہے، اُس نے مُردہ ضمیروں کو زندہ اور سوئے ہوئے ضمیروں کو بیدار کر دیا ہے۔ اس کی اوّلین تاثیر یہ ہوتی ہے کہ نفس اپنا محاسبہ آپ کرنے لگتا ہے۔ حلال اور حرام، پاک اور ناپاک، حق اور ناحق کی تمیز پہلے کی محدود مذہبیت کی بہ نسبت اب بہت زیادہ وسیع پیمانے پر زندگی کے تمام مسائل میں شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے جو کچھ دین داری کے باوجود کر ڈالا جاتا تھا وہ اب گوارا نہیں ہوتا بلکہ اس کی یاد بھی شرمندہ کرنے لگتی ہے۔ پہلے جن لوگوں کے لیے کسی معاملہ کا یہ پہلو سب سے کم قابلِ توجہ تھا کہ یہ خدا کی نگاہ میں کیسا ہے، ان کے لیے اب یہی سوال سب سے زیادہ مقدم ہو گیا ہے۔ پہلے جو دینی حِس اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ بڑی بڑی چیزیں بھی نہ کھٹکتی تھیں، اب وہ اتنی تیز ہو گئی ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی کھٹکنے لگی ہیں۔ خدا کے سامنے ذمے داری و جواب دہی کا عقیدہ اب احساس بنتا جا رہا ہے اور بہت سی زندگیوں میں اس احساس سے نمایاں تبدیلی ہو رہی ہے۔ لوگ اب اس نقطۂ نظر سے سوچنے لگے ہیں کہ دنیا کی زندگی میں جو کچھ سعی و عمل وہ کر رہے ہیں وہ آیا خدا کی میزان میں کسی قدر وزن کی حامل ہو سکتی ہے یا محض هَبَاءً مَنْثُوْرًا بن جانے والی ہے۔ پھر الحمدللہ اس دعوت نے جہاں بھی نفوذ کی ہے، بے مقصد زندگیوں

کو با مقصد بنایا ہے، صرف ان کے مقصدِ زندگی ہی کو نہیں بلکہ مقصد تک پہنچنے کی راہ کو بھی ان کی نگاہوں کے سامنے بالکل واضح کر دیا ہے۔ خیالات کی پراگندگی دُور ہو رہی ہے، فضول اور دور از کار دل چسپیوں سے دل خود ہٹ رہے ہیں، زندگی کے حقیقی اور اہم تر مسائل مرکزِ توجہ بن رہے ہیں، فکر و نظر ایک منظّم صورت اختیار کر رہی ہے اور ایک شاہراہِ مستقیم پر حرکت کرنے لگی ہے۔''

[رودادِ جماعت حصہ اوّل، ص ۸۱-۸۲]

رائے عامہ کی حمایت مطلوب

''ہمیں نہ صرف ہندوستان میں، بلکہ حتی الامکان دنیا کے گوشے گوشے میں اپنی آواز پہنچانی ہوگی، کیونکہ کسی ایک ملک میں کوئی حقیقی انقلاب واقع نہیں ہوسکتا جب تک کہ وسیع پیمانے پر بین الاقوامی رائے عامہ اس کی تائید میں تیار نہ کر لی جائے۔

- اربوں انسانوں کو ہمارے پیغام سے واقف ہونا چاہیے۔
- کروڑوں انسانوں کو کم از کم اس حد تک اس سے متاثر ہو جانا چاہیے کہ وہ اس چیز کو حق مان لیں جس کے لیے ہم اُٹھ رہے ہیں۔
- لاکھوں انسانوں کو ہماری پشت پر اخلاقی اور عملی تائید کے لیے آمادہ ہو جانا چاہیے۔
- اور ایک کثیر تعداد ایسے سرفروشوں کی تیار ہونی چاہیے جو بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اس مقصدِ عظیم کے لیے کوئی خطرہ، کوئی نقصان، کوئی مصیبت برداشت کرنے میں تامّل نہ کریں۔'' (روداد حصہ اوّل، ص ۶۲ تا ۶۵، ۶۷)

انقلاب کی پیش رَو جماعت

''ہمارے پیشِ نظر صرف یہ نقشہ ہے کہ عوام کی سربراہی کے لیے ایک ایسی مختصر جماعت فراہم کر لی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کیریکٹر کی جاذبیت سے ایک ایک علاقہ کے عوام کو سنبھال سکے۔ اس کی ذات عوام کا مرجع بن جائے اور اس کی مصنوعی کوشش کے بغیر بالکل فطری طریقہ سے عوام کی لیڈر شپ کا منصب اُسے حاصل ہو جائے۔

ایک ٹھوس، پائیدار اور ہمہ گیر انقلاب کا لازمی ابتدائی مرحلہ یہی ہے اس مرحلہ کو صبر سے طے کرنا ہی پڑے گا۔''

[روداد حصہ اوّل، ص ۹۹]

ماہرانہ مورچہ بندی

''خوب سوچ لیجیے کہ میدانِ جنگ میں آپ اُتر رہے ہیں، اس میں دشمن کے مورچے کدھر کدھر اور کس ترتیب سے پھیلے ہوئے ہیں اور اس مقابلہ میں آپ کو کس طرز پر مورچہ بندی کرنی ہے، آپ کے کمزور پہلو کون کون سے ہیں۔ آپ کی جمعیت کو کس کس پہلو سے مضبوط ہونا چاہیے۔ پیش قدمی کدھر سے ہو اور کس رفتار سے ہو۔ غرض یہ کام ہلّڑ مچانے سے نہیں ہوگا۔ اس کے لیے تو ایک ہوشیار جنرل کی دور بینی، وسیع النظری اور اس کے ساتھ ایک نظامِ جماعت میں جکڑی ہوئی جمعیت کی جدوجہد مفیدِ مطلب ہے۔'' [روداد حصہ اوّل، ص ۹۳]

کامیاب انقلاب کی شرطِ لازم

''کوئی نظام بھی عوام کے دلی اور رضا کارانہ تعاون اور ان کو اعتماد میں لیے بغیر نہ مضبوطی کے ساتھ قائم ہوسکتا ہے اور نہ چل سکتا ہے، بالخصوص ایسا نظام جو ہر ہر چیز کو ایک اصول کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہو۔''

[تقریر مولانا مودودیؒ۔ ۱۰ نومبر ۱۹۵۱ء جماعت اسلامی کا اجتماع عام منعقدہ کراچی۔ روداد جماعتِ اسلامی حصہ ششم، ص ۱۳۱]

صبر، تدبُّر، معاملہ فہمی

''جو عظیم الشان مقصد ہمارے سامنے ہے اور جن زبردست طاقتوں کے مقابلے میں ہم کو اُٹھ کر اس مقصد کے لیے کام کرنا ہے اس کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ ہم میں صبر ہو، تدبُّر اور معاملہ فہمی ہو اور اتنا مضبوط ارادہ، جس سے ہم دوررس نتائج کے لیے لگاتار ان تھک سعی کرسکیں۔ بے صبری کے ساتھ جلدی جلدی نتائج برآمد کرنے کے لیے بہت سے ایسے سطحی کام کیے جاسکتے ہیں جن سے ایک وقتی ہلچل برپا ہوجائے، لیکن اس کا کوئی حاصل اس کے سوا نہیں ہے کہ کچھ دنوں تک فضا میں شور رہے اور پھر ایک صدمے کے ساتھ سارا کام اس طرح برباد ہوجائے کہ مدت ہائے دراز تک اس کا نام لینے کی بھی کوئی ہمت نہ کرسکے۔'' [روداد جماعت حصہ اوّل، ص ۸۸-۸۹]

نمائش واشتہار سے پرہیز

’’کہیں ہمارے کام میں بھی نمائش اور اشتہار کا عنصر داخل نہ ہو جائے، ہم دنیا کو دکھانے کے لیے کام نہ کرنے لگیں۔‘‘ [روداد جماعت حصہ اوّل، ص ۷۹، مضمون رفتارِ کار از مولانا مودودیؒ]

نظم کی دینی اہمیت

’’دوسری چیز جس کی اس موقع پر تاکید ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ نظم کی پوری پابندی کا خیال رکھیے۔ مختلف شعبوں میں منتظمین کی طرف سے آپ کو جو ہدایات ملیں اُن کی سرِ مُو خلاف ورزی نہ ہو۔ نماز کی جگہ، کھانا کھانے کی جگہ، اجتماع کی جگہ آپ کی نقل وحرکت ایک منظّم اور باوقار جماعت کی سی ہو۔ کہیں ہڑبونگ اور ہلّڑ کی صورت نہ پیدا کی جائے۔ ڈسپلن کے تقاضوں کو پورا کرنا دوسروں کے نزدیک صرف ایک اجتماعی اخلاق ہے جس کی خلاف ورزی کرنے والا صرف سوسائٹی میں نکّو بنتا ہے، مگر ایک مسلمان کے نزدیک اس کی حیثیت ایک مذہبی فریضہ کی سی ہے۔ جس کی خلاف ورزی سے آخرت میں خدا اور رسولؐ کی ناخوشی بھی متصور ہے اور دنیا میں بھی انسان ذلیل ہوتا ہے۔ کوئی مسلمان اعلیٰ درجے کی جماعتی سیرت کے بغیر اعلیٰ درجہ کا دین دار مسلمان نہیں ہوسکتا، اگرچہ وہ کتنے ہی روزے رکھے اور کتنی ہی نمازیں پڑھے۔ حضور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ (میں اعلیٰ درجہ کے سارے رویوں کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں)۔ اس اعلیٰ اخلاق کا سب سے اعلیٰ نمونہ اگر خود مسلمان نہ بنیں تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ مسلمان اس مقصد سے غافل ہو گئے، جس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارمِ اخلاق کی جو تعلیم دی اور اس کا جو اثر عربوں جیسی جاہل اور اُجڈ قوم پر پڑا اس کا کچھ اندازہ ایرانی سپہ سالار رستم کے اس فقرے سے کیا جاسکتا ہے، جو اس نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی فوجوں کی نمازوں کی صفوں کو دیکھ کر کہا تھا کہ اَكَلَ عُمَرُ كَبَدِىْ يُعَلِّمُ الْكِلَابَ الْاٰدَابَ (عمر تو میرا کلیجہ کھا گیا ہے یہ تو کتوں کو ڈسپلن کی تعلیم دے رہا ہے)۔ جس جماعت کے ڈسپلن پر ایران جیسی متمدن قوم کا سپہ سالار مغلوب الغضب ہو جائے، اس جماعت کی جماعتی سیرت کا تصور کیجیے اور پھر اس سے موازنہ کیجیے۔‘‘

[افتتاحی خطاب۔ کل ہند اجتماع جماعت اسلامی۔ بمقام الٰہ آباد ۱۹۴۶ء۔ روداد حصہ چہارم، ص ۱۲-۱۳]

جماعت کا تحفظ

''جماعت کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کو راہِ راست سے نہ ہٹنے دیا جائے۔ اس میں غلط خیالات اور غلط طریقوں کے پھیلنے کو روکا جائے۔ اس میں نفسیانی دھڑے بندیاں نہ پیدا ہونے دی جائیں۔ اس میں کسی کا استبداد نہ چلنے دیا جائے۔ اس میں کسی دنیوی غرض یا کسی شخصیت کو بُت نہ بننے دیا جائے۔ اور اس کے دستور کو بگڑنے سے بچایا جائے۔''

[رودادِ اجتماع اوّل، ص ۲۲ – ۲۳، تاسیسی اجلاس ۲ شعبان ۱۳۶۰ھ ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء میں مولانا مودودیؒ کا اوّلین خطاب]

اسلامی نظمِ جماعت کے لیے تخریبی عوامل

''جماعت کے اندر جماعت بنانے کی کوشش کبھی نہ کی جائے۔ سازشیں، جتھہ بندیاں، نجویٰ(Canvassing)، عہدوں کی امیدواری، حمیتِ جاہلیہ اور نفسانی رقابتیں، یہ وہ چیزیں ہیں جو ویسے بھی جماعتوں کی زندگی کے لیے سخت خطرناک ہیں، مگر اسلامی جماعت کے مزاج سے تو ان کو کوئی مناسبت ہی نہیں۔ اسی طرح غیبت اور تنابز بالالقاب اور بدظنی بھی جماعتی زندگی کے لیے سخت مہلک بیماریاں ہیں، جن سے بچنے کی ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے۔''

[رودادِ اجتماع اوّل، خطاب مولانا مودودیؒ، ص ۲۴]

جماعتی انتخابات کے لیے اخلاقی فضا

''انتخابات کے سلسلے میں لوگ ایک دوسرے سے نیک نیتی کے ساتھ تبادلۂ خیالات کر سکتے ہیں، مگر کسی کے حق میں نجویٰ اور سعی نہ ہونی چاہیے۔ شخصی حمایت و موافقت کے جذبات کو دل سے نکال کر بے لاگ طریقہ سے دیکھیے کہ آپ کی جماعت میں کون ایسا شخص ہے جس کے تقویٰ، علمِ کتاب وسنت، دینی بصیرت، تدبُّر، معاملہ فہمی اور راہِ خدا میں ثبات و استقامت پر آپ سب سے زیادہ اعتماد کر سکتے ہیں۔ پھر جو بھی نظر آئے اللہ پر توکل کر کے اسے منتخب کرلیں۔''

[رودادِ اجتماع اوّل، خطاب مولانا مودودیؒ]

ہمارا صرف ایک مقصد ہے

''اب میں جو بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی جس غرض کے لیے قائم ہوئی ہے وہ ایک ہے اور صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے دین کو عملاً پوری طرح سے پوری زندگی میں نافذ کیا جائے۔ اس کے سوا اس جماعت کا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس جماعت سے وابستہ ہے، خواہ رکن کی حیثیت سے وابستہ ہو، یا متفق کی حیثیت سے یا کارکن کی حیثیت سے، اسے اس بات کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کا اصل مقصد دینِ حق کو پوری طرح سے خدا کی زمین پر قائم کرنا ہے۔ سیاسی کام بھی اگر ہم کرتے ہیں تو سیاسی اغراض کے لیے نہیں کرتے، اقتدار حاصل کرنے کے لیے نہیں کرتے، بلکہ اس غرض کے لیے کرتے ہیں کہ ان رکاوٹوں کو دور کیا جائے جو دینِ حق کے قیام میں مانع ہو رہی ہیں اور جمہوری ذرائع سے ملک کے اندر اسلامی انقلاب برپا کرنے کا راستہ ہموار کیا جائے۔ جماعت اسلامی کو کیوں اصرار ہے کہ وہ جمہوری ذرائع سے ہی انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے اور کسی غیر جمہوری ذریعہ کے استعمال کی مخالف ہے۔

جماعت نے جو یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ وہ کسی قسم کے تشدد کے ذریعے سے یا کسی قسم کی دہشت پسندانہ تحریک کے ذریعے سے یا کسی قسم کی خفیہ تحریک کے ذریعے سے یا کسی قسم کی سازشوں کے ذریعے سے انقلاب برپا نہیں کرنا چاہتی بلکہ جمہوری ذرائع سے ہی انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے۔ یہ قطعاً کسی کے خوف کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ قطعاً اس لیے نہیں ہے کہ ہم اپنی صفائی پیش کر سکیں کہ ہم دہشت پسند نہیں ہیں اور ہمارے اوپر یہ الزام نہ لگنے پائے۔''

[تقریر مولانا مودودیؒ، اجتماع ارکان مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۷۴ء]

اسلامی انقلاب اور اس کی مضبوط جڑیں

اصل بات یہ ہے کہ اسلامی انقلاب اس وقت تک مضبوط جڑوں سے قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ لوگوں کے خیالات تبدیل نہ کر دیے جائیں، جب تک کہ لوگوں کے افکار، لوگوں کے اخلاق، لوگوں کی عادات کو تبدیل نہ کر دیا جائے، اگر کسی قسم کے تشدد کے ساتھ یا کسی قسم کی سازشوں کے ساتھ یا کسی قسم کے دھوکے بازیوں کے ساتھ اور جھوٹ اور اسی طرح کی مہم کے ساتھ انتخابات جیت بھی لیے جائیں یا کسی طریقے سے انقلاب برپا کر بھی دیا جائے تو چاہے یہ انقلاب کتنی دیر تک

رہے یہ اس طرح اکھڑتا ہے جیسے اس کی کوئی جڑ ہی نہ ہو۔ آپ نے غلام محمد کا دور دیکھا ہے، جب وہ برسرِ اقتدار تھا تو لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ اس کو کوئی ہٹا نہیں سکے گا مگر جب وہ ہٹا تو تعجب ہوا کہ یہ جما ہوا کس چیز پر تھا۔ پھر آپ نے ایوّب صاحب کا دور دیکھا کہ کوئی شخص تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس شخص کو کوئی ہٹا سکے گا لیکن جب وہ ہٹا تو یہ معلوم ہوا کہ اس کی کوئی جڑ ہی نہیں تھی، آج اس کا کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ اسی طرح سے جن لوگوں نے ناجائز ذرائع سے انتخابات جیت کر، بظاہر جمہوری طریقے سے اقتدار حاصل کیا ہے۔ ان کی بھی حقیقت میں کوئی جڑ نہیں ہے۔ [ایضاً]

چاہیے کتنا ہی عرصہ لگ جائے

جماعت اسلامی اس قسم کا تجربہ نہیں کرنا چاہتی۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ چاہے سو برس لگ جائیں لیکن قوم کے ذہن کو تبدیل کیا جائے، اس کی سیرت کو تبدیل کیا جائے، اس کے اخلاق کو تبدیل کیا جائے، اس کے سوچنے کے انداز کو تبدیل کیا جائے اور اس کو اس حد تک تیار کیا جائے کہ وہ اسلامی نظام کا بوجھ سہار سکے اور اسلامی نظام کو چلانے کے قابل ہو سکے۔ [ایضاً]

تیس سالہ محنت کا ثمر

لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے تیس برس اپنا زور لگایا لیکن کیا کر لیا۔ میں کہتا ہوں کہ تیس برس جو ہم نے زور لگایا اس کے ذریعے سے اس وقت خدا کے فضل سے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت جماعت اسلامی کی ہم خیال ہے۔ یعنی جو اہل دماغ طبقہ ہے وہ پورا جماعت اسلامی کا ہم خیال ہو چکا ہے، ان کے اندر جماعت اسلامی کے افکار اتر چکے ہیں۔ سرکاری ملازمتوں میں ہوں یا غیر سرکاری شعبوں میں، جہاں جہاں بھی تعلیم یافتہ لوگ موجود ہیں جماعت اسلامی کے افکار سے متاثر ہیں۔

خیالات اور اخلاق میں انقلاب

اب دوسرا کام جو آپ کے سامنے ہے اور بہت بڑا کام ہے۔ وہ یہ ہے کہ عام لوگوں کے خیالات کو تبدیل کیا جائے۔ عام لوگوں کے اندر اسلامی فکر اور اسلامی نظام کے بنیادی تصورات کو بٹھایا جائے۔ اور لوگوں کے اندر اخلاقی انقلاب برپا کیا جائے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

عوام کا کردار بگاڑنے والے اہلِ اقتدار

اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ پچھلے چھبیس ستائیس سال میں جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک کے اختیارات رہے ہیں، خواہ وہ سیاسی اختیارات ہوں، خواہ وہ معاشی اختیارات ہوں، خواہ وہ تعلیمی اختیارات ہوں، جن لوگوں کے ہاتھ میں بھی ملک کو چلانے کے اختیارات رہے ہیں، انھوں نے قوم کے ذہن کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے، اس کے اخلاق کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے، اس کی سیرت و کردار کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے اور اس کو اسلام سے دور سے دور تر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار مشرقی پاکستان، پاکستان سے الگ ہوگیا۔ وہاں یہ ذہن پیدا کیا گیا کہ بنگالی بولنے والا ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں اور جو بنگالی نہیں بولتا وہ دوسری قوم ہے۔

جاہلی تفرقے پھیلانے کی مہم

یہ خالص کفر وہاں پھیلایا جاتا رہا جس کے نتیجے میں آخر کار مشرقی پاکستان الگ ہوا۔ اور اب یہاں اس کفر کو پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہاں ملک کے اندر یہ ذہن پیدا کیا جارہا ہے اور زبردستی پیدا کیا جارہا ہے کہ یہ پٹھان ہے، یہ بلوچی ہے، یہ سندھی اور یہ پنجابی ہے۔ کیا یہ پاکستان کی بنیاد تھی؟ سارے ہندستان کے مسلمان یہ بھول گئے تھے کہ وہ مسلمان ہونے کے سوا بھی کچھ ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جب انھوں نے کوشش کی اور متحدہ مطالبہ کیا، تب پاکستان وجود میں آیا۔ اگر گجراتی اور مدراسی اور سندھی اور پٹھان اور پنجابی الگ الگ قوم رہتے اور الگ الگ اپنی قومیتوں کا تصور رکھتے تو پاکستان کبھی بن سکتا تھا؟ اب یہ تصوّر باقی ماندہ پاکستان کے بھی ٹکڑے کردینے والا ہے۔ سندھ میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ تصور پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے دراں حالیکہ سندھی مسلمان اور غیر سندھی مسلمان سندھ کا نہایت مخلص اور سیدھا سادا مسلمان ہے۔ وہاں کے تعلیم یافتہ طبقے میں یہ زہر خاص طور پر پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ سندھی بولنے والا ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں اور جو سندھی نہیں بولتا وہ دوسری قوم ہے۔

اخلاقی بگاڑ کی مساعی

ایک طرف تو لوگوں کے نظریات بگاڑنے کی کوشش کی جارہی ہے اور دوسری طرف

اخلاق کو بگاڑنے کے لیے تمام ممکن ذرائع استعمال کیے جارہے ہیں۔ تیسری طرف تعلیم کا ایسا نظام رائج کیا جارہا ہے کہ آدمی کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اسلامی نظام چلانے کے لیے تیار کیا جارہا ہوں یا سوشلزم کے نظام کو چلانے کے لیے تیار کیا جارہا ہوں یا کوئی نظام چلانے کے لیے تیار بھی کیا جارہا ہوں یا نہیں۔ اس حالت میں آپ کو جان مار کر کوشش کرنی ہے۔ اپنی پوری قوت صرف کرنی ہے کہ عام لوگو کے اندر زیادہ سے زیادہ اسلامی ذہن پیدا کیا جائے۔ جب تک آپ یہ کام نہیں کریں گے اس وقت تک یہاں اسلامی نظام قائم نہیں ہوسکتا۔

اگر جمہوریت کو چلنے نہ دیا جائے!

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں جمہوریت کو کبھی چلنے نہیں دیا گیا ہے اور جمہوری طریقے سے جب کبھی انتخابات ہوتے ہیں وہ انتہائی بے ایمانی اور تشدد سے اور انتہائی بددیانتی کے ذریعے سے ہوتے ہیں۔ ان انتخابات کے ذریعے سے اگر آپ سو فیصدی بھی ووٹ حاصل کریں تو صندوقچے سے سو فیصدی ووٹ آپ کے خلاف برآمد ہوں گے۔ ہمیں اس صورت کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

ایسے حالات کا مقابلہ کرنے کی کوشش

اس کے لیے پوری جدوجہد کرنی ہوگی کہ جن لوگوں کے ہاتھوں سے یہ کام لیا جارہا ہے ان کے ذہن کو تبدیل کیا جائے۔ ہمیں یہ کوشش کرنی ہے کہ انتخابات کے مراکز پر اگر کچھ لوگ بے ایمانیاں کرنا چاہیں بھی تو نہ کرسکیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے جب یہ خیالات ملک کے اندر پوری طرح سے مضبوطی سے جم جاتے ہیں اور قوم کے اندر پورا ارادہ پیدا ہوجاتا ہے تو پھر کوئی طاقت انقلاب آنے سے نہیں روک سکتی۔ یہ ہر راستے سے آتا ہے۔ ایسے راستے سے آتا ہے کہ جس کے بند کرنے کا خیال کوئی سوچ تک نہیں سکتا۔ آپ اس بات کی فکر نہ کریں کہ انقلاب کس راستے سے آئے گا۔ آپ صرف کام کریں اور یہ کام آپ اس وقت تک انجام نہیں دے سکتے جب تک آپ اپنے اخلاق، اپنے کردار، اپنی سیرت کو درست نہ کریں۔

[اقتباسات ماخوذ از تقریر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ بہ موقع اجتماع سالانہ ۳۱ مارچ ۱۹۷۴ء]

آپ کا اپنا معیار درست ہونا چاہیے!

یہ کام آپ صرف اسی صورت میں انجام دے سکتے ہیں جبکہ آپ کے اپنے اخلاق اس سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں جو اس نظام کا تقاضا ہے۔ جب آپ اسلام کی طرف دعوت دینے کے لیے اٹھیں گے تو لوگ یہ دیکھیں گے کہ ہمیں یہ دعوت دینے والے خود کیسے ہیں۔ اگر آپ کے اخلاق اور سیرت و کردار میں کوئی خرابی ہوئی یا آپ کے اندر ایسے لوگ پائے گئے جو مناصب کے خواہش منداوران کے لیے حریص ہوں یا آپ کے اندر ایسے لوگ موجود ہوئے جو کسی اصول کی بھی خلاف ورزی کرنے والے ہوں تو اس صورت میں آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے، اس لیے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ اسلامی انقلاب کے لیے جدوجہد کرنے کے مخصوص تقاضے ہیں۔ اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد کرتے وقت آپ کو جن چیزوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھنی ہوگی وہ یہ ہیں کہ آپ کے اخلاق نہایت بلند ہوں۔ آپ کی زندگی پوری طرح اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو۔ آپ کے اندر نظم جماعت کی کامل اطاعت پائی جاتی ہو۔ آپ جماعت کے دستور کی پوری طرح پابندی کرنے والے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ آپ عوام الناس کے اندر پھیل کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے ہر لحظہ کوشاں ہوں اور چاہے یہ کام آپ کو پچاس سال بھی کرنا پڑے لیکن آپ لگن کے ساتھ اسے کرتے چلے جانے کا مصمم ارادہ رکھتے ہوں تو انشاء اللہ کوئی طاقت اس ملک کو اسلامی ملک بننے سے نہیں روک سکے گی۔

ارکان کی تین ذمے داریاں

جماعتِ اسلامی کے رکن کی تین ذمے داریاں ہیں:

ایک یہ کہ وہ دعوتِ حق کو سمجھے، اسے صدقِ دل سے قبول کرے، اس کے تقاضے قرآن و حدیث سے معلوم کرے اور اس علمی مہم میں علما سے اور جماعتی لٹریچر کے علاوہ قرآن وحدیث کے سرچشمہ ہائے علوم تک پہنچانے والے صحت مند لٹریچر کو پڑھے، پھر دین کا شعور حاصل کر کے اس پر عمل کرے۔

دوسری ذمے داری یہ کہ دعوتِ حق یا دین کے پیغام کو آگے دوسروں تک پہنچائے، یعنی اہل خانہ تک، دوستوں اور رشتہ داروں تک، پڑوسیوں اور کام کے ساتھیوں تک یا اور جہاں جہاں اس کی رسائی ہوتی ہو یا اسے موقع مل سکتا ہو۔ دعوت ہی نہیں، تدریجاً وہ علم دین کو بھی پھیلانے اور احکام و حدودِ دین کے مطابق عمل کرنے کی تعلیم بھی دے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی کرے، مزید برآں خدا کے دین کو کسی طاغوتی نظام کی زنجیروں میں جکڑا نہ رہنے دے بلکہ اسے ارباب اقتدار و استکبار کے ہر بندھن سے نجات دلا کر اس قابل بنائے کہ وہ دین خود نظامِ زندگی بن کر غالب ہو اور اس کی پابندی میں سوچنے اور کام کرنے والے خدا پرست اسی نظام کو عملاً چلانے کے قابل ہو جائیں۔ اس جز کے عمل میں آنے کا کوئی امکان متفرق انفرادی سوچوں اور کوششوں سے نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی تحریک کی ضرورت ہے جس میں اقامتِ دین کے کلمۂ سواء کے تحت تمام افراد اور مذہبی گروہ اور کلامی یا فقہی فرقے مل کر جدوجہد کریں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو کہ وہ ایک نظم میں جمع ہو سکیں تو باہم ایک وفاق بنا کر اور معاہدہ کر کے مرکزی مقصد کے لیے بلا اختلاف اپنے اپنے طرز پر کام کریں۔

اس آخری جز کے لیے اقامتِ دین کے داعی اور سپاہی کا کسی صحیح نظم کو تلاش کرنا یا اہل صلاحیت کے ہاتھوں اُسے قائم کرانا یا موجود گروہوں میں سے کسی نہ کسی کو خاص اس کام کے لیے تیار کرنا، ورنہ الگ الگ تمام مذہبی حلقوں تک یہ بات بار بار پہنچانا کہ الحاد اور مادّیت اور نفس پرستی کے اس طوفانی دور میں اقامتِ دین کے لیے کام کرنا نہایت ضروری ہے۔

اوپر کی دونوں ذمے داریوں کے متعلق تربیت گاہوں میں، تقریروں میں کام ہوتا رہا ہے مگر ایک تیسری ذمے داری جو بہت ہی بھاری ہے اس پر شاید اس لیے پوری طرح توجہ نہیں دی جاتی کہ بظاہر اس کا امکان محسوس نہیں ہوتا۔

تعلیماتِ دین اور تلقیناتِ جماعت کے رُو سے وہ بڑی ذمے داری یہ ہے کہ آپ جہاں کہیں کوئی خرابی دیکھیں اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اس کوشش کا کم سے کم درجہ تنقید و احتساب ہے۔ اصل میں یہ جماعتی نظم کے کیمپ کی پہرہ داری اور نگرانی کا کام ہے کہ کہیں کوئی غلط قوت اندر نہ داخل ہو جائے اور کہیں کوئی خرابی بپا نہ ہو جائے۔ گویا ہم سب جماعت کے قلعہ یا کیمپ کے سنتری ہیں۔ امیر اور دوسرے عہدیدار اپنی جگہ اور ہر رکن اپنی جگہ۔ یہی وہ تیسری بھاری ذمے داری ہے جس پر کبھی توجہ نہیں دی جاتی۔

آیئے، ذرا سرسری نظر میں دیکھیں کہ آپ کی تیسری ذمے داری کیا تقاضا کرتی ہے کہ آپ کن کن چیزوں پر نگاہ رکھیں۔

۱- ایک تو وہ نظریہ، عقیدہ اور نصب العین ہے جو دستور میں لکھا ہے اور ان چیزوں کی توضیحات اس وقت کے لٹریچر میں موجود ہیں۔

۲- ایک چیز وہ تصوّرِ دین اور اس کا سیاسی ڈھانچہ اور دعوتِ اسلامی کا طریق کار ہے جو دستور میں اشارات کی صورت میں، مگر متعلقہ لٹریچر، رسائل و مسائل اور رپورٹوں میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

۳- دعوت کو پھیلا کر ایک ایک آدمی تک پہنچانے اور اس پر مسلسل کام کر کے اسے متاثر کرنے کا طریق کار ہے۔ اس طریق کار میں جو طوالت اور جو احتیاط پائی جاتی ہے وہ گویا کچے آدمیوں کو لینے سے بچنے کی کوشش اور پختہ افراد کو ارکان بنانا یا رکن بنانے کے لیے کسی بھی زیر دعوت دوست کو پختہ بنانا ہے۔ نسلی مسلمانوں کے بگڑے ہوئے

معاشرے میں اصلاح یافتہ افراد پیدا کر کے ان کو دین کے لیے منظم کرنے کی یہ واحد راہ ہے۔ اس کے متعلق لٹریچر میں تفصیلات و توضیحات ہیں اور ہم سب ان کے قائل ہو چکے تھے، یہاں تک کہ موسسِ اعلیٰ کے ساتھ جو دوسرے موسسین شامل تھے انھوں نے مقدار و معیار کے معاملے میں واضح دستوری فیصلہ دیا اور وہ دستور اپنے پیچھے والوں کے لیے چھوڑا کہ اس کے مطابق معیار کو قائم رکھا جائے۔ اب اگر مقدار کو اولیت دے کر معیار کو ثانویت دے دی جائے یا بھرتی کے خاص طریقے اور ضروری احتیاطوں کو یا اخراج کی کارروائیوں کو چھوڑ دیا جائے تو گویا ۱۹۴۱ء میں قائم ہونے والی جماعتِ اسلامی اپنے موسسین کی قائم کردہ بنیادوں سے ہٹ گئی۔

یہ ایک مثال ہے، تبدیلی کی۔ معیار والے فارمولے میں تو فرد فرد کو شعوری اور اخلاقی طور پر کچھ مدت میں تیار کرنے کا کام تھا، لیکن اگر ہم مقدار (تعداد) والا فارمولا اختیار کر لیں تو ہم ایک جذباتی فضا بنا کر یا ایک جذباتی ریلا اٹھا کر بیک وقت سیکڑوں آدمیوں کو ساتھ بہا لے جا سکتے ہیں۔ کسے معلوم ان میں سے کتنے ڈوبتے ہیں، کتنے الگ ہوتے ہیں اور کتنے ساحل پر پہنچتے ہیں اور کتنے جماعت میں رہ کر خرابیاں پیدا کرتے ہیں۔

جماعت میں اقتدار یا اتھارٹی مقررہ حدود میں رہتی ہے یا نہیں؟ مشاورت کا نظام کسی بالائی اثر کے بغیر چلتا ہے، طے شدہ ''لائحۂ عمل'' (قرارداد ماچھی گوٹھ) کے مقابلے میں دینی سرگرمیوں کا تناسب کم اور انتخابی سیاست کا تناسب غالب تو نہیں ہو جاتا؟ انتخابی سیاست میں اخلاقی حدود کی پاسداری کس حد تک ہے؟ بیت المال کا روپیہ کس طرح خرچ ہو رہا ہے؟ جماعت میں دینی شخصیتوں، مفکروں اور دانشوروں کا اثر و نفوذ کہاں تک ہے اور ان کے مقابلے میں عوام نوجوانوں اور پارلیمانیوں کا کتنا؟

ایسے ہی کئی سوالات جن کو پیشِ نظر رکھ کر جماعت کے ہر سنتری اور گارڈ کو (چاہے وہ امیر و قیم ہو یا عام رکن) حالات پر کڑی نگاہ رکھنی چاہیے اور ہر غلط اقدام یا موڑ کا نوٹس لینا چاہیے، تنقید و احتساب کا فرض بھی ادا کرنا چاہیے، خط بھی لکھنے چاہییں۔ بہر حال ہر خدا پرست اور محبِّ رسولؐ ساتھی کو کسی بھی ایسی حالت پر اضطراب اور ملال محسوس کرنا چاہیے جو دستوری اسکیم، جماعت کی محکم روایات، لٹریچر، خصوصاً روئیدادوں میں واضح شدہ امور میں بیک دم یا تدریجاً کوئی

نا مطلوب ردِّعمل ہوتا دیکھیں۔

یاد رکھیے کہ جماعتوں اور تحریکوں کو جتنے خطرات باہر کے مخالفین سے ہوتے ہیں، ان سے زیادہ خطرات اندر کی قوتوں سے ہوتے ہیں، خواہ وہ کار پرداز قوتیں ہوں یا کارکن۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کارکن کسی خفیف سے موڑ کی جرأت بھی بہت کم کرسکتا ہے اور اس کی نگرانی کرنے والے بے شمار ساتھی بھی موجود ہوتے ہیں اور اوپر تلے کئی امیر و قیم ہیں۔ لیکن اہلِ قوت و اختیار کی طرف سے دھیمی دھیمی خلل اندازی ہوتی رہے تو عام رکن مشکل ہی سے خرابی کو سمجھ سکتا ہے جبکہ اسے بطور خوبی پیش کرنے کے لے زوردار لوگ موجود ہوں۔

خلاصۂ گزارش یہ ہے کہ اس تاریخ میں یہ ہو چکا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے رہنما اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے کارکنوں کی بہترین قوت کے ذریعے بھی اسلامی تحریک و جماعت اور اسلامی حکومت کی اٹھارٹی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ تک ہی ابتدائی بنیادوں پر قائم رکھا جاسکا، تو آج ہمیں اپنے آپ سے بہت زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ ہماری سپردگی میں جماعتِ اسلامی کے مفکرِ اول اور اس جماعت کے ابتدائی موسسین نے ایک بھاری امانت چھوڑی ہے۔ ہم اس میں اُس سے زیادہ ردّ و بدل نہیں کرسکتے جس کے لیے خود اس میں اوّل روز سے گنجائش ہے۔ اگر ہم زیادہ تحریف کریں اور اس کے خد و خال تبدیل کر دیں تو جو کچھ بطورِ امانت ہمارے پاس تھا، درحقیقت اسے ضائع کر کے گویا کوئی اور چیز ہم نے بنالی۔

ظاہر ہے کہ اس امانت کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہ خدا اور رسولؐ کی طرف سے بھی امانت ہے (جبکہ اس کی اصل احیائے دین اور اقامتِ دین ہے) یہ پوری امّت کی طرف سے بھی امانت ہے جس کے صدیوں کے دبے کچلے ہوئے تقاضوں کو جامۂ عمل پہنایا گیا ہے اور اصلاح و تعمیر کی واحد راہ نکالی گئی ہے۔ اور مفکرِ اوّل کی طرف سے بھی امانت ہے جس نے ساری عمر کے مطالعہ و تفکر کے مسالے سے اُسے تعمیر کیا۔ پھر یہ ان تمام لوگوں کی طرف سے امانت ہے جنھوں نے اس کے لیے قربانیاں دیں، نوکریاں چھوڑیں، قیدیں کاٹیں، جانیں دیں، خانہ تلاشیوں کا نشانہ بنے، تھانوں میں پکڑ پکڑ کر بٹھائے گئے، مقدمے بھگتتے رہے، گالیاں کھاتے رہے، بُرے الفاظ سے مخاطب کیے گئے، جو لمبے لمبے سفر کرتے رہے جنھوں نے دعوتِ حق کے لیے دیہات کی گلیاں اور شہروں کے محلے چھان مارے، ہاتھوں سے پوسٹر لگاتے رہے، رشتے داروں

سے کٹ گئے، اونچے اسٹیٹس سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے، کیا آج ہم یہ جرأت کر سکتے ہیں کہ ان کی خدمات اور قربانیوں کو مذاق سمجھیں اور ان کا مذاق اڑائیں؟ کیا ہم ان کے کام کو پاؤں تلے روند کر کوئی الٹا رُخ اختیار کر سکتے ہیں؟ میرا خیال یہ ہے کہ اس طرح کی جرأت کرنے پر اگر فوری ردعمل نہ بھی ہو تو آہستہ آہستہ تاریخ کی گھڑی کے ڈائیل پر نتیجہ نکل آتا ہے۔

کسی شخص یا گروپ کو عہدہ واثر یا اکثریتی حمایت کے بل پر نئے نئے گھروندے بنانے کا موقع مل بھی جائے تو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ اس کی قائم کردہ مثال سے رہنمائی لینے والے بعد کے لوگ اس کے گھروندوں کو توڑ کر اپنی مرضی کے نئے سے نئے گھروندے تیار کر لیں گے۔ اس طرح ایک متعین ماحول و مقصد اور ایک واضح، منہج اور طریقِ کار رکھنے والی جماعت کا سارا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا۔

تو میرے رفیقو، دوستو اور بھائیو! اپنی تیسری ذمے داری کے بارے میں معاملے کی نزاکت کو خوب سمجھنے کی کوشش کرو۔ ورنہ آج اگر اچھے لوگوں کی اچھائی کی وجہ سے تحریک کے خزائن لٹنے سے بچ بھی گئے تو تمھاری غفلت یہ رنگ ایک نہ ایک دن ضرور لائے گی کہ جب کوئی غلط الفکر قوت ابھر آئی تو وہ کشتی کا رُخ جدھر چاہے گی موڑ لے جائے گی اور تمھیں پتہ بھی نہ چلے گا! یہاں تک کہ وہ ہلاکت کی کسی چٹان تک سے جا ٹکرائے۔

لہٰذا تحفظ کی راہ یہی ہے کہ تم تحریک کے گارڈ اور جماعت کے سنتری بنو اور اپنے اوپر خوابِ غفلت طاری نہ ہونے دو۔ نہ معلوم کب کوئی بلا کہاں سے نمودار ہو جائے۔ جماعت کے بنیادی لٹریچر سے لے کر اس کی پچھلی کارروائیوں اور ان کی روئیدادوں اور تاریخِ ارتقاء پر نظر رکھو، نیز اس وقت جو بھی اقدام کیا جائے اسے اصول و مقاصد اور روایات و اقدار کی کسوٹیوں پر پرکھتے رہو۔

اللہ تعالیٰ ہمارے تمام اکبر و امراء پر بھی رحم و کرم فرمائے اور ہم ادنیٰ درجے کے شرکائے کار کو بھی انوارِ رحمت سے نوازے، اور جو خدشے سامنے آتے ہیں، تحریک کو اور ہمیں ان سے تحفظ دلانے کا سامان وہ خود اپنے تصرف میں کرے!

''شہادت'' کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ شاہد بننے والا خوب غور سے دیکھتا رہے کہ اس کے سامنے کیا ہو رہا ہے اور کس طرح ہو رہا ہے!

آیئے! ہم اپنے اقرار کو تازہ کریں کہ ہم دین کے مجاہد بھی ہیں اور شاہد بھی!

لیکن یہ معاملہ کسی سیاسی اپوزیشن کی طرح کا معاملہ نہیں؟ یہ کوئی رسہ کشی اور کھینچا تانی کا قضیہ نہیں۔ ہمارے ہاں اختلاف، تنقید اور احتساب سب کی مرکزی روح خیر خواہی اور جذبۂ تعاون ہے۔ پس ان چیزوں کو اپنے سے چھوٹے یا برابر کے لوگوں کی طرف سے ہر ایک کو بہ خندہ پیشانی سننا چاہیے، بلکہ لوگوں کو اس پر اکسانا چاہیے کہ وہ اپنے دل کے اندر جو بھی اختلافی بات یا وجہ بے اطمینانی رکھتے ہوں اسے کھل کر سامنے لائیں ان کی بات سنے جائے گی۔ یقین دلایا جائے کہ انھیں غصہ وانتقام کا ہدف نہیں بنایا جائے گا۔ ان کی بات کاٹ کر یا مسل کر کارروائی آگے نہ چلائی جائے گی، ان کے کلام کے ہر جزوِ حق کو قبول کیا جائے گا، کسی غلطی کی نشان دہی پر غلطی دور کر دی جائے گی، خود ان کے خیالات میں کوئی غلط فہمی شامل پائی گئی تو اس کا ازالہ کر دیا جائے گا اور اس قسم کی خیر خواہی کرنے والوں کو جماعت اور تحریک کا بہترین خادم سمجھا جائے گا۔ انھیں آگے سے کسی مناظرانہ بوچھاڑ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے گی کہ وہ اپنی پوری بات تسلی سے بیان کریں۔

انھی چیزوں کے شامل ہونے سے مشاورت صحیح مشاورت بنتی ہے اور ایسی مشاورت کی روح محبت ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں جو امور طے ہوتے ہیں ان کی پابندی ہر شخص اس جذبے سے کرتا ہے کہ یہ میرا ہی طے کردہ فیصلہ ہے (نہ کہ کسی کی طرف سے ٹھونسا ہوا) نیز ایسی مشاورت غیبت و نجویٰ کا راستہ بند کر دیتی ہے۔

پس ان اجتماعی ضروریات و وظائف کا اہتمام اور ان کی اوپر سے حوصلہ افزائی جماعت کی صحت و قوت اور اتحاد و اتفاق کا ذریعہ ہے۔

مولانا مودودیؒ کا ابتدائی دورِ تحریک

کتاب کے آغاز میں میں آپ کے سامنے اپنے ابتدائی زمانے کی بات پیش کرنا چاہتا ہوں کہ مولاناؒ کی پکار پر جب جماعت کے ساتھ ہم منسلک ہوئے تو کیا پایا۔ مولاناؒ تحریک کے لیے کس قسم کے کارکن تیار کرنا چاہتے تھے۔ جو لوگ تحریک کے دورِ اوّل سے وابستہ ہوئے تھے وہ گزر گئے، اب نئی پود کا زمانہ ہے۔ ضرورت ہے کہ ان دونوں کے درمیان ربط رہے، خلا نہ پیدا ہو۔ عمارت بلند ہو رہی ہے تو اوپر لگنے والی اینٹیں پہلی اینٹوں کے مطابق رہیں۔ وہ جو کہا گیا ہے

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

میں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں کہ معمار نے اگر پہلی اینٹ صحیح رکھی ہو، لیکن دوسری اینٹ صحیح نہ ہو تو بھی دیوار کج ہو جاتی ہے۔ دیوار تب سیدھی ہوتی ہے جب دوسرے ردّے کے مطابق رہیں ورنہ ساری عمارت کج ہو جائے گی۔ اب میں پہلی اینٹ اور پہلے ردّے کی داستان سنانا چاہتا ہوں۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا دورِ اوّل کیسا تھا؟

رکنیت

سب سے پہلی چیز رکنیت تھی۔ یہ کسی شخص کا قدمِ اول ہے جماعت کے ساتھ وابستگی کا۔ اس زمانے میں جو بھی لوگ جماعت کے قریب آتے تھے وہ سب سے پہلے جماعت کی دعوت کو سمجھتے تھے، پھر ان کا ایمان ان کو جماعت میں شامل ہونے پر اُکساتا تو وہ رکنیت کی درخواست دیتے تھے۔ جماعت کا طریقہ یہ تھا کہ جو آدمی رکنیت کا امیدوار ہوتا، اس کو انتظار کرنے

کے لیے کہا جاتا۔ یہ انتظار ٹالنے کے لیے نہیں، بلکہ جائزہ لینے کے لیے ہوتا تھا کہ وہ صاحب شدّتِ جذبات سے مغلوب ہوکر تو نہیں آگئے، یا انھوں نے پورے ہوش وشعور کے ساتھ ٹھنڈے دل سے شرکتِ جماعت کے تقاضوں کو سمجھ لیا ہے؟ ان کے کردار کو دیکھا جاتا، ان کے مزاج کو جانچا جاتا اور جائزہ مہینوں جاری رہتا۔[۱] بعض اچھے اچھے لوگوں کو اس معاملے میں بڑے مغالطے ہوئے اور ہمارے تیز چنگل مخالفین نے تو جان بوجھ کر اس طریق رکنیت سازی کے بل پر جماعت کو ایک سازشی خونخوار تحریک ثابت کرنے کے لیے بڑی پرُزور منطق وضع کرلی اور خوب پروپیگنڈا کیا۔

حالانکہ ہمارے ابتدائی لٹریچر میں واضح کردیا گیا تھا کہ موجودہ معاشرے میں جہاں نہ صرف بھانت بھانت کا مسلمان پایا جاتا ہے، بلکہ ذرا کسی اسلامی مقصد کے لیے پرجوش لَے میں پکاریے تو ہر طرح کے لوگ نام لکھوانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ بعد میں متضاد مزاج و کردار کے ان مسلمانوں میں سے ہر ایک مقصد کے لیے رکاوٹ بن جائے گا، لٰہذا مؤسس تحریک اور اس کے ساتھیوں نے سوچا کہ جوش انگیزی کے بجائے ہوش آموزی کا طریقہ اختیار کیا جائے اور استعجال کے بجائے سہج سلیقے سے کام کیا جائے۔ اس دوران میں محبانِ جماعت سے جماعت کے ساتھ کام کرنے کے لیے کہا جاتا اور اس سے اندازہ کیا جاتا کہ جماعت کے نصب العین کے ساتھ ان کی شیفتگی کتنی ہے۔

حلفِ رکنیت

اس کے بعد حلف لینے کا وقت آتا۔ میں موجودہ دور کی کیفیت کو زیادہ نہیں جانتا۔ لیکن ہمارے وقت میں حلفِ رکنیت ایک امیدوارِ رکنیت کے لیے گویا محشر کا وقت ہوتا تھا، وہ دیدہ دانستہ

---

[۱] مراد یہ کہ ہمارا مقصودِ اوّل عددیت بڑھانا نہ تھا۔ بلکہ بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح اور تعمیرنو کے لیے ایسے پختہ کردار افراد مطلوب تھے جو عقیدے اور نصب العین کو سمجھ کر، ان کے اخلاقی تقاضوں کو سینوں میں جذب کرکے آئیں اور دل لگا کر بغیر کسی اجرت کے محض رضائے الٰہی کے لیے ساری عمر طے شدہ اصولوں پر کام کرتے ہوئے گزار دیں اور وقت کے ریلوں کے دھکے کھا کر اپنے موقف سے اِدھر اُدھر نہ ہوں۔ نعرے اور شور شرابے اور مظاہرے اس کام کے لیے مفید نہ تھے۔ یہ تدبیریں وقتی طور پر ووٹر اکٹھے کرنے کی ہوتی ہیں اہلِ دعوت اور علم بردارانِ تحریک ان طریقوں سے پیدا نہیں ہوتے، بلکہ اُلٹا برسوں میں بنے ہوئے ٹھوس سنجیدہ کرداروں میں بھی شکست وریخت واقع ہوجاتی ہے۔

دین کی ذمے داریوں کو اٹھانے اور نبھانے کا عہد کرتا۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس شخص نے ان ذمے داریوں کی گرانی اور نزاکت کو سمجھ لیا ہو، حلف لیتے وقت اس کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔ ذمے داری کے احساس سے اس پر پہلا اثر یہ ہوتا تھا کہ حلف لیتے ہوئے وہ کانپتا اور لرزتا تھا۔ بعض اوقات ہم نے دیکھا کہ ایک شخص کی آواز منہ سے نہیں نکل رہی۔ وہ چند الفاظ بولتا تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ اس کو یوں محسوس ہوتا گویا وہ اجتماع ارکان میں نہیں بلکہ عدالت میں کھڑا ہے اور اپنی کارکردگی کی جواب دہی کر رہا ہے۔ یہ ایک خاص کیفیت ایک مدت تک جماعت میں رہی اور جماعت کی پہلی صف انھی لوگوں سے بنی۔

احتساب

تیسرا مرحلہ احتساب کا ہوتا تھا۔ یہ دیکھا جاتا تھا کہ جو صاحب جماعت میں آئے ہیں وہ معیارِ مقرر پر قائم ہیں یا نہیں۔ اگر وہ ذرا بھی نیچے گرتے تو سب کی نگاہیں ان کی جانب اُٹھ جاتیں اور ان کو سنبھالا دینے کے لیے ہاتھ بڑھ جاتے۔ ان کی اصلاح کے لیے سب فکر مند ہو جاتے۔ لیکن اگر وہ تمام سہاروں اور سارے تعاون کے باوجود سنبھل نہ پاتے تو پھر اس کی پروا نہ کی جاتی کہ ہماری تعداد کم ہو جائے گی بلکہ صرف اصول پر نگاہ رہتی۔ ان سے درخواست کی جاتی کہ فی الحال آپ رکنیت سے آزاد رہ کر کام کریں۔

اب اگر بگاڑ جاری رہے اور کوئی پرسش نہ ہو تو یہ نظمِ جماعت کی بدخواہی ہے۔ نظم ایسی مداہنت سے تباہ ہوتا ہے، اس لیے ہمارے وقت میں جس کسی نے بھی نظم اور اصول کو توڑا اس کا محاسبہ ہوا۔ ہماری اصل فکر جماعت اور تحریک کو بچانے کی ہوتی تھی، نہ کہ اس کے افراد کی عددیت کو ''معیاریت اور عددیت'' میں تناقض ہے۔ تعداد اور استعداد دو مختلف چیزیں ہیں۔

علم کی پیاس

چوتھی چیز عہد اوّل میں یہ تھی کہ جو کوئی جماعت میں داخل ہوتا تھا، اس کو سب سے پہلے علم دین اور فہم احوال کی فکر ہوتی تھی۔ ایک جذبہ اُبھرتا تھا کہ دین کا صحیح علم حاصل کیا جائے کیونکہ دین کے صحیح علم کے بغیر صحیح عمل ممکن نہیں۔ ہم لٹریچر کا خود بھی ذوق وشوق سے مطالعہ کرتے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیتے۔ کسی مجلس میں بیٹھتے تو ہماری خواہش ہوتی کہ دوسری باتوں کے علاوہ

دین کی بھی باتیں ہوں۔ ہمیں اہلِ علم کی صحبت کا شوق ہوگیا تا کہ دعوتِ دین ہمارے دل ودماغ میں راسخ ہو۔ فہم اور تفقّہ میں اضافہ ہو اور یہ معلوم ہو کہ دعوت دین کے کیا تقاضے ہیں۔ خاص طور سے مطالعۂ قرآن وحدیث کے ذریعہ ہم یہ جاننے کی دھن رکھتے تھے، وہ کون سی چیزیں ہیں جو ہماری زندگی کو اسلامی بناتی ہیں اور کن چیزوں سے ہمیں اجتناب کرنا چاہیے اور کن سے زندگی جاہلی زندگی بنتی ہے اور ساتھ ہی تحریکی مسائل، عالمی احوال، معروف دنیوی علوم اور مخالفانہ دلائل و مباحث کو بھی ہم جاننے کی کوشش کرتے۔

مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں ہم لٹریچر کا اس شغف وانہماک سے مطالعہ کرتے اور دوسروں کو سناتے تھے کہ اس کے بعض حصے ازبر ہوگئے۔ لٹریچر ہماری تحریک کی روح ہے، اس کا دامن اگر چھوڑ دیا گیا تو ہم اپنی روح سے کٹ کر رہ جائیں گے، پھر ماضی اور حال میں کوئی ربط باقی نہ رہے گا۔ آج بھی مجھے ڈر ہے کہ اگر ہم نے قرآن وسنت کی روشنی میں لٹریچر کے مطالعہ میں کوتاہی برتی تو وہ وقت آجائے گا کہ ہمارے ذمہ دارانہ مناصب پر ایسے لوگ آجائیں جو ہماری دعوت اور لٹریچر سے بے بہرہ ہوں اور ان کے فیصلے اور اقدامات کی نیرنگیاں دیکھ کر سر چکرا جائیں لیکن حالات کی رو غلط سمت میں چل پڑے تو پھر اس کا رُخ بدلنا سخت کٹھن ہوتا ہے۔

اپنا جائزہ

پانچویں چیز میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے زمانے میں اپنی زندگی کا بار بار جائزہ لیا جاتا تھا۔ اس کی فکرمندی ہوتی تھی کہ ہماری زندگی میں کوئی غلط اور ناجائز چیز تو داخل نہیں ہوگئی۔ اگر معلوم ہوتا کہ فلاں چیز ہماری زندگی میں غلط ہے تو اس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے جب تک اس کو اپنے اندر سے نکال نہ پھینکتے۔ میاں صاحب (میاں طفیل محمد) نے وکالت ترک کی، چودھری علی احمد خاں مرحوم نے پولیس کی ملازمت چھوڑی، غرض جو بھی جماعت کے قریب آتا یا اس کی رکنیت اختیار کرتا وہ سب سے پہلے اپنی زندگی کا جائزہ لے کر غلط یا ناجائز اور اللہ کی ناپسندیدہ چیزوں کو اپنی زندگی سے خارج کرتا۔ میں نے خود اپنی زندگی کا جائزہ لیا اور اپنی ان چیزوں سے چھٹکارا حاصل کیا جو مجھے بے حد پسند، لیکن دین میں ناپسندیدہ تھیں، ہم نے فقہی گنجائشوں کو کبھی نہیں ڈھونڈا تھا، جو چیز قرآن وسنت سے ثابت ہوگئی پھر اس کو قبول نہ کرنا ہمارے لیے مشکل ہوجاتا تھا۔

یہ سلف کا جذبہ تھا جو اخلاف میں منتقل ہونا چاہیے۔ تحریک کا تسلسل اسی سے قائم رہے گا۔

اخوّتِ رفقاء

چھٹی چیز رفقاء کے لیے گہری محبت اور خیر خواہی کا جذبہ تھا۔ دارالاسلام میں چند رفقاء ہوتے تھے، لیکن ان کی حالت ایک دردمند گروہ کی سی تھی جو اپنے سے زیادہ دوسروں کے لیے سوچتے تھے۔ ہم اللہ کے لیے ملتے اور اللہ کے لیے بیٹھتے اور کوئی غرض سوائے دین کے ہمارے درمیان نہ تھی۔ یہی چیز جماعتی استحکام کا باعث بنی۔ باہمی محبت کے اس جذبے نے جماعتِ اسلامی کو سیسہ پلائی دیوار بنادیا۔ کسی کو تکلیف ہوتی تو سب تڑپ اُٹھتے، جماعت اسی جذبے سے پروان چڑھی۔

بزرگوں کا احترام

ساتویں چیز میں آپ کے سامنے یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ ہم میں بزرگوں کا احترام پیدا کیا گیا۔ آج نوجوان قیادت کے نعرے کہیں کہیں سے سنے جاتے ہیں، لیکن جماعت میں جب ہم شامل ہوئے تھے تو ہمارا ابھی عہد شباب تھا، لیکن ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ بزرگوں کے سامنے آواز کو بلند کیا جائے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہمیں جو کچھ ملے گا بزرگوں کے ادب اور ان کے احترام سے ملے گا، چنانچہ ہم نے اس سے فیض پایا۔ بڑوں کے لیے احترم کا جذبہ جماعت کو استحکام دیتا ہے، جن لوگوں نے جماعت کے لیے قربانیاں دی تھیں۔ ان کے سامنے ہمارے سر ہی نہیں ہمارے دل بھی جھکتے تھے۔ اگر اگلوں نے پچھلوں کی قدر نہ کی تو زنجیر ٹوٹ جائے گی۔[۱]

توسیعِ دعوت

آٹھویں چیز یہ ہے کہ ہمارے اندر توسیعِ دعوت کا ولولہ ہوتا تھا۔ یہ جذبہ تھا کہ جو حق ہمیں ملا ہے وہ دوسروں تک بھی پہنچ جائے۔ چلتے پھرتے، دفتر، دکان ہر جگہ ہم کو دعوت پھیلانے

---

[۱] دورِ اوّل میں مولانا مودودیؒ کے علاوہ اصلاحی صاحب تھے، مولانا مسعود عالم ندوی تھے۔ ان سب کے سامنے مجال دم زدن نہ تھی۔ یہاں تک کہ جناب صدرالدین اصلاحی، مولانا صبغۃ اللہ بختیاری، سید عبدالعزیز شرقی اور عبدالجبار غازی صاحب تک سے بڑے ادب کا معاملہ تھا۔ یہ تو کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ نوجوان قیادت کا غیر اسلامی آوازہ بلند کر کے ہم اپنے آپ کو مریضانہ شوق میں مبتلا کریں۔

کی لگن رہتی تھی، گھر میں بیٹھتے تو بچوں کو دین کی تعلیم دیتے۔ اس کی فکر کرتے کہ ہمارا کوئی فعل ایسا نہ ہو جس سے بچوں کو غلط سبق ملے۔ بالکل آغاز میں ایک مرتبہ میری بیوی اور میں نے عہد کیا کہ ہم گھر میں کبھی جھوٹ نہیں بولیں گے اور وعدہ خلافی نہیں کریں گے، تاکہ بچوں کے دلوں پر نقش ہو جائے کہ زندگی صرف سچ بولنے کا نام ہے۔ یہ بھی ہم نے طے کیا کہ کسی جانور اور بے جان شے کو بھی گالی نہیں دیں گے ـــــ ہمارا معمول تھا کہ ہم اجتماع سے گھر آتے تو اجتماع کی روداد سب سے پہلے اپنے گھر میں بیان کرتے۔ اس طرح ہمارا گھریلو ماحول ہمارے لیے سدِّراہ بننے کی بجائے سازگار ہوتا چلا گیا۔ یہ سب کچھ تحریکی شعور ہم سے کرا رہا تھا۔

پھر گھر سے باہر نکلتے تو دعوت کی کوئی نہ کوئی چیز ہمارے پاس ضرور ہوتی۔ ہم لوگوں کے پاس چل کر جاتے اور یہ توقع نہ رکھتے کہ وہ ہمارے پاس آئیں گے۔ جماعت کا ہر کام خود کرتے، اس سے ہمارے تحریکی جذبے کو تقویت ملتی۔ ہاتھوں سے پوسٹر لگانے سے جو جذبہ اُبھرتا ہے وہ کرائے پر لگوانے سے نہیں اُبھرتا۔ دارالاسلام کے قریبی دیہات میں ہم دعوت لے کر گھومے پھرے۔ خود میاں صاحب (میاں طفیل محمد) گشت کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح پاکستان پہنچے تو اچھرہ کی ایک ایک گلی چھان ماری ـــــ ہم کو اس کی پروا نہ تھی کہ کوئی ہماری دعوت قبول کرے گا یا نہیں۔ ہمارے ذہن میں فقط ایک بات بیٹھی ہوئی تھی کہ ہمیں اپنی بات پہنچانی ہے۔

احترامِ نظم

نویں چیز یہ تھی کہ ہمارے دلوں میں نظم کا بے حد احترام تھا۔ اوپر سے کوئی ہدایت آتی تو اس کی بجا آوری کے لیے ہر ممکن سعی کرتے۔ سمع وطاعت کی روح کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے۔ اجتماعات میں لازماً شریک ہوتے۔ الاّ یہ کہ کوئی حقیقی اور واقعی عذر شرعی ہوتا۔ وقت مقررہ پر اجتماع گاہ میں پہنچتے۔ ہم نے عذر کبھی نہیں تراشا تھا۔ کوئی لیٹ ہو جاتا تو نہایت ندامت کے ساتھ وجہ بیان کرتا۔ اجتماع میں خاموشی اور احترام سے بیٹھتے ـــــ دراصل اجتماع کی کارروائی، سربراہوں کا اندازِ خلوص اپنے اندر خاص کشش رکھتا تھا۔

عہدے

دسویں چیز یہ ہے کہ اس زمانے میں عہدوں کی طلب کا کوئی تصوّر نہ تھا۔ کوئی

ذمے داری کسی پر ڈالی جاتی تو وہ اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا، ہزار معذرتیں کرتا، کیونکہ نگاہ ذمے داری پر ہوتی، جواب دہی پر ہوتی، منصب پر نہ ہوتی تھی، عہدوں کے معاملے میں بڑی احتیاط پائی جاتی تھی۔ عہدوں سے گریز کا رجحان تھا، ذمے داری کا نام لیا جاتا تو ہر فرد کے سامنے اپنی کوتاہیاں اور خامیاں صف در صف کھڑی ہو جاتیں۔

ہاں! اگر کسی شخص کو محسوس ہو جاتا تھا کہ جس کام کا تقاضا احباب مجھ سے کر رہے ہیں اس کے لیے کوئی دوسرا برابر کا آدمی بھی موجود نہیں تو پھر وہ سر جھکا دیتا تھا۔

بیت المال

گیارہویں یہ کہ بیت المال کے بارے میں بڑی احتیاط کی جاتی تھی۔ یہ احساس ہر وقت مسلط رہتا کہ بیت المال کی کوئی ایک پائی بھی ہمارے ہاتھوں ضائع نہ ہونے پائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول گویا مجسم ہو کر سامنے رہتا کہ بیت المال مالِ یتیم ہے۔ اعانتوں کی وصولی میں مستعدی سے کام لیتے۔ اعانت لینے کا مطلب صرف اعانت لینا نہیں ہوتا تھا، بلکہ اعانت دینے والے کو دعوتِ دین سے قریب تر کرنا ہوتا تھا۔ اعانت کی وصولی کو معمولی کام نہ سمجھا جائے، یہ افراد کو قریب لانے کا ذریعہ ہے، اس کے ساتھ دعوت پھیلتی ہے اور اس سے عدمِ توجہ گویا دعوت سے عدم توجہ ہے۔

بیت المال کے بارے میں یا اس کے تحت جو فنڈ جمع ہوتے ان کے بارے میں حساب رکھنے اور خرچ کرنے میں بڑی احتیاط کی جاتی۔ نہ جماعتی روپیہ کھلے دل سے اڑایا جاتا اور نہ جماعتی املاک یا وسائل سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا۔

غیبت و نجویٰ

بارہواں پہلو یہ ہے کہ اس زمانے میں غیبت و نجویٰ کی کوئی بات نہ ہوتی تھی۔[1] کسی کے بارے میں حتیٰ کہ مخالفین کے بارے میں بھی زبان سے کوئی ناشائستہ بات نہیں نکالی جاتی تھی۔ کنویسنگ سے یوں بچا جاتا تھا جیسے آگ سے بچا جاتا ہے۔ یہ یاد رکھیے کہ جس نظم میں کنویسنگ،

---

[1] غیبت سے جماعت کو بچانے کی شرط لازم یہ ہے کہ اس کے تمام افراد کو شکوک اور اعتراضات سامنے لانے کا موقع دیا جائے اور خوش دلی سے جواب دے کر انھیں مطمئن کیا جائے یا غلطی تسلیم کر کے اصلاح کی جائے۔

غیبت اور نجویٰ داخل ہو جائیں تو یہ اس کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔ یہ گھن کی طرح ہوتے ہیں کہ بظاہر لکڑی صحیح سالم معلوم ہوتی ہے، لیکن ایک دن اچانک دھڑام سے نیچے آرہتی ہے[۱]

رضا کار کارکن

تیرھویں چیز یہ ہے کہ وہ ''رضا کار کارکن'' کا دور تھا جو ہمہ وقتی کارکن کے مقابلے میں زیادہ مؤثر تھا۔ اب تو گویا تمام بار ہمہ وقتی کارکنوں پر ڈالنے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔

لیکن یہ رجحان کام کے جذبے اور لگن کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ تھوڑے سے ہمہ وقتی کارکنوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ مگر ایک تو عام کارکنوں میں یہ احساس رہنا چاہیے کہ اصل کام کرنے والی قوت رضا کار کارکنوں کی ہے۔ دوسرے یکجا کام کرنے والے ہمہ وقتی کارکنوں میں بیوروکریسی کا انداز پیدا نہ ہونے دینا چاہیے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ کبھی نہ کبھی وہ بھی عام کارکنوں کے ساتھ کام کریں، خواہ ہفتے میں ایک بار یا مہینے میں دو بار۔

مشورہ

چودھویں چیز اس زمانے کی یہ تھی کہ ہر اہم مسئلے میں مشورہ کیا جاتا تھا۔ مشورہ گویا نظم کے لیے بہ منزلہ روح رواں تھا۔ مشورہ طلب کیا جاتا تھا تو پورے اخلاص اور دیانت سے اپنی رائے دی جاتی تھی۔ اس میں مداہنت نہیں ہوتی تھی، لیکن شائستگی ضرور ہوتی تھی، پھر جب فیصلہ ہو جاتا تو وہ لوگ بھی اس کو بخوشی قبول کر لیتے جو بحث کے دوران اپنی رائے میں جوش کا اظہار کرتے تھے۔

مشورہ استدلال پر مبنی ہونا چاہیے، نہ کہ دھڑے بندیوں کے زور سے۔ پھر مشورہ یہ بھی نہیں کہ بعض صورتوں میں کئی کئی برس میں اور کئی کئی مجالس میں کسی شخص کی پیش کردہ ہر بات ہوا میں اڑ جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مقابلے میں کوئی گروہ بندی موجود ہے۔ یعنی محض بات کہہ دینے یا سن لینے کا نام مشورہ نہیں ہے۔

---

[۱] نجویٰ کا روگ اُس صورت میں تیزی سے پھیلتا اور لاعلاج ہوتا ہے جبکہ خود اربابِ نظم کا کوئی جتھا نجویٰ کر کے اپنی کسی اسکیم کو دوسروں پر ٹھونسنے کی راہیں نکالے، یا کسی فرد کو آگے لانے یا کسی کو پیچھے دھکیلنے کے لیے خفیہ منصوبے تیار کرے۔ ایسے اکابر کے ذریعہ جماعت اور افرادِ جماعت کی تربیت نہیں ہوسکتی۔

تنقید واحتساب

یہی صورت تنقید واحتساب کی تھی۔ یہ پندرھواں نکتہ ہے۔تنقید واحتساب میں کمی آجائے تو نظم اپنی خامیوں سے کبھی آگاہ ہی نہیں پاسکتا۔تنقید کرنے والے اخلاص سے تنقید کرتے تھے اور جن پر تنقید ہوتی وہ خندہ پیشانی سے سنتے تھے۔مولاناؒ نے اس سلسلے میں بہترین نمونہ پیش فرمایا تھا۔انھوں نے اپنے اوپر سخت سے سخت تنقید برداشت کی،لیکن کسی کو ٹوکا نہیں،لیکن یہ یاد رکھئے کہ تنقید اخلاص سے ہونی چاہیے۔اس میں نفسانیت کا کوئی عنصر شامل نہیں ہونا چاہیے۔اپنی حقیقی رائے کا صاف صاف اظہار اجتماع میں کیجیے،لیکن اُسے اِدھر اُدھر بیان نہ کیا جائے۔ پھر تنقید سننے والوں کو بھی وسیع الظرفی کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور تنقید کو وہ معنی نہیں پہنانے چاہئیں جو دوراز مطلب ہوں۔

ہم آہنگی

سولہویں چیز یہ ہے کہ ہماری رائے میں مکمل ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ ہمارے زمانے میں ذہن اس طرح ڈھل چکے تھے کہ خیبر سے کراچی تک ہر کارکن کی سوچ الفاظ سمیت ایک ہوتی تھی۔ جماعتوں کی ذہنی ہم آہنگی ان کے درخشاں مستقبل کی نشانی ہوتی ہے۔حکومت ہو تو کیبنٹ اور اگر سیاسی جماعت ہو تو اس کی مجلس عاملہ کی صفِ اول اگر تمام بحثا بحثیوں کے بعد کسی ایک فیصلے تک پہنچ جائے تو پھر اس کے دائرے سے باہر اختلافی رجحانات کو بکھیرتے پھرنے کے معنی یہ ہیں کہ جماعت کے نہ صرف عام رکن اور کارکن اور اس کے مصنف اور ایڈیٹر سب اختلافی بحثوں میں پڑ جائیں اور ایک ایک مسئلے پر دو دو یا تین تین جتھہ بندیاں پیدا ہو جائیں اور اپنوں، بے گانوں سب میں یہ چرچا ہو کہ انتشار پیدا ہو گیا ہے، ایسی فضا کا نتیجہ مزید انتشار ہے۔ یہ عام سیاسی پارٹیوں کے کھیل تماشے ہیں۔تحریکِ اسلامی اس کی متحمل نہیں۔اب تک کی تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے کثیر التعداد رفقاء کی طرف سے کبھی کوئی ہنگامۂ اختلاف وانتشار نہیں اُٹھا، بلکہ دو ایک بار جو بھی غبار اُٹھا وہ اوپر والوں کی طرف سے اُٹھا۔

ہاں!اگر اختلافی اور تنقیدی باتوں کو اصل عہدیداروں یا مجالس کی نگاہ میں وزن نہ ملے تو پھر یہ چیزیں ذہنوں میں تہ نشیں ہو کر کسی نہ کسی راستے سے ظاہر ہوتی ہیں۔ان کو غلط جگہوں پر

آنے سے روکنا ہو تو صحیح جگہوں پر اہمیت دیجیے۔

کوئی چھٹی نہ تھی

سترھویں چیز یہ ہے کہ ہمارے دور میں چھٹی کا کوئی تصور نہ تھا۔ ہم ہر وقت اور ہر لمحہ ڈیوٹی پر ہوتے تھے۔ کام کی کشش ہمیں باندھے رکھتی تھی۔ جہاں بھی جاتے تھے گویا ڈیوٹی پر جاتے تھے۔ داعی کے لیے حقیقت میں کوئی چھٹی نہیں ہوتی، ہم اس کے مصداق تھے۔

اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

دنیا اور ہم

آخری چیز یہ ہے کہ ہم دنیا کی چمک دمک سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔ دنیا ہماری قوت ایمانی کے سامنے ہیچ معلوم ہوتی تھی۔ یہ حقیقت ہر وقت مستحضر رہتی تھی کہ دنیا ایک بے حقیقت اور فانی چیز ہے، اس لیے اس سے کبھی مرعوب نہ ہوتے تھے، نہ اس کے جلال سے اور نہ اس کے جمال سے، دنیا کو ہیچ سمجھنے کا جذبہ توانا رہنا چاہیے۔ یہ چیز ہمیں دعوت کے لیے باہمت بناتی تھی، کسی سے خوف نہیں آتا تھا اور نہ کوئی پریشانی ہوتی تھی۔ یہ سوال بھی کبھی نہیں ستاتا تھا کہ مدت گزر گئی ہے، منزل ابھی تک قریب کیوں نہیں آئی ہم نے سمجھ لیا تھا کہ شہداء علی الناس ہونا بجائے خود ایک بلند مقام ہے۔

اس سارے بیان سے مقصود یہ ہے کہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی بنا کردہ کام اور تیار کردہ کارکن کا معیار ہمارے سامنے رہے۔ اس سے ایسا آئینہ تیار ہو جائے جس سے ہم اپنے چہرے کے داغ دھبّے وقتاً فوقتاً دیکھ لیا کریں۔ ہمیں ہر وقت اپنا موازنہ پہلی اینٹ اور پہلے ردّے سے کرتے رہنا چاہیے۔

یاد رکھیے، انحطاط کبھی اعلان کر کے نہیں آتا۔ یہ دبے پاؤں آتا ہے۔ ایک ایک ذرّہ سرکتا رہتا ہے، پھر کچھ مدت بعد دیوار گرتی ہے۔ اس کی پہلے خبر نہیں ہوتی، اچانک وقت آتا ہے کہ عملِ انحطاط اپنی خوفناک تصویرِ تباہی پیش کرتا ہے۔ ہم لوگ جو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اور ان کے دامن تھامے ہوئے ہیں۔ ہمیں ہر وقت اپنا احتساب کرتے رہنا چاہیے۔ ہم میں جذبۂ اصلاح ہو، اخلاصِ نیت ہو اور ہمارا اخلاقی معیار اور داعیانہ کردار ہر حال میں برقرار رہے۔

قوت کی دو قسمیں

قوت کی دو قسمیں ہیں جو جماعتوں اور تحریکوں میں پائی جاتی ہے۔ایک عددی قوت۔ دوسرے صفاتی یا رُوحانی یا اخلاقی قوت۔ سیاسی سرگرمیوں کے تقاضوں سے غیر محسوس طور پر ہمارے اندر ''عددی قوت'' کو زیادہ اہمیت سے بڑھانے کا رجحان پیدا ہوا اور صفاتی قوت کا معیار کسی نہ کسی حد تک کم ہوا۔حرکت و کش مکش کا عمل جو کسی تحریک کی جان ہوتا ہے اس کے لیے عددیت بھی اہم ہے، مگر اصل قوت صفاتی قوت ہوتی ہے جو عددی قوت کو دس دس گنا تک بڑھا دیتی ہے۔ہماری اساسی پالیسی بلکہ امتیازی تنظیمی نقشہ برسوں سے اس اصول پر موسس تھا کہ اخلاقی وصفاتی قوت عددی قوت سے زیادہ اہم ہے، چنانچہ جماعت نے بارہا ایسے ارکان کو الگ کر دیا جو کم سے کم درجے کے مقررہ دستوری معیار سے نیچے چلے گئے۔

آج از سرِ نو تنظیمی عمل شروع کرتے ہوئے ہمیں لوگوں کو صاف صاف محسوس کرانا چاہیے کہ یہ کوئی خاص ''باڑہ'' نہیں جس میں جو داخل ہو جائے وہ اس کا ہو کر رہ جائے، بلکہ یہ اسلامی نظامِ جماعت ہے جس کا مقصد چند عقیدوں، عبادات اور اخلاق و معاملات کو اختیار کرنا ہے۔ جو یہ نہ کر سکے وہ ایک پاکیزہ مقصد کے لیے کام کرنے والی خالص دینی جماعت میں آ کر اسے تباہ یا کمزور کرنے کا باعث نہ بنے۔ اور اگر پہلے سے ایسے لوگ موجود ہوں تو یا تو وہ اپنی اصلاح کر لیں یا فی الحال متفق یا ہمدرد بن کر تعاون کریں۔ رکنیت کے معیار کو پست نہ ہونے دیا جائے ،بہتر ہوگا کہ عہد نامہ رُکنیت کی ہر رُکن تجدید کرے۔

با اُصول اور با کردار لوگوں کی جماعت میں اگر تعدادِ افراد تھوڑی بھی ہوگی تو کام زیادہ اور بہتر ہوگا، لیکن اُصول و کردار کی کمزوریوں کے ساتھ تعدادِ افراد اگر بہت زیادہ ہو تو باہم دگر

اختلافات، اظہارِ بے اطمینانی، غیبت، نجویٰ، عدم رازداری، غلط اعمال کا جماعت کے لیے باعثِ بدنامی ہونا، جماعتی تقاضوں کے مقابلے میں ذاتی مفاد کو ترجیح دینا، یہ سارے وجوہ مل جُل کر رفتارِ کار کو خراب کر دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں میل جول، لین دین، رہن سہن، وغیرہ کے اخلاقی تقاضے من مانے طرز ہائے عمل میں اتنے دب جائیں گے کہ ہمارے قول و فعل میں تضاد بڑھتا جائے گا۔

اپنے مقام و مرتبہ کا شعور

ہمیں اپنے اندر اس احساس کو از سر نو اُبھارنا چاہیے کہ ہم اوّل و آخر اسلام کے مشنری، داعی، نقیب اور انقلابی سپاہی ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا کام لوگوں تک پہنچنا، عوام سے ملنا اور مخالفین کی غلط فہمیاں رفع کرنا ہے۔ بسوں، گاڑیوں، ہوٹلوں دفتروں، ہسپتالوں، درس گاہوں اور کارخانوں کے تمام اداروں میں گھس کر اپنا پیغام پہنچانا، پریس اور پلیٹ فارم سے آوازۂ حق بلند کرنا، ہر قسم کی علمی و ادبی اور صحافیانہ سرگرمیوں کے ذریعہ کلمۃُ اللہ کے نور کو پھیلانا، مکتوب نگاری اور مکالموں کے ذریعے خدا اور رسولؐ کی واضح کردہ ہدایت کی طرف زیادہ سے زیادہ لوگوں کو متوجہ کرانا ہمارا اساسی اور دائمی پروگرام ہے۔

ہمارا کوئی بھی شخص دفتر چلاتے ہوئے، سودا سلف بیچتے ہوئے، خطوط لکھتے ہوئے، ٹیلی فون کرتے ہوئے، کسی سے کچھ لیتے اور کسی کو کچھ دیتے ہوئے اور اپنی زبان سے کچھ نکالتے ہوئے بھی یہ امر شدّت سے ملحوظ رکھے کہ میں خدا کا مقرر کردہ شاہد و نقیب اور محمدیؐ انقلاب کا سپاہی ہوں اور میرے کردار میں ہر دوسرے آدمی کے لیے کشش ہونی چاہیے۔

متذکرہ بالا اساسی پروگرام کی روح رواں اللہ پر ایمان، اللہ سے محبت اور اللہ کی اطاعت ہے۔ توجہ رہنی چاہیے کہ اللہ کے ذکر کی کیا شرح ہماری روزمرہ زندگی میں ہے۔ ہم کس تناسب سے خدا پرستی کی بنیادی دعوت کی طرف لوگوں کو پکارتے ہیں اور ہماری گفتگوؤں کا کتنا حصہ خدا کے ذکر، خدا کے دین کی دعوت، خدا کے رسولؐ کی محبت، خدا کی کتاب کے بارے میں سعیٔ فہم، عبادت کی باہم ترغیب و تحریص اور خدا پرستانہ انقلاب کی مساعی اور اس کے مراحل پر صرف ہوتا ہے۔

ہمارے اندر یہ احساس بھی شدت سے موجود ہونا چاہیے کہ ہماری دعوت اور ہمارے ذاتی اخلاقی اور اجتماعی سرگرمیوں کے انداز میں کوئی تضاد باقی نہ رہ سکے۔

اپنا یہ صحیح مقام اگر ہم نے دورِ نو کا آغاز کرتے ہوئے پالیا تو ہم یک دِل و یک جان بھی ہوں گے، سرگرم اور متحرک بھی اور اطمینان سے بہرہ مند بھی۔

حالتِ جنگ

یہ حقیقت بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو کہ ہم حالتِ جنگ میں ہیں۔ ہر باطل نظریے اور ہر فاسد تحریک و تہذیب جو ہم پر حملہ آور ہے اور ہر طاغوتی قوت جو ہمارا راستہ روکتی ہے اور پھر ہمارا بگڑا ہوا ماحول جو سیلابی ریلے کی طرح ہمیں نہ صرف آگے بڑھنے سے روکنا چاہتا ہے، بلکہ قدم بہ قدم پیچھے دھکیلنا چاہتا ہے سب سے متعلق ہمارا پختہ انقلابی عزم ہونا چاہیے کہ ان مانع و مزاحم قوتوں کے دباؤ کا اثر ہم کبھی قبول نہ کریں گے۔ اور ایک جگہ جم جانا تو کجا، ہم دینِ حق کے جادۂ انقلاب کی ایک ایک قدر کو دانتوں سے پکڑ کر رکھیں گے۔ اور اپنی سہولت کے لیے حق اور نیکی کا کوئی ذرّہ بھی کسی دباؤ ڈالنے والی قوت کے قدموں پر نچھاور نہیں کریں گے۔

پس اگر ۱۹۸۶ء کا آغاز جماعتوں کی بحالی سے ہوتا ہے تو نئے عزائم کے ساتھ، تحریکی شعور کی تجدید کے ساتھ، عوام میں کام کرنے کے نئے نقشوں کے ساتھ، خدا سے اپنے معاملات کو بہتر بنانے اور اسلام کی اخلاقی پابندیوں کو اپنے اندر پوری طرح نافذ کرنے کے جذبے کے ساتھ اٹھیے اور میدانِ عمل میں نئے انداز سے اس طرح اقدام کیجیے کہ آپ اپنے تحریکی وجود کو حکومتی اور عوامی حلقوں میں اچھی طرح محسوس کرا دیں۔

خدا ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

ایک اہم سوال

ایک قابلِ غور سوال یہ ہے کہ پچھلے دس یا پندرہ برس میں ہمارے اندر کیا تغیرات واقع ہوئے ہیں، یعنی اوّلاً ذاتی دائرے میں ــــ طرزِفکر کے لحاظ سے، دل چسپیوں کی ترتیب کے لحاظ سے، سرگرمیوں کے محور کے لحاظ سے، دعوتی اور معاشی کاموں میں توازن کے لحاظ سے، عاداتِ مطالعہ کے لحاظ سے، معاشرتی مرتبے کے لحاظ سے، آسائش پسندی کے لحاظ سے، وھلم جرّا! اسی طرح اجتماعی دائرے میں۔

ہماری پسند اور ناپسند کے معیارات میں فرق تو نہیں آیا؟ کچھ ایسی چیزیں تو نہیں جن کے لیے ہم کل تک دینی بنیادوں پر بڑا زور دیتے تھے اور اب ڈھیلے پڑ گئے ہیں؟ کچھ ایسی چیزیں تو نہیں جن کو کل ہم برداشت کرنے کو تیار نہ تھے اور اب یکا یک انھوں نے ہماری زندگی میں جگہ بنالی ہے؟ ہمارا بنیادی رویہّ یہ تھا کہ ہر شخص اس کرید میں رہتا تھا کہ زندگی میں ناجائز عناصر کیا کیا اور کہاں کہاں ہیں تاکہ ان سے جلد نجات پائی جائے۔ سوال یہ ہے کہ آیا ہم سب میں یا ہماری غالب اکثریت میں یہی رویہّ کام کر رہا ہے یا اب یہ نقطۂ نظر بھی نمودار ہو رہا ہے کہ مفاد اور عادات جس شکل میں بھی زندگی کے نقشے میں جگہ پا چکے ہوں ان کے لیے گنجائشِ جواز تلاش کی جائے؟

لوگوں سے میل جول، دعوتی رابطوں، افراد سے افہام و تفہیم کی گفتگوؤں، لٹریچر کی دست بدست اور خانہ بہ خانہ تقسیم کا معاملہ کیسا ہے؟ بات پہلے ہی کی طرح ہے یا کچھ فرق ہے؟

آپ کے مال میں سے انفاق فی سبیل اللہ کا تناسب کیا ہے؟ مساجد سے تعلق کتنا ہے؟ قرآن کی تلاوت اور اُسے سمجھنے کی کوشش کے ساتھ احادیث کا علم کس رفتار سے بڑھ رہا ہے؟ آپ کے معمول میں نمازوں اور دوسرے خاص اوقات کی دعاؤں اور اذکار میں سے کیا کیا اپنی جگہ قائم

ہے؟ کچھ مدت پہلے کے مقابلے میں اضافہ ہوا ہے یا کمی؟

یہ احتساب (STock Taking) روزانہ بھی ہونا چاہیے، کسی خاص مہماتی دور کے بعد بھی اور کبھی کبھار کئی برس کا جائزہ اکٹھا بھی لینا چاہیے۔

اس خاموش خود تنقیدی سے آدمی کو اپنے بہت سے اسرار کا پتہ چل جاتا ہے۔ ضعف و استقامت کا اثر ہو تو وہ معلوم ہو جاتا ہے، تاب و تواں میں اضافہ ہوا ہو تو اُسے بھی آدمی جان لیتا ہے، بہت سی خود فریبیوں سے نکل آتا ہے اور اگر وہ چاہے تو اپنی داعیانہ شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ کی وقتاً فوقتاً تھوڑی بہت مرمت کر کے مضبوطی حاصل کر لیتا ہے۔

خدا پرست آدمی کو ہمیشہ اپنی گھات لگائے رکھنا چاہیے۔ اپنے باطن سے اپنی نیتوں سے، اپنی عادات سے، اپنی دل چسپیوں سے، اپنی سرگرمیوں سے غفلت ویسا ہی نقصان دیتی ہے جیسے کوئی مالی اپنے چمن کی دیکھ بھال نہ کرے تو اُس کی کیاریاں خراب ہو جائیں گی، مینڈیں ٹوٹ پھوٹ جائیں گی، پودے اس بے ڈھنگ طریقے سے بڑھیں گے کہ جنگل کا سماں ہوگا، بعض قیمتی اور نازک پودے سوکھ کر ختم ہو جائیں گے۔ مویشی اور پرندے شاخوں اور پھلوں اور پھولوں کو ستیا ناس کر دیں گے۔ سبزہ سبزہ بیگانہ ہو جائے گا اور جگہ جگہ نرسل سر اُٹھائیں گے۔

پس باہر کی دنیا کے احوال کا معاملہ بعد میں آتا ہے۔ سچّا خدا پرست اپنے اندر کی دنیا کو درست اور صحت مند اور خوش آئند رکھتا ہے تو اس کے نتیجے میں وہ باہر کی دنیا سے بھی بخوبی نمٹ لیتا ہے۔ کہاوت ہے کہ ''جان ہے تو جہان ہے'' مگر ایک مسلمان یوں سوچتا ہے کہ ''ایمان ہے تو جہان ہے۔'' یہ جہان ہو کہ وہ جہان، دونوں میں خیر و خوبی اگر حاصل ہوتی ہے تو ایمان سے، ایمان نہیں تو سب کچھ ویران ہے اور عذابِ جان!

اپنے دل کی دُنیا میں جھانکیں

کیا ہم کبھی خارج کی دنیا سے الگ اور جسم کے تقاضوں سے بے تعلق ہوکر بھی اپنے دلوں کی گہرائیوں میں اُترنے کا موقع پاتے ہیں؟ ہمارے گردوپیش کے ہنگامے اتنے بڑھ گئے ہیں اور زندگی کی روا رَوی اتنی تیز ہوگئی ہے کہ نظر کہیں ٹھہر ہی نہیں پاتی۔ ہم بہت سے مشغلے اور دل چسپیاں رکھتے ہیں، صرف اپنے سے ہی دل چسپی ختم ہوگئی ہے۔ خارج کے احوال سے تعلق اتنا گہرا ہوگیا ہے کہ داخل کا مکان مقفل پڑا رہتا ہے۔ دوسروں ہی کے ساتھ اتنے جھمیلے ہیں کہ اپنے دل سے کوئی ربط باقی نہیں رہا۔ ساری دنیا کی اصلاح کا ذمہ ہم لے لیتے ہیں مگر اپنی روح ہی کی بگڑی نہیں بنا سکتے۔

جہانِ دل کی سیر

کیا آپ کو صحیح صحیح اندازہ ہے کہ ہمارے دل کا کیا عالم ہے؟ اس میں کتنا کوڑا کرکٹ جمع ہے۔ کیسی کیسی شاندار غلاظتوں کے ڈھیر جگہ جگہ لگے ہیں؟ مرُدوں کی ہڈیوں اور سڑے ہوئے گوشت جیسی بساند بھری ہے۔ مکڑوں نے جالے تن رکھے ہیں۔ خونخوار چمگادڑوں کی پھڑ پھڑاہٹ باطنی فضا میں سنائی دیتی ہے، ناگ پھنکارتے ہیں، اُلوؤں کی مہیب آوازیں گونجتی ہیں، طرح طرح کے بت جگہ جگہ نصب ہیں۔ دیواروں پر منحوس عریاں تصویریں نقش ہیں۔

اپنے باطن کی اس ناپاک دنیا کو ہم دل فریب گفتگوؤں اور لچھے دار تقریروں سے چھپاتے ہیں، ان کو لطیفوں اور قہقہوں سے ڈھانپتے ہیں، ان کو مصنوعی سنجیدگی و وقار کے پردوں سے سجاتے ہیں، دولت کے انباروں، عیش کے سامانوں، خوب صورت بنگلوں، لطیف فنی شاہ پاروں،

پُربہار سماجی اور ثقافتی تقریبوں میں نگاہوں کو الجھا کر آگے بڑھنے سے روک دیتے ہیں۔ دوسروں کی نگاہوں سے چھپنا چھپانا تو الگ رہا، ہم اپنی ہی نگاہوں کو اپنے دلوں تک پہنچنے سے روکتے ہیں۔ اپنے باطن پر نگاہ ڈالنے کے لیے ہمارے پاس فرصت نہیں۔ ہماری مصروفیات بے پناہ اور ہمارے عہدے بڑے اونچے ہیں۔

دل کا دروازہ کھولیے

پھر کیا آپ ایسا محسوس کرتے ہیں؟ اگر آپ کو یہ مبارک احساس ہے تو دل کا مقفّل دروازہ کھولیے اور اس کے اندر گرد سے اَٹی ہوئی سیڑھیوں سے تاریکی ہی کے عالم میں اُتر جایئے اور اگر کہیں کوئی روشنی ہو تو بہتر، ورنہ ہاتھوں پیروں سے ٹٹول کر دیکھئے کہ اس میں کیا کیا کچھ ہے۔ کانوں سے کوئی آواز سنائی دے تو اسے سنیے کہ کیا آواز ہے اور کیسی؟ خوش نصیب ہیں وہ جو روزانہ ایک آدھ مرتبہ اپنے ایوانِ دل کا چکر لگا لیتے ہیں۔ پھر وہ بھی بُرے نہیں جو کبھی کبھار کوچۂ دل کی گردش کرتے رہتے ہیں۔ جن کو سرے سے یہ توفیق ہوہی نہیں، ان کو قیامت کے دن خبر ہوگی کہ نجات نہ مال و جاہ پر منحصر ہے، نہ بیوی بچوں اور قرابت داروں پر، نہ مرعوب کُن لباسوں پر، نہ پلے ہوئے آراستہ جسموں پر —— وہاں تو معاملہ دوسرا ہے۔

اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝ (الشعراء:۸۹)

''نجات اور کامرانی صرف ان کے لیے ہے جو قلبِ سلیم کے ساتھ حاضر ہوں''

آج ہمارے سوچنے کا سوال یہ ہے کہ آیا قلبِ سلیم کی دولت ہمارے پاس ہے؟ سلامتی والا دل، حق شناس دل، راست باز دل ہمارے سینوں میں ہے؟

اگر یہ نہیں تو پھر سارے ظاہری ہنگامے اور سرگرمیاں اور بڑے بڑے مناصب اور مشغلے، حسن گفتار اور جوشِ اظہار، اختیارِ حکم اور طاعت طلبی، بڑے بڑے اصحاب کی ہم نشینی، بڑے بڑے کاروبار چلانے کی اسکیمیں، راحت کے اسباب سے بھرا ہوا گھر سب کچھ بیکار ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

تو ہم نے یہ کبھی دیکھا ہی نہیں کہ پہلو میں دلِ زندہ ہے یا نہیں؟ آیا وہاں سِل یا سوکھے

کا کوئی لاعلاج مریض پڑا ہے یا دل کی بجائے دل کی میت پڑی ہے اور وہ سڑ بگڑ رہی ہے۔
خوب سمجھ لیجیے کہ آپ کی ساری کمائی اور سارا خزانہ یہی کچھ ہے۔ آپ نے اگر اسے گلشن بنایا ہے تو قیامت میں سامنے آجائے گا اور اگر گلخن بنایا تو یہی آپ کی محل سرائے ہوگی۔

خرابیِ دل کے اسباب

دل کی تباہی چند چیزوں سے ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ طرح طرح کی جسمانی خواہشات اس کے گرد محاصرہ کرلیں اور ساری توجہ دولت اور اسباب اور کاروبار کی طرف منعطف ہوجائے۔ اس طرح دل کے گرد کئی خول چڑھ جاتے ہیں جو اسے بھینچ کر اور اپنے پنجے میں جکڑ کر آہستہ آہستہ مرگِ دل کا سامان کرتے ہیں۔ یہی معنی اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ اور دوسرے ارشاداتِ قرآنی کے اور یہی مفہوم ہے اِن احادیث رسالت کا جن کا مغز یہ ہے کہ کفاف کی گزران بہترین معیشت ہے، اس سے آگے بڑھ کر جب دولت کی ریل پیل سے سابقہ پڑے گا تو حال یہ ہوجائے گا۔

مسکیں دلکم ماندہ دریں کش مکش اندر

اِس دل پر آپ سونے چاندی کے انبار لاد دیں۔ اس پر بھاری عمارت کا بوجھ کھڑا کردیں۔ اس پر نئے نئے اسبابِ تعیش کا انبار ٹھونس دیں۔ اس پر مفاد کے جھگڑوں کے ہل چلادیں اور یہ سمجھیں کہ یہ ہستیِ نازک محفوظ رہ جائے گی، یہ ایک بڑی خود فریبی ہے۔ دل پر بوجھ کم کیجیے ـــ خواہشوں اور لذّتوں کا بوجھ، کثرتِ اسباب و وسائل کا بوجھ، جھگڑوں اور جھمیلوں کا بوجھ، خیانت اور پیش دستی کا بوجھ۔

دل کی شامت انسانی معاملات و تعلقات کے دائرے میں آتی ہے کسی کی طرف سے ذرا سی غفلت ہوگئی اور آپ کے اندر کینے کی میخ گڑ گئی۔ کسی سے نقصان یا رنج پہنچا یا کوئی شخص آپ کے مفاد کا آلۂ کار نہ بنا تو اس سے نفرت ہوگئی۔ کسی کے متعلق آپ کی یہ سوچ کہ یہ شخص اپنی نیکی یا ذہانت یا اپنی بے نیازیٔ مفاد کی وجہ سے میرے منصوبوں کی راہ میں رکاوٹ ہے، لہٰذا اس سے بیزاری ہوگئی۔ کسی نے حق بات کہہ دی تو آپ کو غصہ آگیا۔ اور پھر وہ ایک مستقل غِل بن گیا۔ کسی نے یہ دیکھا کہ کسی خاص مقام کو پانے میں فلاں کا وجود حائل ہے تو اب آپ اس کے پیچھے پڑ گئے کہ کسی نہ کسی طرح اس رکاوٹ کو دور کرنا ہے اور اسے دور کرنے کے لیے آپ نے اس کے خلاف کیس تیار کرنا شروع کردیا، نیز کسی دوسرے کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش شروع کردی۔ کسی نے

اختلاف کیا تو آپ نے محسوس کیا کہ توہین ہوگئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کے دل میں اُس کے لیے ایک مستقل تحقیر بیٹھ گئی۔ کسی نے تنقید کا کوئی کلمہ کہہ دیا تو آپ کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اُس نے ؎

ایک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

پھر اس کے ردِّ عمل میں شدید جھنجھلاہٹ، تندیٔ گفتار اور اُسے یہ محسوس کرانا کہ ہماری نگاہ میں نہ تمھاری وقعت ہے، نہ تمھارے نقطۂ نظر کی کوئی قیمت۔ تم ایک جاہل کندۂ ناتراش اور مقام و مرتبہ کے لحاظ سے ہمارے سامنے بہت پست مقام پر ہو۔

کسی کے خلاف غیبت، کسی کے خلاف جتھہ بندی، کسی کے خلاف منصوبہ بندی، کسی کے خلاف نفسانیت کے وار، مگر ان کا پیرایہ اصولی۔

اور ایک مصیبت کبر کی۔ کبرِ علم اور کبرِ منصب اور کبرِ پارسائی اور کبرِ ذہانت، کبرِ قوت، کبرِ دولت، کبرِ زیرکی و چالاکی ـــــ اور پھر کبر کے منارے پر کھڑے ہوکر دوسروں کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس کرنا کہ یہ سب بونے ہیں، چیونٹیاں رینگ رہی ہیں، کوئی ہم سر نہیں، کوئی بھائی اور دوست نہیں۔

کوئی دیہاتی ہے تو اس کا وجود دیوِ کبر کے لیے بہترین غذا فراہم کرتا ہے، کوئی غریب ہے تو اس کی غریبی ہمارے غبارۂ نفس کو پھُلا دیتی ہے، کوئی اَن پڑھ ہے تو ہم خیال کرتے ہیں کہ ہمارے سامنے یہ بےچارہ تو محض بھیڑ بکری ہے۔

قلب کی سلامتی ایمان باللہ اور خوفِ خدا سے ہے، مگر جب ساری توجہات معیارِ زندگی بنانے پر صرف ہو رہی ہوں اور ساری مساعی نت نئے کاروبار کی راہیں نکالنے میں کھپ جائیں۔ دماغ کی کاوشیں مختلف اسباب ـــــ قالین، صوفے، ٹیلی ویژن، وی سی آر، کپڑے دھونے کی مشین، اے سی، جمع کرنے کے لیے وقف ہوجائیں اور جب خوب خرچیلی اور ٹھاٹھ باٹھ کی تقریبیں ہونے لگیں تو ہمارے دل کا زندگی میں کیا مقام رہا۔ ستم یہ کہ یہ سارے کھیل دوسرے کھیلیں تو دنیا پرستی اور ہم کھیلیں تو عین خدا پرستی اور خدمتِ دین ہے۔ ہر غلط چیز پر خدا پرستی اور تقویٰ کا لبادۂ رنگیں موجود!

دل کی آفات

جس دل کو یہ آفات درپیش ہوں کہ اُس سے کد اِس سے کد، کسی سے کینہ، کسی سے کُٹی،

کسی سے کھینچا تانی، کسی کے لیے نفرت وتحقیر، کسی کی کمزوری غذائے غرور، کسی کے خلاف غیبت، کسی کے خلاف نجویٰ اور محاذ آرائی، کسی سے ترکِ سلام، کسی سے رنج ہوا تو معاف کرنا حرام اور کسی کے لیے معافی دہی کا دروازہ بند، معافی دی بھی لفظوں میں دی مگر اخلاص سے نہیں دی، کسی سے سرمایہ حاصل کرنے کی خواہش، کسی کے ہاں سرمایہ لگانے کی بے چینی، کسی کی حصہ داری سے شکایت، کسی قرابت دار سے قطع رحمی، کسی ضرورت مند کے لیے ایثار ناپید، اجتماعی املاک کو ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا —— غرضیکہ دل پر ہر طرف سیاہ نقطے مسلسل لگ رہے ہیں اور پھیل رہے ہیں اور وہ سیاہی کے غلاف میں اس طرح لپٹا جا رہا ہے کہ وہ جو دنیا بھر میں شمعیں جلاتے پھرتے ہیں ان کے اندر کا چراغ کشتہ ہو کے رہ جاتا ہے۔

چہر روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

جب اپنے باطن کا اصل عالم یہ ہو تو چہرے خوب تاباں ہوئے تو کیا! اندر پیپ اور کچ لہو بھرا پڑا ہو تو اس سے کیا فائدہ کہ ماتھے پر بناوٹی طور سے گلاب کے پھول کھل رہے ہوں۔ اندر زخم اور گھاؤ ہوں تو باہر دنیا جہان کی مسیحائی کرنے کی ایکٹنگ کس لیے؟ اندر ماتمی فضا ہو تو کیا حاصل ہے کہ باہر مسکراہٹوں کے پردے آویزاں ہوں۔ اندر کڑواہٹ بھری ہے تو کیا افادیت کہ باہر لبِ گفتار سے شہد ٹپک رہا ہو۔ اندر پستیاں ہوں تو باہر بلند مسندوں پر بیٹھنے سے حقیقی بلندی کیسے پیدا ہو جائے گی؟

خدا اور دِل

جن لوگوں کو خدا سے بات بنانی ہو تو وہ سب سے پہلے دل کی خبر لیں! دل درست ہے تو ساری زندگی درست ہوگی اور دل فساد زدہ ہے تو ساری زندگی بگڑ جائے گی۔ دل زندہ ہے تو سب کچھ سلامت، دل مر گیا تو سب کچھ بھسم۔

گھٹیا جذبات کی گندگیوں سے بھرے ہوئے دلوں کو لے کر جب ہم آخرت میں پیش ہوں گے تو اس وقت معلوم ہوگا کہ قلبِ سلیم یا اخلاص نیت کے بغیر شاندار سے شاندار فردِ عمل بے کار ہے۔ ریا کے کاموں کی کوئی قدر وہاں نہیں ہے۔ شہرت طلبی کے لیے کی گئی عبادات وخدمات کو ذرّہ بھر وزن حاصل نہیں ہے۔ معاملات انسانی اور تعلقاتِ انسانی کو خراب کرنے والوں کو نہ

تقریریں بچا سکیں گی نہ تسبیحیں۔ عہدے اور مجلسیں اور بیان اور قرار دادیں اور پالیسیاں اور دورے اور استقبال اور پھولوں کے ہار اور دعوتیں اور استقبالیے امراضِ دل کا علاج نہیں ہیں۔

علاجِ بیماریِ دل

امراضِ دل کا علاج صرف یہ ہے کہ آدمی حالتِ دل کا جائزہ لے اور جو جو روگ لگ گئے ہوں یا جن جن جراثیم کا حملہ ہوا ان کو اچھی طرح سمجھے۔ اسے اندازہ ہونا چاہیے کہ وہ کس پستی اور کس گندگی اور کس تاریکی اور کس ذلت سے دوچار ہے۔ وہ دیکھے کہ کن خواہشات نے خانۂ دل پر قابو پا رکھا ہے۔ کون سے ارذل جذبات اس میں گندگی پھیلا رہے ہیں۔ کن کن انسانوں اور دوستوں اور رفیقوں کے لیے اس کے اندر زہر بھرا ہوا ہے۔ کن کن لازمی رشتوں اور رابطوں کو کاٹنے والی قینچیاں اس کے سینے میں نصب ہیں۔ کہاں کہاں اس نے بے جا فاصلے بڑھا رکھے ہیں اور کدھر کدھر ناروا قرابتیں پیدا کر رکھی ہیں۔ کن دھڑے بندیوں میں وہ مبتلا ہے۔ کیسی کیسی محبتوں کو اُس نے دور دھکیل رکھا ہے۔ کن کن خیر خواہ محبوں کو اس نے دشمنی کے مقام پر جا کھڑا کیا۔ ہے کن دوستوں کو اپنے سینے سے چمٹانے کے بجائے اس نے اپنے آپ سے دہلا کر رکھا ہے۔

اس طرح کے سوالات کو سامنے رکھ کر جب دل کا احتساب کیا جائے تو پھر حقائق سامنے آجاتے ہیں اور اپنی اصلاح کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

صفائی دل

جس لمحے میں غولِ شیطانی کی یورش کم ہو، ہمارے لیے آسان ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے دل کی دنیا تک رسائی حاصل کریں۔ ایسے لمحے میں آدمی کو اپنے خلاف آپ ناقد اور محاسب بن جانا چاہیے۔ ان تمام زہریلے کانٹوں کو دل سے چُن چُن کر نکالنا چاہیے جو اسے جبّار و مُتکبّر اور یؤس وقنوط بناتے ہیں۔ اس مقدس مکان میں سے ہر ناپاک چیز کو نکال کر باہر پھینک دیجیے۔ اس میں جھاڑو دیجیے، چھڑکاؤ کیجیے اور آنسوؤں کے چراغ جلایئے۔

مومن کا دل ایمان والا دل ہونا چاہیے جو عبدیت کے احساس سے مالا مال ہو اور خدا کی عبادت کے اخلاص مندانہ جذبے کے ساتھ مخلوقِ خدا کی ہر بہترین خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہو۔

اسبابِ تقویت

اس کام میں جہاں روزہ اور نماز سے مدد ملتی ہے وہاں قرآن کو شوق اور رغبت کے ساتھ سمجھ کر پڑھنے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اذکارِ مسنونہ کی کثرت بڑی مفید ہے۔ صدقہ و انفاق باعثِ برکت ہے۔ صدقہ کی یہ شکل خاص اہمیت رکھتی ہے کہ اپنے سے کمزور انسانوں تک آدمی چل کر جائے۔ ان کے احوال میں دل چسپی لے اور ان کے مصائب کے بوجھ کو ہلکا کرنے میں مدد دے۔ جس کسی کو دُنیا والوں نے پستی میں ڈالا ہوا سے گلے سے لگا کر اُٹھا کھڑا کرے اور احساس دلائے کہ تم اونچے ہو اور ہر بلندی کو حاصل کر سکتے ہو۔

جو بھی گروہ بندیاں خالص حق کی بنیاد پر قائم نہ ہوں ان سے نجات حاصل کرے اور حق کی بنیاد پر قائم ہونے والی کسی بھی جماعت میں نہ گروپس پیدا کرے اور نہ ان میں شریک ہو۔ یہ منصوبے آدمی کو چھوڑ دینے چاہئیں کہ فلاں کو پیچھے دھکیلنا ہے اور فلاں کو آگے پہنچانا ہے اور فلاں اگر میری اسکیموں میں رکاوٹ بنے تو اس کا پتہ کاٹنا ہے۔ ایسے تمام فیصلے اللہ پر چھوڑ دے اور اپنے کام سے کام رکھے۔

منزلِ مراد

جب آدمی اپنے آپ کو اس مقام پر پائے کہ ذاتی وجوہ سے اسے نہ کسی کے خلاف نفرت و بیزاری ہو، نہ کسی کے خلاف کینہ و انتقام کا رجحان، نہ کسی کی بیجا حمایت اور نہ بے جا مخالفت کا جذبہ، نہ ناجائز طور پر حصولِ مفاد کی کوئی فکر، نہ دوسروں کے مقابلے میں کسی طرح کا احساسِ کبر و رعونت، نہ جتھابندیاں بنانے کی عادت اور نہ ان میں شریک ہونے کا شوق، نہ اقامتِ دین اور حصولِ رضائے الٰہی کے علاوہ کسی اور مقصد پر توجہ۔ تب یہ امکان ہے کہ آدمی کا قلب سلیم بن سکے اور آخرت میں ذریعۂ نجات و نجاح ہو۔ بس یہ ہے مومن کی منزلِ مراد!

آغازِ انقلاب

ذہنی انقلاب

بات بڑی سادہ سی ہے۔
ایک شخص کہتا ہے کہ دس جمع دس، بیس! — اکیس نہیں ہو سکتے۔ اور سب لوگ مان لیتے ہیں اور اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ اور سب لوگ قرنوں ''دس جمع دس بیس'' کہتے ہوئے اپنے سارے معاملات چلاتے ہیں۔ اپنی جگہ وہ ٹھیک بھی ہوتے ہیں۔

مگر ایک دن یکا یک ایک نیا آدمی اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ بھائیو! چھوڑو، دس اور دس، بیس کو — آج سے تم ایک نیا نسخہ استعمال کرو — دس ضرب دس، مساوی سو۔ بس اب کام اس ذہن سے کرو۔

سب چونکتے ہیں، ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہیں، مسکراتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ بالکل ٹھیک ہے کہ دس ضرب دس سے ایک سو بن جاتا ہے۔

اتنی بات سے ذہنی انقلاب واقع ہو گیا، نیا طرزِ فکر، نیا طریقِ کار اور نئے نتائج!

نئی انقلاب آفریں صدا

معاشرے کا قافلہ مدت تک کسی خاص ڈگر پر چلتا رہتا ہے۔ ایمان، جذبات، شعور، رسوم، عادات سب پر برف کی ایک تہ جم جاتی ہے۔ برف باہر نہیں، انسانوں کے اندر گرتی ہے۔ نتیجہ ہوتا ہے جمود — حرکت بھی جمود زدہ ہو جاتی ہے۔ تاریخ کا ارتقاء، تمدن کی ترقی، علوم کا فروغ، سیاسی قوت کا اُبھار، اخلاقی چراغوں کی روشنی کا پھیلاؤ، سب کچھ رک جاتا ہے اور مدتوں

رکا رہتا ہے۔بس قافلہ چلتا رہتا ہے،کوئی راستہ ہو نہ ہو،کوئی منزل ملے نہ ملے۔

پھر کوئی ایک شخصیت نمودار ہو کر ایسی انقلاب آفریں صدا لگاتی ہے کہ قافلے کے لوگ ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں، آواز کے رُخ پر پلٹ کر دیکھتے ہیں، آواز کو سننے اور اس کے معنی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آخر یہ ہوتا ہے کہ شعوری ایمان اور زندہ جذبہ واحساس کے ساتھ منزل کا تعین اور راستے کی شناخت کرتے ہوئے ایک نیا قافلہ حرکت میں آجاتا ہے۔جس کے ساتھ ساری تاریخ حرکت میں آجاتی ہے۔نظریات اور علوم اور زبان وادب حرکت میں آجاتے ہیں اور ایک نئی دنیا کے سروسامان ہونے لگتے ہیں جیسے کہ اقبالؒ نے کہا ہے ؎

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد! گفتند کہ برہم زن

ایسی ہی انقلاب انگیز شخصیت تھی مولانا مودودیؒ کی جن کی آواز پر اُٹھنے والا قافلہ موج درموج بڑھ رہا ہے۔

وحدتِ دین وسیاست

ان کے پیغام کا نیا پہلو یہ تھا کہ دین وسیاست میں تفریق نہیں کی جا سکتی، یعنی جس طرح فرد کے لیے لازم ہے کہ وہ ایک خاص اعتقادی اور اخلاقی سانچے میں ڈھلے، اسی طرح معاشرے یا قوم کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنی اجتماعیت کو اسلامی اعتقادات اور ضابطوں کے مطابق نشوونما دے۔ نیز اجتماعیت کو چلانے کے لیے ایسی قیادت کو اپنے اندر سے اُبھارے جو اسلام کو جاننے والی اور اسے نافذ کرنے کی صلاحیت رکھنے والی ہو۔ پھر ان کی سوچ یوں بھی نہ تھی کہ دین اور سیاست دو الگ مفردات ہیں۔ جنھیں ایک نسخہ میں ملانا ہے اور جب جس جز کو ضروری ہو بڑھایا یا گھٹایا جا سکتا ہے اور نئے نسخے تیار کیے جا سکتے ہیں۔ وہ وحدتِ انسانی کے قائل تھے، بلکہ یوں کہیے کہ سیاست ہو یا معیشت ومعاشرت سب کو اسلامی ایمان واعتقاد اور عبادات واخلاق کے ساتھ ضم شدہ تسلیم کرتے تھے۔ ضروریاتِ اخلاق ومدنیات میں سے جو چیز دین میں شامل اور اس مطابق نہ ہو وہ غیر اسلامی اور جو چیز اس میں شامل اور اس کے مطابق ہو وہ عین اسلام!— یہاں مشکل یہ ہے کہ ہمارا یہ معاشرہ جو تفریق دین ودنیا کی گود میں پلا ہے۔ اور ہم جو اس معاشرے کی گود میں پلے ہیں۔ دین کے دو

حصے الگ الگ کر کے ان کو ملانے کا تصور کرتے ہیں۔ یہ تصور دینی نہیں ہے۔

سیلاب کے مقابلے میں سیلاب

اس پیغام کو جب مغربی نظریات — سیکولرازم، سرمایہ داری اور کمیونزم — کے مقابل میں رکھ کر دیکھا جاتا تو فرماتے کہ جدید ملحدانہ افکار و تمدن کے سیلاب کے خلاف آپ کو ایک نیا سیلاب بن کر مقابلہ کرنا ہے جو غیر اسلامی سیلاب کا رُخ پھیر دے۔ ورنہ وقت کے سیلابِ بلا میں تیرنے یا اس کی موجوں پر بہنے یا اُس کے سامنے چٹانوں کی طرح کھڑے ہونے سے، بلکہ اس میں اپنی کشتیاں تیرانے سے اور ان میں بیٹھ کر منہ کسی اُلٹی طرف کر لینے سے بھی اصل مصیبت سے نجات نہ ہوگی۔

سوجھ بوجھ کے ساتھ اسلام کا نام لینا ایک نئی دنیا بنانے کا اعلان ہے۔ اس نئی دنیا کے لیے مسلم ذہن و کردار کے معمار اور مزدور چاہییں، ان کی اجتماعیت درکار ہے، ان میں فرد فرد تک دعوت پہنچانے اور اسے اپنے نصب العین کا سپاہی بنانے کی استعداد ہو۔ علاقے علاقے میں اس صلاحیت کے لوگ عوام کے لیے مرکز توجہ اور مرکز رابطہ بن کر بیٹھ جائیں اور ان کو اپنے ساتھ جمع کر کے اسلام دشمن عالمی نظریات کے خلاف جہاد کرنے کی تیاری کریں۔ یہ دراصل نئے دور کی نئی قسم کی تحریکِ جہاد ہے۔

انھوں نے تحریک کے لیے کارکنوں کی ایسی ٹیم تیار کی کہ وہ لوگ جس بات کو زبان پر لاتے اس کا پورا استدلال ان کے ساتھ ہوتا۔ بسا اوقات معمولی دیہاتی نوجوان اچھے تعلیم یافتہ اصحاب کو مادّہ پرستی، جدید نظریات اور اسلامی نظام کے متعلق متاثر کر لیتا۔

آج کا کارکن باتیں تو بہت سی کہتا ہے، مگر وہ ان کے ساتھ استدلال پیش نہیں کر سکتا، کیونکہ اس نے اس طرح مطالعہ نہیں کیا ہے جیسے شروع میں مولانا مودودیؒ نے ہر کارکن سے چاہا تھا۔ کاش کہ اس پہلو سے آج کی عددی پھیلاؤ رکھنے والی تحریک ایسی کمزوری کو نشوونما نہ پانے دے۔

مولانا مودودیؒ نے اسلامی نظامِ حیات کے ایک ایک اہم گوشے کا تفصیلی خاکہ کتاب و سنت سے اخذ کر کے دکھایا کہ کس طرح جدید دور کے تمام مسائل کو بہترین اسلوب میں حل کرنے کا اہتمام موجود ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اسلام کو محض سلوگن سمجھ کر کام نہ کیا جائے اور لوگوں سے ایک ایسی

چیز کا وعدہ نہ کیا جائے جس کی تشکیل و تکمیل کا وقت آئے تو سرے سے کوئی خاکہ ہی موجود نہ ہو۔

مولانا مودودیؒ اور تزکیۂ نفس

مولانا مودودیؒ کے متعلق ایک بات بہت اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ وہ محض سیاسی کھیل تماشے کے آدمی نہ تھے، بلکہ روحانی پہلو سے ان کا خاص مقام تھا۔ اس کا علم دو صورتوں میں خاص خاص لوگوں کو ہو سکا۔ ایک یہ کہ مصیبت زدہ اور ضرورت مند انسانوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کرتے رہے۔ دوسرے یہ کہ اپنے خاص اوقاتِ تنہائی میں وہ ذکر و دعا اور مطالعۂ قرآن و حدیث میں مصروف رہتے۔ ان کی روحانی تجلیات کا عکس سچے اہل ذوق ان کی بعض تحریروں میں پا سکتے ہیں۔ صرف ان کی دعائیں (جو کبھی کبھی اشارات میں آئیں) پڑھ لینے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس شخص کے تعلقات ''اُدھر'' کیسے تھے!

چند دوستوں نے ایک بار مل کر ایک جامع کتاب بڑی محنت سے تیار کی جس کا نام تھا ''تزکیہ نفس'' اور اس میں مولانا مودودیؒ ہی کے اشارات تھے، یا عبارات۔ کس محنت سے ہم نے یہ کام مولانا کی نگرانی میں کیا اور مولانا نے خود رہنمائی بھی دی اور اس کوشش کو پسند بھی کیا۔ کچھ نہ پوچھیے کہ کس طرح یہ مسودہ ہمارے ہاتھوں سے نکلا اور دست بدست ہوتا ہوا کہاں پہنچا — پھر کچھ پتہ نہ چل سکا کہ ایسی کوئی چیز تھی بھی یا نہیں[۱]

یہ روحانی قوت ہی تھی جس کے بَل پر کبھی وہ ایسی باتیں ہم سے کیا کرتے تھے کہ یہ لوگ (حکومت) میرے ساتھ اس طرح کی حرکتیں نہیں کر سکتے۔ ایسی روحانیت کے جلوے آپ پھانسی کی کوٹھری (۱۹۵۳ء) میں بھی دیکھتے ہیں۔ اور اسی کی مار ہے جس کا نشانہ ہر وہ ظالم بنا جس نے مولانا کے ساتھ کوئی زیادتی کی۔ زیادتی کرنے والا بہت بُرے حالات کا شکار ہوا۔

دیدی کہ خون ناحقِ پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

---

[۱] پرانی داستان ہے کہ کنویں میں مقید شہزادے سے اسم اعظم جِنّ لے اڑے اور دست بدست وہ آگے پہنچ گیا — وہی ہمارے ساتھ ہوا۔ شہزادے نے تو ایک جِنّ کو بیل کی شکل میں پکڑ لیا تھا، ہمیں نہ تو کوئی جِنّ ملا، نہ آدمی، نہ بیل!

گہری ذاتی دل چسپی

جب کبھی کوئی خاص تحریک چل رہی ہوتی، کوئی ملک گیر سرگرمی کسی بھی جانب سے موجود ہوتی، کبھی رویت ہلال وغیرہ کی اختلافی صورت زیر بحث ہوتی تو مولانا خود دفتر یا برآمدے یا لان میں دن یا رات کو بیٹھ جاتے اور اہلِ دفتر میں سے جو بھی موجود ہوتا اُسے کہتے کہ کراچی، فیصل آباد، راولپنڈی، ملتان، پشاور وغیرہ فون کر کے پوچھو کہ معاملہ کیا رہا۔ پھر یہ سلسلہ جگہ جگہ چلتا، یہاں تک کہ مولانا کے پاس اتنی جامع معلومات ہوتیں کہ نہ صرف وہ مختلف دریافت کنندگان کو بتاتے، بلکہ معلومات کی بنیاد پر جب کوئی بیان مرتب کرتے تو وہ بہت مؤثر ہوتا۔ جب کبھی انتخابات ہوتے تب بھی ایسا ہوتا۔

مجھے ایسے کئی مواقع یاد ہیں۔ خصوصاً ایک وہ واقعہ تھا جب ایوّب خاں کے دور میں جماعتوں پر سے پابندی ختم کی گئی تو مولانا نے باہر کی تمام جماعتوں کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ اجازت کے آغاز سے ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر دفتر اور جملہ نظام کو فوراً بحال کر دیں۔ پھر اس کے متعلق ہر جگہ سے مولانا نے معلومات لیں کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ اُن کا بیان آ گیا کہ ہم نے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تمام ملک میں اپنا جماعتی وجود اور نظام بحال کر دیا ہے۔

چہرے تمتما اُٹھتے

مولانا کے لیے عطیۂ خداوندی تھا کہ جب کبھی کوئی بیان دیتے تو ایک طرف حکومت یا کسی مخالف قوت کو ضروری جواب مل جاتا (یا اس پر تنقید ہو جاتی) اور دوسری طرف کارکنوں کے چہرے تمتما اُٹھتے، جیسے کہ کوئی گم شدہ متاع مل گئی ہو۔ دراصل کارکن جن مشکلات میں الجھے ہوتے اور جن بحثوں سے گزرے ہوتے اور ایک طرف مخالفین کی طرف سے طعن و تشنیع کا سلسلہ ہوتا اور دوسری طرف اپنوں کا داخلہ اضطراب۔ بس اس بھڑکتی آگ پر پانی پڑ جاتا۔

یہ کوئی پیری کی کرامت یا سیاسی ہپناٹزم نہیں تھا، بلکہ مولانا مودودیؒ جب کبھی کسی مسئلے پر برسرِ عام اظہارِ رائے کرتے تو ایک تو تخلیقی ذہن سے ندرت کی راہ نکالتے، دوسرے بات ایسے گٹھے ہوئے انداز سے کرتے اور ایسی پکی زمین استدلال پر پاؤں رکھ کے کھڑے ہوتے کہ بالکل اسی طرح کارکن یہ محسوس کرتا کہ اب وہ بھی اپنے بے گانوں کے سامنے دوٹوک بات کر سکتا

ہے، استدلال کی مضبوط سطح پر کھڑا ہے اور وہ اپنا سر بلند رکھ کر آگے چل سکتا ہے۔

مولانا مودودیؒ اپنے بیانوں میں طرح طرح کے متفرق شاخسانے پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ ''کچھ یوں بھی'' اور ''کچھ یوں بھی'' والی بات ہوتی تو لوگوں کو کبھی اطمینان نہ ہوتا۔ یا محض بطور امکان سوچیے کہ پالیسیوں کی حالت جب بھی یہ ہو کہ کبھی وہ تیز بخار کی نبض کی طرح ہوں اور کبھی قلت ضغطہ دموی کی طرح سے مریل، اور ایسی کئی کئی کیفیتیں پالیسی کی ایک قرارداد یا ایک بیان میں پائی جائیں تو کارکن کا شعور تو ڈانواں ڈول ہی رہے گا۔

مثلاً یاد کیجیے، دورِ ایوبی کے اس اعلان کو ہی کہ اگر کنونشن لیگ کسی فرشتے کو بھی کھڑا کرے گی تو ہم اسے ووٹ نہیں دیں گے۔ اس ذرا سے قول پر حکومت کے تیوروں سے جھڑتی چنگاریوں سے جیب و دامن کو جلوا لیا، مگر کسی مرحلے پر بھی اعترافِ گناہ اور اس پر اظہار ندامت کی پستی نمودار نہ ہوئی۔ اور اس چیز نے کارکنوں کے دماغ بھی بلند کر دیے۔

یہ بات مولانا نے یوں ہی لیڈری کی ترنگ میں نہیں کہہ دی۔ وہ اپنی جماعت کے قریبی حلقوں اور عوامی دائروں میں ایوب صاحب اور کنونشن لیگ کے متعلق پائے جانے والے ایسے اثرات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ جن کے ہوتے ہوئے تحریکی غیرت کا تقاضا یہی تھا کہ اہل جماعت کی مکروہ و مغضوب چیز کی طرف نہ جایا جائے، ورنہ کارکن بظاہر دوسری طرح کے حکم کو بھی سر آنکھوں پر لگائے پھر سکتا ہے مگر ساتھ ہی اس کا سر بھی چکرا رہا ہوتا ہے اور آنکھیں بھی نم ناک ہو رہی ہوتی ہیں۔[۱]

---

[۱] شخصی اور خاندانی اور قومی غیرت تو معروف عام ہے۔ ایک غیرت تحریکِ اسلامی کی غیرت بھی ہوتی ہے۔ مولانا نے ایک بار تحریکی غیرت کی بنا پر جس کسی کو نظر انداز کیا۔ پھر اسے کبھی اپنائیت کے دائرے میں نہیں لیا۔ اور کبھی اس سے دین یا تحریک یا جماعت یا اپنی ذات کے لیے کسی طرح کی خدمت نہیں لی۔ مجھے ایک زمانے میں کمیونسٹ اجلاسوں میں جمہوریت کے لیے تعاون کرنے کو بھیجتے رہے۔ پھر میں نے ایک بار کی جب تفصیلی رپورٹ دی کہ کس طرح دس پندرہ مصنوعی تنظیموں کے نمائندوں کے ووٹوں کے ذریعے ہمیں (میرے ساتھ کوئی اور صاحب بھی تھے) نہایت درست بات پرنا کام کر دیا تو مولانا نے ان سے سارا رابطہ ختم کر دیا اور پھر کبھی قائم نہیں کیا۔ معلوم نہیں کہ آج ان کی پیپلز پارٹی کے متعلق کیا رائے ہوتی۔

مشترک دینی روح

اپنے سے بعد والے ادوار کے لیے میں کہتا ہوں کہ خود بیانات کا رنگ تسلسل بھی دیکھنے کا ہوتا ہے۔ آج بات آسمان کی، کل زمین کی، آج رُخ مشرق کا، کل مغرب کا۔ آج پوری گرماگرمی، کل حد سے زیادہ نرمی۔ ایک دن بڑی مضبوط اصول پسندی، دوسرے دن ساز مصلحت کا راگ۔ ایک دن دینی اسپرٹ سے باتیں، دوسرے دن تمامتر سیاسی انداز تکلم۔ اگر تمام بیانات میں ایک مشترک مرکزی روح موجود نہ رہے، دین ہمیشہ جلوہ گر نہ رہے، اُصول ہمیشہ برتر نہ رہیں تو روز روز کی ادلا بدلی ارکان اور کارکنوں کے ذہنوں کو سخت پراگندہ، مضطرب اور معترض بنادیتی ہے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ آئندہ کی لیڈرشپ مولانا کے بیانات اور پالیسی کے فیصلوں اور قراردادوں کو نکال کر ایک ایک لفظ کو بغور پڑھے اور اپنے لیے نتائج و اسباق اخذ کرے۔

اصلاح و انقلاب کا دارومدار

مولانا مودودیؒ کے لٹریچر کو بغور پڑھیں یا ان کے علمی نقشہ ہائے کار کو دیکھیں، یہ بات بہت صاف ہو کر سامنے آتی ہے کہ اصلاح و انقلاب کا سارا دارومدار مولانا کے نزدیک بنیادی اسلامی دعوت کے فروغ پر تھا۔ اور اس اہم کام کے لیے وہ ہر مرحلے میں اور ہر مہم کے دوران میں یہ چاہتے تھے کہ کارکن لوگوں سے بالمشافہ رابطے کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ عام گفتگو بھی کریں، اعتراضات کو سنیں، جواباً دلائل دیں، جہاں ضرورت ہو لٹریچر بھی پیش کریں۔ ایک گفتگو کے بعد اس سلسلے کو آگے جاری رکھیں۔ متاثر ہو جانے والوں کے ذریعے ان کے حلقے کے نئے لوگوں سے تعلقات شروع کریں۔ ساتھ کے ساتھ لوگوں سے محبت بھی کریں، غریبوں کو سہارا دیں، علاج معالجے، تعلیم اور دوسرے پریشان کن مسائل میں ان کی مدد کریں۔ شعبۂ خدمت کام کر رہا ہو تو وہ اپنی جگہ کرتا رہے، مردوں اور خواتین کے حلقہ ہائے درس قائم ہوں وہ بھی فیض پھیلاتے رہیں۔ کوئی اخبار، رسالہ شائع ہو کر پھیلتا ہو تو وہ بھی اثر ڈالتا رہے، مزدوروں، طلبہ اور محلّہ وار تنظیموں اور مصالحتی عدالتوں کے ذریعے اسلام کی روشنی کو عام کیا جا سکتا ہو تو عام کیا جائے۔ جلسے اور مظاہرے ہوں تو گویا وہ مزید برآں ایک طرح کی کوششیں ہیں۔

اصل کام بنیادی دعوت کا ہے جو رابطۂ عام کے ذریعے ہونا چاہیے۔

اساسی نظریے کے بعد طریقِ کار کے تمام اجزاء میں سے اہم ترین جزو یہی بنیادی دعوت کا جزو ہے، جسے مولانا نے اپنے فکری اور تحریکی ترکے میں ہمارے لیے چھوڑا ہے۔

یہ کام کماحقہٗ نہ ہو تو نہ انقلاب کامیاب ہوسکتا ہے، نہ انتخاب، اس اصل کام میں اگر کمی رہے تو آپ نہ تو قوت کے مصنوعی مظاہروں سے اُسے پورا کر سکتے ہیں، نہ بیانوں اور انٹرویوز کے ذریعے اور نہ کمزوراَساس کے وقتی محاذوں اور اتحادوں کے ذریعے۔

خدا تعالیٰ ہمیں مولانا مودودیؒ کی ساری تعلیمات سے فائدہ اٹھانے کی عمومی توفیق کے ساتھ اساسی دعوت کے تقاضے کو ان کے منشاء کے مطابق پورا کرنے کی توفیق دے۔ اور ان کا منشاء اس بارے میں وہی ہے جو کتاب وسنت کا ہے۔

اسلامی تحریک اور اخلاقی علُو

یہی اَساسی دعوت اور رابطۂ عام کا سلسلہ اپنے اخلاق و کردار کی تعمیر اور اس کی حفاظت میں مدد دیتا ہے۔ اسلامی تحریک کی ساری نتیجہ خیزی اخلاقی علو پر مبنی ہے، جن لوگوں کی اخلاقی ساکھ گر جائے، پھر وہ اسلامی انقلاب تو کیا لائیں گے، اندیشہ ہے کہ کسی حادثے کی جھاڑو انھیں تاریخ کے آنگن سے کوڑے کی طرح باہر نہ اُٹھا پھینکے۔

مولانا کی بات یاد ہوگی کہ اس ٹکسال کے سکوں پر محض اشرفی کی مہر ہونا کافی نہیں، بلکہ دھات بھی خالص سونا ہونی چاہیے۔ کیا ہمارے کرداروں کے سکوں کی دھات خالص سونا ہے؟ اگر اس میں کچھ کھوٹ میل شامل ہوگیا تو بھٹیاں اور کٹھالیاں موجود ہیں، اپنی اپنی صفائی اور اپنے اپنے خالص پن کی فکر کیجیے۔

مولانا مودودیؒ کیا چاہتے تھے؟

وہ شخص کیا کام کرنا چاہتا تھا؟
وہ کیسے کردار کے لوگ اپنے گرد جمع کرنا چاہتا تھا؟
وہ کس طرح کی تبدیلی چاہتا تھا؟
وہ جماعت کو کتنا باوقار رکھنا چاہتا تھا؟
وہ محض سیاسی تگ وتاز چاہتا تھا یا سیاست برائے انقلاب کا علم بردار تھا؟

وہ اَساسی دعوت اور بنیادی رابطوں اور اخلاقی پاکیزگی کو کتنا اہم قرار دیتا تھا؟

یہ سارے سوال اب ایسے ہیں کہ جس کی جو مرضی ہو، ویسا ہی ان کے جواب دیتا ہے اور مولانا مودودیؒ کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیتا ہے۔

مولانا مودودیؒ کا وسیع لٹریچر ہر موضوع پر موجود ہے، مگر اسے ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے۔ اس میں سے جب ضرورت ہو، کسی مسئلے پر کچھ اقتباسات اپنی ضرورت کے ہم لوگ نکال لیتے ہیں۔ اور مجموعی مدعا کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ وہ تو ہم جانتے ہیں۔

اگر ہم لوگوں میں تساہل وتغافل پیدا ہو جائے تو اس سے آگے ایسا دور بھی آ سکتا ہے کہ مولانا کے پیغام اور لٹریچر اور تحریروں کی ایسی تاویلیں کی جانے لگیں کہ اُلٹ نتیجے نکلیں۔ اور لوگ کہیں کہ زمانے کے حالات اور وقت کی ضرورتوں کے تحت یہی عمل صحیح ہے۔ ہم سب کی خواہش ہونی چاہیے کہ مولانا مودودیؒ نے جو لکیر ۱۹۴۱ء سے کھینچ کر ۱۹۷۹ء تک پہنچائی تھی۔ اس مستقیم لکیر کو آگے بڑھایا جاتا رہے اور پیچ وخم پیدا کر کے اس لکیر کو منحنی لکیر نہ بنا دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ کی قبر مبارک کو نور سے بھر دے اور ان کی روح پر رحمتوں کی شعاعیں برسائے۔ جنھوں نے ہمیں دینِ پاک کا ایسا صحیح شعور دیا کہ ہم تحریکِ اسلامی کے علم بردار بن سکے۔

ضمیر کی آواز

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میرے ضمیر کی گہرائیوں سے ایک دھیمی سی آواز اُٹھتی ہے اور پھر وہ صورِ اسرافیل کی طرح حشر انگیز بن جاتی ہے۔ اس آواز کا مخاطب بالعموم میں خود ہی ہوتا ہوں مگر بعد میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو میری ساری مقصدی برادری کے لیے متاعِ مشترک ہے تو میں اُسے سب تک پہنچانے کے لیے لفظوں کا جامہ پہنا دیتا ہوں۔ میری بات اگر غلط ہو تو میں خدا سے بھی معافی مانگتا ہوں، آپ بھی میرے لیے معافی مانگیے، درست ہو تو میں بھی اس پر غور کروں، آپ بھی کیجیے، اور ہم سب دعا کریں کہ خدا اس آوازۂ ضمیر کو باعثِ خیر و برکت بنائے۔

تجدید ایمان و شعور کی ضرورت

ملک کا سیاسی ماحول سخت تاریک ہے، دینی لحاظ سے دیکھیں تو چاروں طرف سے ضلالت و رذالت کے طوفان اُٹھ رہے ہیں۔ اور اپنے آپ کو دیکھیں تو جہاں یہ وجۂ شکر سامنے آتی ہے کہ ہمارے دلوں میں ایمان کی شمع ہنوز جھلملاتی ہے، وہاں ہم یہ بھی محسوس کر کے اندوہ گیں ہو جاتے ہیں کہ ماحول کی تاریکیوں میں ضلالتوں نے ہم پر قابو تو نہیں پایا مگر اثر ضرور ڈالے ہیں۔ یہ احساس تقاضا کرتا ہے کہ اپنے ایمان کو زندہ تر اور اپنے شعور کو بیدار تر کیا جائے۔

بڑے کام کرنے والوں کو ہر وقت تجدیدِ ایمان، تجدیدِ نظریہ اور تجدیدِ شعور کرتے رہنا چاہیے۔ اسی کا نام تذکر ہے، جو مطلوبِ دین ہے۔ اپنے اصول و مقاصد کو بار بار سامنے لانا، اپنی روایات و اقدار کے چراغوں کی لَو کم نہ ہونے دینا۔ ٹھوس اور اصولی کاموں کے لیے یہ ایسی شدید بنیادی ضرورت ہے کہ یہ اگر بالکل ہی ملحوظ نہ ہو تو سارا کھیل بکھر جائے گا۔ اور اگر اس کا احساس

اور اس پر عمل ضرورت سے کم ہو تو چھوٹے چھوٹے انحرافات اور تصرفات خلل پیدا کریں گے اور خود اپنے اندر حالتِ اطمینان باقی نہیں رہے گی۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بجلی کی رَو یا بیٹری کی پاور کو ٹسٹ کرنے کے لیے یا گاڑی کے پہیوں میں بھری جانے والی ہوا کا دباؤ معلوم کرنے کے لیے، یا کم سے کم درجہ میں ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھنے کے لیے ایک سوئی یہ دکھاتی ہے کہ صورت درست ہے یا نہیں۔ بعض اوقات اُس سوئی کو آپ تیزی سے اِدھر اُدھر ہوتے، بلکہ لرزتے دیکھتے ہیں۔ دراصل یہ سوئی اگر اپنے مقررہ نشانِ توسط پر رُک جائے تو ٹھیک، ورنہ سراپا اضطراب بن جائے گی۔

ایسی ہی ایک سوئی ہمارے ضمیر کے اندر ایک مخفی ڈائل لگی ہوئی ہے۔ آپ جہاں اپنے اصول و مقاصد اور روایات و اقدار سے ہٹے، یہ سوئی اِدھر اُدھر ہونے لگتی ہے۔ دوسرے معنوں میں آپ حالتِ اطمینان کھو بیٹھتے ہیں۔ آپ کو اپنے اوپر، اپنے جادہ و منزل پر، اپنے زادِراہ پر یہ اطمینان نہیں رہتا کہ آیا یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ اس قسم کی حالتِ بے اطمینانی کا صحیح طریق سے اگر نہ آدمی خود ازالہ کر سکتا ہو، نہ دوسرے رفیقوں یا اکابر سے مدد لے سکتا ہو یا ایسے احساسِ مضطرب کو کسی حل کر سکنے والے کے سامنے رکھنے میں جھجک ہوتی ہو، یا وہ بات کسی اہم جگہ کر دے تو آگے سے ڈانٹ پڑ جائے، یا ماحول اُس کے ساتھ ہمدردی کرنے پر تیار نہ ہو تو وقت گزرنے کے ساتھ بے اطمینانی کی ظاہری کیفیت تو گزر جائے گی، مگر دل میں ایک زخم چھوڑ جائے گی ــــ اس سے قوت عمل کم ہو جاتی ہے۔ پھر اگر ایسے ہی زخم اور لگتے رہیں اور چارۂ ساز دم ساز کوئی نہ ہو تو ''من ہمہ داغ داغ'' ہو جاتا ہے اور آدمی کی روش میں اس کے ارادے کے بغیر یاس و جمود کا ایک رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

بیتے دنوں کی یاد

ذرا یاد کریں ۱۹۴۱ء سے کئی سال بعد تک کا دورِ رفتہ! ہم بڑا سرمایۂ اطمینان لے کر چلے تھے۔ اپنے نظریات، اپنے طریق کار، اپنی قیادت، اپنی قوتوں، اپنے زورِ استدلال، اپنے دعوتی پھیلاؤ، اپنی پابندیِ اصول، اپنے صاف ستھرے کردار اور اپنی مرکزی قیادت کے علاوہ اپنے مقامی امراء اور ناظمین پر کس درجہ اطمینان تھا۔

مولانا مودودیؒ نے دین وسیاست کو ایسا ہم آہنگ رکھا اور ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہونے کی حیثیت سے اس شان سے چلایا کہ جب کبھی اسلامی ریاست کے طے شدہ اصول ومنہج اور پیمانۂ پسند وناپسند اور اخلاقی حدود سے تجاوز یا پسپائی کی کوئی خفیف سی حرکت بھی کہیں واقع ہوتی تو مختلف اطراف سے مولانا کے پاس شکایات آنے لگتیں۔ مولانا صبر وتحمل سے ہر بات کو سنتے بلکہ کرید کرید کر دریافت کرتے۔ مجلسِ شوریٰ میں رپورٹیں طلب کرتے۔ انھوں نے کبھی کسی غلط حرکت کو زورِ کلام سے ملبوسِ جواز پہنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ساری معلومات جمع ہونے پر جماعت کی پہلے سے قائم شدہ اصولی پالیسی کے خطوط زیادہ واضح اور نمایاں کر دیے اور غلط اقدامات کو مسترد کر دیا۔ پالیسی جب اپنی جگہ پر سیٹ ہوگئی یا دوسرے لفظوں میں آپ کے قدم اُصول کی شاہراہ پر واپس آگئے، یا روایت کی ٹوٹی ہوئی لکیر بحال ہوگئی تو احساس کی سوئی پھر نقطۂ اعتدال پر آکر رُک گئی۔

لیکن اگر خدانخواستہ ایسا ہو کہ چھوٹی چھوٹی بے اطمینانیاں وقتاً فوقتاً آنے لگیں اور اُن کا تدارت نہ ہو سکے، کوئی ایسا مرکزِ محبت نہ ہو جو آپ کے سر اور شانوں تک شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہوئے آپ کو صحیح صورت سمجھائے یا آپ کا اٹھایا ہوا نکتہ صحیح ہونے کی صورت میں شکریہ کے ساتھ اسے قبول کرلے تو پھر اندر کے ان چھوٹے چھوٹے زخموں پر کھرنڈ سا جمتا رہتا ہے اور یہ درد کرتے ہی رہتے ہیں۔ بے اطمینانی کی زد میں آنے والا آدمی بار بار تو جھجھک کر کے کسی بات کو، کسی عمل کو، کسی اقدام کو، کسی اتحاد کو، کسی نعرے کو، کسی کارروائی کو، کسی شخصیت کے رُخِ کردار کو آنکھیں بند کر کے بھی صحیح قرار دیتا ہے، تو جھجھک بھی پیدا کرتا ہے۔ لیپاپوتی کے طریقے بھی اختیار کرتا ہے، اپنے آپ کو فریب بھی دیتا ہے — اور بظاہر وہ پیش آمدہ آزمائش سے بچ نکلتا ہے جو ایک بار تو اُس کے دل ودماغ کو ہلا ڈالتی ہے، لیکن خود فریبی مسائل کا حل نہیں۔

آخر ذرا آپ اپنے اندر کا جائزہ لیجیے۔ عشاء کے بعد سونے سے پہلے جائے نماز پر بیٹھ کر کچھ خدا سے رابطہ کیجیے اور پھر اس سوال پر غور کیجیے کہ آپ کو تحریکی معاملات میں ہر پہلو سے پورا پورا اطمینان ہے؟ اگر نہیں ہے تو کس عقیدے، جذبے یا شعور کی تجدید کی ضرورت ہے؟

بڑے نصب العین کے بڑے تقاضے

بڑے بڑے اجتماعی نصب العین (خصوصاً اسلامی) لے کر چلنے والوں کی زندگیاں اور

ان کا پیدا کردہ ذہنی یا سماجی ماحول دوسروں سے زیادہ روشن ہونے چاہییں۔ عمومی فضا محبت و ایثار کی ہونی چاہیے۔ ہر کوئی دوسروں کی قدر کرنے والا اوران کی ہر تکلیف کومحسوس کرنے والا ہو اور وہ اہتمام کرے کہ اگر وہ کوئی خدمت نہ کر سکے گا تو کسی دوسرے کوکسی طرح کی اذیت بھی اپنی جانب سے نہ پہنچنے دے گا۔

پھر برادرانہ جذبے سے دل اتنے کھلے ہونے چاہییں کہ اگر کسی شخص کے طرزِ عمل پر کوئی دوسرا اعتراض اٹھائے یا کسی مجلس میں تنقید کرے تو وہ دل میں انتقامی جذبے کی گرہ ڈال کر نہ بیٹھ جائے کہ آئندہ جب کبھی موقع ملے گا، وہ بھی نہلے کا جواب دہلے سے دے گا۔

اس سے بھی زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ ہمارے کارکن جن میں بہت سے اچھی طرح ماہر تکلم نہیں ہوتے، زورِ استدلال سے کام نہیں لے سکتے، ان میں سے کئی دیہاتی ہوتے ہیں جو ضرورت سے کہیں زیادہ اپنے سے بڑوں کا احترام کرتے ہوئے ان کے سامنے کسی اختلافی نکتے پر زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرتے، ہمارا فرض ہے کہ ان سب کو گلے لگائیں اوران کے غیر ادبی اور سادہ اور کھرّے اندازِ بیان پر انھیں ڈانٹنے کے بجائے ان کے نفسِ مدعا کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ان سے خود سوال کر کر کے پوری بات معلوم کریں۔ وہ بے چارے تو اپنے اُس درد کو بیان کرنے کے لیے الفاظ اور انداز نہیں پاتے جو اس کانٹے کی وجہ سے ہے جو ان کے ضمیر میں خلش کر رہا ہے۔ آپ پہلے انھیں دردمند اور دُکھی تو سمجھئے، پھر اُن کی بات سمجھنا آسان ہو جائے گا — سوالات، اعتراضات اور تنقید چونکہ اسلامی نظام جماعت کی صحت مندی کا لازمہ ہیں، اس لیے ان کے راستے کھلے رہنے چاہییں جب کبھی ان راستوں کو بند کیا جائے گا یا ان کے دروازوں میں بھاری کواڑ لگا کر ان کو مقفل کر دیا جائے گا تو نظم کی صحت برقرار نہ رہ سکے گی۔ سوالوں اور اعتراضات کا آرام سے جواب دیجیے۔ اچھے دلائل سے جواب دیجیے۔ مخاطب کا محض منہ بند کرنے والا جواب نہ دیجیے۔ جواب اطمینان دلانے والا ہو۔ اُس کے اطمینان میں جو خلل آیا ہے، اُسے دُور کیجیے۔

قائدین اور کارکنوں میں مساوات

تحریکی شعور کی اِس لحاظ سے بھی بار بار تجدید کرنی چاہیے کہ اسلامی تحریک کے اصولوں

کا اطلاق بڑوں اور چھوٹوں پر یکساں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی عام کارکن غلطی کرے یا رکن لغزش کھائے تو جس درجہ کی گرفت اس کے لیے ہے، اُسی درجہ کی گرفت ویسی غلطی پر عہدہ داروں اور قائدین کی بھی ہونی چاہیے۔ چھوٹوں پر گرفت کرنا اور بڑوں سے چشم پوشی کرنا ایسا خطرناک طریقہ ہے جس کے لیے رسول اللہؐ نے سخت وعید سنائی ہے۔

مثلاً جماعت کے کسی معاملے میں مقررہ پالیسی کے ہوتے ہوئے اگر ایک معمولی رکن کو حق نہیں کہ اس سے انحراف کرے یا مقررہ پالیسی میں سے ایک اور شاخ نکال لے تو اُس کے کسی عہدہ دار اور لیڈر کو بھی اس کا حق نہیں۔ جماعت کے کارفرما اداروں اور اشخاص نے کسی شخص یا گروہ کو اسلام، جمہوریت اور امن کا دشمن قرار دیا ہو تو کسی چھوٹے یا بڑے کو یہ جرأت نہیں کرنی چاہیے کہ وہ ایسے گروہ کو اسلام یا جمہوریت کا خادم قرار دے۔ یہ ڈھیل اگر جماعت کے تمام افراد کو دے دی جائے کہ وہ جو اختلافی راہیں چاہیں اختیار کریں اور انھیں جس دائرے میں چاہیں بیان کریں تو ہماری پالیسی مینارِ بابل کا تماشا پیش کرے گی۔ ایسی گنجائش رکھنے سے ایک اصولی و مسلکی جماعت کا تو پورا ڈھانچہ ٹوٹ جائے گا۔

اسی طرح ہماری محکم روایات کا معاملہ ہے، جو شروع سے قائم ہیں اور جن کے بارے میں قراردادیں اور فیصلے اور بیانات موجود ہیں۔ کن طریقوں کو اختیار کرنا ہے، کن کو نہیں، کن عناصر سے اتحاد ہوسکتا ہے، کن سے نہیں، کیا نعرے لگائے جاسکتے ہیں، کیا نہیں، مظاہروں میں کیا حرکتیں کی جاسکتی ہیں اور کیا نہیں، روایات کا ایک معلوم و معروف خاکہ موجود ہے جسے ہمارے مخالف بھی جانتے ہیں۔ اُسے توڑیں تو ہمارے اصول ٹوٹ جاتے ہیں، یعنی یہ خاکہ اُصولوں ہی کے عملی انطباق سے نمودار ہوا ہے اور اسے بار بار توڑنا اور بدلنا ہمارے جماعتی و تحریکی تشخص کے لیے ضرر رساں ہے۔

فسادِ تضاد

دنیا کی سب سے بڑی بلا تضاد ہے۔ یہ فرد کے خیالات اور طرزِ عمل میں ہو، تعلیم میں ہو، نظامِ جسمانی میں ہو، ہر جگہ وہ باعثِ فساد ہے۔ خصوصاً تنظیمی ہیئتوں کے لیے وہ مہلک ہے ہلکے ہلکے اور دھیمے دھیمے تضاد اس طرح عمل کرتے ہیں جیسے سلو پوائزن۔ اولاً خرابیاں آہستہ آہستہ

سطح سے نیچے ہی پھیلتی جاتی ہیں۔ پھر جب اپنے نتائج کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں تو اُن پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ عقیدہ اور عمل میں، دعوت اور کردار میں، ذکر وعبادت اور سیاست و معیشت میں، جہاں بھی کہیں تضاد کا روگ ہوگا وہ اپنے کرشمے دکھائے گا۔ اور درحقیقت یہ تضادات ہی ہوتے ہیں کہ ماضی اور حال میں، اعلانات اور کارروائیوں میں، بڑوں اور چھوٹوں کے رویوں میں، ظاہر اور باطن میں، جماعتی پالیسیوں کی تعبیرات میں پہلے دھیمے دھیمے طریق سے کام کرتے ہیں۔ اور پھر زور شور سے۔ اگر پہلے مرحلے میں ان کی روک تھام نہ ہوسکے تو پھر اس تباہ کن طوفان کو کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھنے والے رنج وغم سے دیکھتے ہیں، مگر خون کے آنسوؤں سے بھی اس کو روک نہیں سکتے۔

میرے پیارے ساتھیو! عزیز بھائیو! محترم بزرگو! خدا کے لیے نگاہ رکھو کہ کسی پہلو سے تضادات نہ اُبھرنے پائیں۔ تضادات کا شجرۃ الزقوم ایک دفعہ جڑ پکڑ گیا تو آپ کوئی کام نہ کرسکیں گے۔

لیپا پوتی علاج نہیں

اُوپر جن باتوں کا ذکر ہوا ہے ان کے بارے میں یہ بھی جان لیجیے کہ خرابیوں کا حقیقی اور مؤثر حل لیپا پوتی سے نہیں ہوا کرتا۔ زخم کا یہ کوئی علاج نہیں ہے کہ آپ نے اس پر نہایت رنگین ریشمی پٹیاں لپیٹ دیں اور بیان دے دیا کہ یہاں کوئی زخم نہیں۔ گندگی کا ازالہ یوں نہیں ہوسکتا کہ جہاں جہاں وہ سامنے آئے یا کوئی دوسرا متوجہ کرے، آپ وہاں وہاں اخبار کا کاغذ اس پر پھیلا کر کونوں پر پتھر رکھ دیں۔ معاملات کو ہمیشہ صاف طور سے لینا چاہیے۔ آپ کے اسلامی طریقے سے جب کوئی انحراف ہو تو صاف صاف کہیے کہ انحراف ہوا ہے اور کوئی دوسرا توجہ دلائے تو اس کی بات کو مانیے کہ تم نے ٹھیک توجہ دلائی۔ جس کسی نے قدمِ انحراف اٹھایا ہو اُسے بالمشافہ کہیے کہ صاحب! آپ نے یہ غلطی کی ہے اور ایسی غلطی کی گنجائش ہمارے اصولوں اور روایات میں نہیں ہے۔ پھر اِن صاحب کے تعاون سے کسی قطعی اور حتمی فیصلے تک پہنچیے اور اُس کو ڈیکلیئر کیجیے۔ بے شمار ایسے اختلافی یا نزاعی معاملات پیدا ہو کر پھیلتے رہیں گے، اگر ہم نے ایمانی واخلاقی جرأت کے ساتھ روک تھام نہ کی۔

ہم دینِ حق کے علم بردار شہادتِ حق کے ذمے دار ہیں۔ ہمیں حق کہنا چاہیے دوسروں کے متعلق بھی، اپنے متعلق بھی، کبھی آدھا حق کہہ کر، دوسرا آدھا حق چھپا نہ رکھنا چاہیے اور واقعہ کے کسی حصے کو لپیٹنا نہیں چاہیے، بلکہ جرأت سے پورا حق کہنا چاہیے، خواہ اُس کی زَد ہم پر پڑتی ہو۔

دین وسیاست میں تضاد خطرناک ہے

تاریخ میں ایک بڑا تضاد دین وسیاست کا لوگوں نے پیدا کر دیا تھا اور صدیوں کے عمل سے ذہن اس کے اتنے عادی ہو گئے کہ اسلامی سیاست کی راہ پر راست رَوی خود ہمارے لیے سخت مشکل مسئلہ بن رہی ہے۔ تجربات بڑے تلخ ہیں۔ کبھی دین داری اور اخلاق کی طرف جھکاؤ ہوتا ہے تو سیاست کی راہیں اتنی تنگ کر دی جاتی ہیں کہ آدمی کے داخلے اور پیش قدمی کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ پھر جب ردعمل سیاسی ذمے داری کی طرف مائل کرتا ہے تو دینی واخلاقی رنگ اس طرح اُڑ جاتا ہے کہ ہماری سیاست گری میں لادینیت پسند جماعتوں کے بالمقابل کوئی امتیازی پہلو باقی نہیں رہتا۔

میرا خیال یہ ہے کہ اسلامی سیاست کا کامیاب ترین دور وہی تھا جس کی زمامِ کار مولانا مودودیؒ کے ہاتھ میں تھی۔ پھر مارشل لاء کے آنے سے سب کچھ تلپٹ ہوا اور نظم کے علاوہ ذہنی وحدت اور اطمینان کی چولیں ایسی ڈھیلی ہوئیں کہ کسی طرح چول سے چول مل ہی نہیں پا رہی ہے۔

کسی تفصیل میں جائے بغیر تمام شرکائے تحریک سے عرض ہے کہ سیاست کو دینی سیاست کی صورت دیجیے، اس میں دین اُبھرا ہوا معلوم ہو، آپ دینی مقصد کی طرف بڑھیں۔ اور کسی دینی نکتے ہی پر اتحاد کریں اور اتحاد ان سے ہی کریں جن سے متعلق جماعت عام طور پر جانتی ہو کہ وہ مخالفِ دین یا فسطائیت پسند یا فاسد نظریات وکردار رکھنے والے لوگ نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم جائے نماز سے لے کر اسمبلی تک تمام معاملات میں اصولِ دین اور اخلاقی قدروں اور جماعتی روایات کی پابندی کریں۔

ہر قسم کے سیاسی جوڑ توڑ اور مہرہ بازیوں کا نام اسلامی سیاست نہیں ہے۔

محبتِ خدا اور خوفِ خدا

ہمارے کام کی ساری اساس خدا پرستی پر ہے۔ کوئی بھی دائرہ، کوئی بھی سرگرمی اور کوئی بھی مرحلہ ہو، اگر خدا سے محبت اور خدا کا خوف کارفرما نہ ہو تو پھر سارے کام نمائشی اور ریائی ہو جاتے ہیں اور نشۂ خود پسندی طاری ہو جاتا ہے۔

کسی معاملے پر غور کرتے ہوئے، مشورہ و بحث کرتے ہوئے، اعتراضات سنتے اور

ان کے جواب دیتے ہوئے، پھر کسی فیصل شدہ صورت پر عمل کرتے ہوئے قدم بہ قدم اور نفس بہ نفس خدا کی محبت کی مشعل بلند رکھنی چاہیے، خدا کے خوف سے لرزنا چاہیے اور خدا کے ذکر سے قوت حاصل کرنی چاہیے۔

ہم لوگ اگر مسجد کی عبادات کے دائرے سے باہر سیاست کے دائرے میں زبان سے دعوے کرتے ہوئے، جوشِ تقریر دکھاتے ہوئے، نعرے بلند کرتے ہوئے، مظاہرے کرتے ہوئے، کسی کی حمایت اور کسی کی مخالفت کرتے ہوئے، کسی سے قُرب بڑھانے اور کسی سے دُوری پیدا کرتے ہوئے، قرآن وحدیث کے تحت جماعت کی رہنمائی کے مقررہ خطوط سے انحراف کر کے لغزش کھاتے ہیں اور اس لغزش کی وجہ سے عوام میں شکایات و اعتراضات یا دبے دبے اضطرابات پیدا کر دیتے ہیں تو یہ محض سیاسی غلطیاں ہی نہ ہوں گی، ایک خداپرست گروہ کے معیارات کے لحاظ سے گناہ کی تعریف میں بھی داخل ہوں گی۔ امیرِ جماعت، نظم جماعت یا جماعت کی پالیسیوں سے انحراف یا بے جا قسم کا اختلاف، یا غلط مقام پر اظہارِ اختلاف اور غلط لہجے میں اظہارِ اختلاف اور پھر بزبانِ عمل اعلان اختلاف اپنوں کے علاوہ مخالفین پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اور ان عوام کے ذہنوں میں بھی غبار بھرتا ہے جو ہماری دعوت کے مخاطب ہیں۔ بنا بریں ایسی چیزیں خدا سے محبت اور خدا کے خوف کے حلقوں سے سر باہر نکالے بغیر عمل میں نہیں آسکتیں اور کسی دینی جماعت کے لیے یہ بڑا حادثہ ہے کہ خدا کی محبت اور خدا کے خوف سے آزاد ہو کر بھی کام کیے جانے لگیں۔

ان سطور کا تعلق کسی خاص فرد یا گروہ سے نہیں، بالکل بعض اُصولی اور عمومی امکانات کو سامنے رکھ کر واضح کیا گیا کہ ہمارے راستے میں کہاں کہاں گڑھے آتے ہیں۔ اور کہاں کہاں کانٹے ہیں، جن سے بچ کے نکلنا چاہیے۔

خدا سے ملاقات

ساتھیو! براہِ کرم تنہائی میں خدا سے ملاقات کرو۔ اور جو غلطیاں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی عمل میں آئی ہوں، اُن کا اعتراف خدا کے سامنے کرو اور ان کی معافی اور ان سے نجات پانے کے لیے دردمندی سے دعائیں کرو۔ اللہ تعالیٰ یقیناً سنے گا اور آپ کو بھی اور آپ کے ساتھیوں اور

اکابر کو بھی اور آپ کی جماعت و تحریک کو بھی حفظ و امان میں رکھے گا۔

یہ بھی اچھی طرح جان لیجیے کہ سچی اور کھری دعوتِ دین کے پھیلاؤ اور اس کی کامیابی کا دارومدار بھی جس چیز پر ہے وہ دعوت دینے والوں کا انفرادی اور اجتماعی طرزِ عمل ہے اور اس طرزِ عمل کا خدا کی رضا کے مطابق ہونا ہے۔

تحریک ایک امانت ہے

اور آخری بات یہ ذہن میں رکھیے کہ خداخوفی کا بھاری تقاضا یہ ہے کہ ہزارہا افراد کی محنتوں اور قربانیوں کے ماحصل کے طور پر جو تحریک اور جماعت ہمیں امانت کے طور پر ملی ہے، اُسے بعد والوں تک صحیح سلامت پہنچانا ضروری ہے۔ اگر اس کا چہرہ مسخ ہوجائے، اس میں انحرافات پیدا ہوجائیں، اس میں رخنے پڑ جائیں اور اس کے اُصولوں، ضابطوں، روایتوں اور اخلاقیات کے ڈھانچہ ہمارے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ جائے تو ایسی عظیم امانت کو ناقص حالت میں بعد والوں تک پہنچانا بھاری جرم ہے۔

جماعتِ اسلامی ایک واضح معین نظریے (یا تصورِ اسلام) کو لے کر اُٹھی ہے، اس کے سامنے نظامِ حیات کا ایک مکمل نقشہ ہے، اس نے ایک طریقِ کار اصولی خطوط پر متعین کیا ہے، اس نے ایک اخلاقی شعور دیا ہے، اس کے معمولات میں ایک تسلسل ہے، اس کی ٹھوس روایات ہیں اور روشن قدریں، وہ بعض کام کرسکتی ہے، بعض قسم کے کام نہیں کرسکتی، وہ کچھ تدبیروں اور رابطوں کو پسند کرتی ہے اور کچھ کو ناپسند۔ اس طرح جماعت کا ایک واضح تشخص ۴۰ سالوں سے زائد عرصے میں بنا ہے اور اس تشخص کا ایک چہرہ ہے جس سے اُسے پہچانا جاتا ہے۔ کل اگر کوئی شخص کچھ لوگوں کو ساتھ ملا کر اس تشخص کو آہستہ آہستہ بدلنا شروع کردے اور اس چہرے کے نقوش کو بگاڑنے لگے تو وہ خدا اور ملت اور مولانا مودودیؒ اور موسّسین جماعت کی امانت میں خیانت کا مرتکب ہوگا۔ جب کبھی ایسا تصرف جماعتی اور تحریکی ساخت میں کیا جانے لگے تو پہلے ہی مرحلے میں زیادتی کرنے والے ہاتھ کو پکڑ لینا چاہیے اور جماعت کو یہ محسوس کرانا چاہیے کہ اُس کا ہر رکن اور کارکن اس کا محافظ اور پہرے دار بھی ہے، جو نہ صرف بیرونی حملوں کو روکنے پر مامور ہے، بلکہ اگر اندر سے کوئی رخنہ اندازی ہوگی تو اس کی بھی سرکوبی

کرنے کے لیے چاق و چوبند ہے۔[۱]

اللہ ہم سب کو اپنی نازک ذمے داریوں کا گہرا احساس دے اور ان کو پورا کرنے کے لیے عزم اور قوتِ عمل عطا کرے اور ہر قسم کی مداہنت سے بچائے۔

قبل اس کے کہ خدا کے سامنے پہنچ کر ہمارا کھاتہ، ہمارے سامنے رکھا ہو اور ہم ایک ایک لفظ اور نعرے اور ایک ایک قدم اور ایک ایک ملاقات اور پالیسی کے ایک ایک موڑ کا حساب دے رہے ہوں آج ہی نہایت احتیاط کا رویہ اختیار کرنا چاہیے اور خود احتسابی کے ساتھ اجتماعی دائرے میں افہام و تفہیم اور تنقید و بحث کی راہیں کھولنی چاہئیں۔

---

[۱] جب کبھی جماعت کے بنیادی اصول و تصوّرات، اس کے شعورِ دین اور طریقِ کار، اس کے معیارِ قیادت، اس کے مخصوص نظامِ مشاورت، اس کے احترامِ دستور، اس کے دینی سیاست کے فلسفے، اس کے اخلاقی پیمانوں، اُس کے رابطہ ہائے قرب و بعد کے صحیح داعیات کو مسخ کرنے کا عمل شروع ہو اور بداہتہً اسے بیانات و واقعات کے آئینے میں دیکھا جانے لگے تو پھر نہ صرف ایسے تمام احکام اور فیصلوں کو خارج از دائرہ معروف قرار دینا پڑے گا، بلکہ وقت کی قیادت اور انتظامی اکابر کا اعتماد بھی مجروح ہو جائے گا۔ ایسی صورتِ حال پیش آنے پر تا بحدِّ آخر جماعت کے اندرونی اسٹیجوں اور حلقوں میں معاملات کو حل کیا جانا چاہیے۔ اگر اندرونی مساعی یکسر ناکام ہو جائیں تو پھر دوسری صورتیں سوچی جا سکتی ہیں۔

دعوتِ حق کی بھاری ذمے داریاں

[یہ تقریر ۱۹۸۶ء کی آخری سہ ماہی میں شرکائے تربیت گاہ کے سامنے کی گئی]

آپ خوب سمجھتے ہیں کہ آپ کا مرکزی اور بنیادی فریضہ دعوتِ حق ہے، جس کے متعلق قرآن کریم میں آیا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ (آل عمران: ۱۱۰)

"تم بہترین امت ہو جسے انسانوں میں (اس مقصد سے) اُٹھایا گیا ہے کہ تم معروف (یعنی نیکی) کا حکم دیتے ہو اور منکر (یعنی برائی) سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

یعنی خیر امت اور امت وَسط اور مرکزی گروہ ہونے کا اعزاز صرف اس امر پر منحصر ہے کہ آپ لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔ یعنی نیکی کو دوسروں تک پھیلائیں اور اسے غالب کرنے کی سعی کریں۔ اور برائی سے لوگوں کو بچنے کی اور اس کے اثر و تسلط کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ یہ دعوت بیج ہے پورے نظامِ اسلامی کا۔ اور یہ دعوت دورِ کش مکش سے بھی گزارتی ہے، ہجرت کی وادیاں بھی طے کراتی ہے، جنگ کے میدان میں بھی لے جاتی ہے تاکہ نیکی اور سچائی کے غلبے کی مزاحمت کرنے والی فاسد قوتوں کو تلوار کے زور سے راستے سے ہٹا دیا جائے۔ گویا دعوت خود بھی ایک طرح کا جہاد ہے اور آگے یہ جہاد کے مختلف مراحل سے گزار کر کاملِ جہاد یعنی قتال تک پہنچاتی ہے۔

وسیع اور بھاری کام

دعوت حق کی ذمے داری ہلکی اور آسان نہیں ہے۔ ہر قسم اور ہر سطح کے لوگوں تک ان کی زبان اور ان کے مروّج اسالیب کے مطابق اس کو پہنچانا اور ابلاغ کے جو بھی پاکیزہ ذرائع حاصل ہوں ان سے کام لینا — یعنی دعوت بذریعہ صحافت، دعوت بذریعہ ادب، دعوت بذریعہ علوم، دعوت بذریعہ تعلیم، دعوت بذریعہ تصانیف، دعوت بذریعہ وسائل نشرواشاعت، دعوت بذریعہ اجتماعات، دعوت بذریعہ مظاہرات، دعوت بذریعہ امورِ سیاسیہ، دعوت بہ دائرہ انتخابات اور دعوت بہ حلقۂ پارلیمان، غرضیکہ ہر سطح پر اور ہر وسیلے سے بھرپور کام کرنا مطلوبِ دین ہے۔

یہ سرسری ذمے داری نہیں ہے بلکہ اس کے لیے تنبیہ وتاکیدا تنے سخت انداز سے کی گئی ہے کہ یہ نہیں تو گویا کچھ بھی نہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بروایت ترمذی قسم کھا کر فرمایا کہ ''تم کو لازمی طور پر معروف کا حکم دینا ہوگا۔ اور لازمی طور پر منکر سے روکنا ہوگا، ورنہ ایسا ہونے کا شدید اندیشہ ہے کہ اللہ تم پر سخت مصیبت نازل کرے، پھر تم اُسے پکارو اور تمھاری پکار نہ سُنی جائے۔''

اقامتِ دین میں دیر کیوں

کچھ لوگ اقامتِ دین میں دیر لگتے دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں، ان کو جاننا چاہیے کہ حصولِ مقصد کا دارومدار اس کے مقرر کردہ طریقۂ سعی دعوت پر ہے۔ اگر آپ دعوت کو پھیلا کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو، جلد سے جلد متاثر کرلیں تو غلبۂ دین بھی جلد ہوگا۔ اگر آپ کی رفتارِ دعوت سست ہوگی تو غلبۂ دین میں بھی دیر لگے گی۔ انتخابات میں بھی کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے تو دعوت کے متاثرین کی کثرت سے نکل سکتا ہے اور انقلاب بھی واقع ہوسکتا ہے تو عوامی قوت کی جمع ہونے سے واقع ہوسکتا ہے۔ ہم لوگ انتخابی اور پارلیمانی سرگرمیوں کو زندگی کے مختلف دائروں کی طرح اثر اندازی اور توسیعِ دعوت کا میدان سمجھتے ہیں۔ نقطۂ نظر ہمارا ابھی یہی ہے کہ آخری عمل انقلابی ہوگا۔ بلکہ دعوت، اس کا پورا عمل اور اس کے جملہ مراحل سب کے سب انقلابی نوعیت کے ہیں۔

دعوتِ حق کا نقطۂ آغاز

یہ بات بھی ہمارے ذہنوں میں تازہ رہنی چاہیے کہ دعوتِ حق کا سب سے پہلا مخاطب

داعی خود ہوتا ہے۔ اگر کوئی دعوت داعی کے اندر اُتر کر اس کے تمام اقوال وافعال، لین دین، رشتوں اور دوستیوں، دل چسپیوں اور عادتوں پر اثر انداز نہ ہو تو پھر وہ محض ایک ریاکارانہ وعظ ہے، جس کا کبھی گہرا اثر نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ آدمی کے لیے اوّلین دائرۂ کار اس کا گھر ہے۔ گھر کے لوگوں تک دعوت کو پہنچانا، ان کو معروف کے لیے تاکید کرنا اور منکر سے روکنا بروئے قرآن کریم بھی ضروری ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا اسوہ بھی یہی ہے۔ داعی اگر اپنے گھر ہی میں وزن نہ پا سکے تو باہر زیادہ مشکل ہوگی۔ بعدازاں بہت سے دوسرے وسیع تر دائرے آتے ہیں۔

دعوتِ حق کی مؤثر ترین صورت

دعوت کے بہت سے طریقوں میں سب سے اہم چیز انسانی رابطہ ہے۔ خادمانِ دین اگر لوگوں سے ملاقاتیں کریں، انھیں اپنے ہاں بلائیں، گھنٹہ دو گھنٹے تک بات کریں۔ ذاتی مسئلوں سے عالمی مسئلوں تک مل کر غور کریں۔ اور کسی مناسب مرحلے پر دعوت کا موثر راستہ بنائیں تو یہ بہترین صورت ہے۔ محض چلتے چلتے بات کر دینا یا کوئی پمفلٹ پھینک جانا یا محض جلسوں میں اپنے اسٹیج سے حسبِ دل خواہ باتیں سنا لینا اتنا زیادہ کارگر نہیں ہے۔ کچھ لوگ تجربے کے طور پر دو دو چار افراد کے وفد بنا کر ہفتے میں ایک دو بار آس پاس کے دیہات یا آبادیوں میں نکلیں، کبھی دیہی بستیوں کے درمیان یک روزہ، دو روزہ یا سہ روزہ کیمپ لگا کر چاروں طرف پارٹیاں روانہ کریں۔ ان تجربوں سے آپ کو نئے راستے ملیں گے اور نیا اعتماد حاصل ہوگا۔

احتیاط! صد احتیاط!

ایک پرانے خادم کی حیثیت سے میں اپنے نوجوان دوستوں کو یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ بیت المال، چاہے وہ دو چار، دس روپے تک ہی محدود ہو، کسی گاؤں یا تحصیل یا ضلع کا ہو یا صوبہ کا یا مرکز کا، یا خدائی اور خدمتی کاموں کے لیے کوئی امانتی فنڈ آپ کی تحویل میں ہو تو اس کے بارے میں حد درجہ محتاط رہیں۔ کیونکہ اس کی نزاکت مالِ یتیم کی سی ہے۔ اس میں سے خرچ کریں تو بے جا طور پر اور غیر ضروری طور پر ایک پیسہ بھی زائد خرچ نہ ہونے دیں۔ اپنے مفاد کے لیے اس میں سے اپنے حق سے زیادہ نہ نچوڑیں۔ ایسی تنخواہیں اور ایسے مصارف نہ لیں جو اسلامی قواعد کے لحاظ سے حدِّ جواز سے زیادہ ہوں — بیت المال کے معاوضوں کے بل پر اپنے عزیزوں کو فائدے نہ

دیں۔ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو بھرتی نہ کریں، خود فیصلہ کرنے کے بجائے کسی انصاف پسند اور بے لحاظ بورڈ کو تقرریوں اور برطرفیوں پر مقرر کریں۔ بالمعاوضہ خدمات کے لیے یا ہمہ وقتی تنخواہ دار عملہ کو کھلے دل سے توسیع نہ دیجیے اور خواہ مخواہ بعض بڑے افراد کی استمالت کے لیے آرائشی قسم کے عہدوں کی تخلیق نہ کیجیے۔ نہ یہی جائز ہے کہ بیت المال کی قوت کو اپنے حامیوں کا جتھا جمع کرنے کے لیے صرف کیا جائے۔

جس مقصد سے کوئی آدمی لینا ہو، اس کے لیے درخواستیں طلب کیجیے اور قابلیت و صلاحیت و تجربہ اور تحریکی شعور و اخلاق جدھر زیادہ ہو اُدھر نگاہِ انتخاب اٹھایئے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے فرزند کو دائرہ استحقاقِ خلافت سے باہر رکھ کو جو درخشاں روایت قائم کی تھی اور جسے بعد میں امیر معاویہؓ نے یزید کو جانشین مقرر کر کے توڑا تھا، اس روایت کو آپ حضرت عمرؓ کی تقلید میں از سرِ نو قائم و مضبوط کیجیے۔ بیت المال کا ایک پیسہ بھی جو ناجائز طور پر خرچ کیا گیا یا اعزّہ پروری کے لیے استعمال کیا گیا وہ خدانخواستہ کسی ذمے دار شخص کو اور اس کے ساتھ ایسے معاملات میں مداہنت اور لحاظ ملاحظہ برتنے والوں کو جہنم کی سیر کرا سکتا ہے۔ اسی ضمن میں بیت المال یا کسی نیک کام کے فنڈ کی ملکیّتی اشیاء کے استعمال کا معاملہ ہے۔ اُدھر کے سامان اور اسٹیشنری کو ذاتی استعمال میں لانا درست نہیں۔ گاڑی یا ٹیلیفون استعمال کرنا پڑے تو اس کا معاوضہ ادا کریں۔ بیت المال کی کوئی چیز اگر ذاتی قبضے میں رکھی گئی ہو تو اس کا ذاتی اور گھریلو استعمال ہرگز نہ کریں۔ اگر بیت المال کے دفتر کا کمرہ آپ کے پاس ہو یا کوئی مکان یا کسی طرح کی فٹنگ تو ساری چیزوں کا استعمال بہترین اسلوب سے کریں۔ اور انھیں ہر نقصان سے بچائیں۔ لاپروائی سے خدائی امانت کا استعمال آخرت کے لیے باعثِ نقصان ہوسکتا ہے۔

خدارا اپنے آپ کو اس خطرے سے بچایئے اور اپنے ساتھیوں کو بھی باز رہنے میں مدد دیجیے، بلکہ اس گئے گزرے دور میں قرونِ اولیٰ کی شاندار روایات کے چراغوں کو پھر روشن کیجیے۔

رواجی معیارِ زندگی کا دباؤ

مالی معاملات میں ہمارے نقطۂ نظر پر بہت سا اثر ہمارے ماحول کا ہے۔ اس کے چوطرفہ دباؤ کا مقابلہ کرتے کرتے ہم بار بار جب تھک ہار جاتے ہیں اس صورت میں دنیا اور دولت

اور معیارِ زندگی کی کوشش ہمیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ہر آدمی کو کوٹھی چاہیے، کار چاہیے، قالین چاہئیں، صوفے چاہئیں کراکری چاہیے، شاندار لباس چاہیے، جدید آسائشیں چاہئیں، شان دار تقریبات چاہئیں - اور جماعت کے اندر کا ہر آدمی بھی ہزار پرہیز کے باوجود دوہرا دوہرا وقت صرف کر کے اور خاندان کے کئی افراد کی محنتیں جمع کر کے دِن رات اپنے منصوبے کو پورا کرنے میں لگا رہتا ہے، ورنہ بچوں کی تعلیم مشکل ہے، ان کے رشتے لینا دینا مشکل ہے۔ نتیجہ یہ کہ اوّل تو ذہنی مصروفیت تحریک سے زیادہ دوسری جانب ہے اور دوسرے یہ کہ آمدنیوں اور مصارف میں زیادہ سے زیادہ کے لیے جواز تلاش کرنے کا رجحان کام کرتا ہے۔ اور تو اور بعض لوگ تنافس یا مسابقتِ تکاثر [۱] کی فضا پیدا کرنے کا باعث اس طرح بنتے ہیں کہ ایک نیا اشقلہ اٹھا دیتے ہیں۔ بچوں کے کھیل کے نام سے قیمتی چیزیں لا کے محلے کے دوسرے بچوں کو بھی مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے والدین پر دباؤ ڈالیں۔ بجائے اس کے کہ ہمارے بچے خاندان اور محلے بھر میں خدمت کے کاموں اور عمارتوں، کیاریوں، پھولوں، نالیوں، پانی اور بجلی کے تحفظ کی صفات لے کے اُٹھتے، گلی، محلے، سڑک، اسٹاپ، اسپتال یا کسی اور مقام پر خدمات کے لیے ڈیوٹیاں انجام دیتے، اُلٹا یوں لگتا ہے کہ وہ ایسے بچے ہیں جنھیں نہ والدین، نہ مکتب، نہ قریبی ماحول، معاشرے کے مقابلے میں کوئی برتر اطوار نہیں دے سکا۔

ایک ادیب کے سبق آموز خیالات

ہمیں تو قرآن کریم نے بھی فریبِ دُنیا سے بچنے اور دولت پرستی سے پرہیز کی بہ تاکید تعلیم دی ہے اور حضور نبی اکرمؐ نے بھی سخت انتباہ دیے۔ قرآن و حدیث کے احکام آپ پڑھتے سنتے ہیں۔ میں یہاں ایک ادیب کے خیالات بیان کرتا ہوں جو تحریکِ اسلامی کا سپاہی نہ تھا اور نہ دعوتِ حق کا علم بردار، مگر بس ادب کے ذریعے سچائیاں سامنے لانے کا مشن رکھتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا پرستی اور سچا ادب ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ میں مرحوم سے دوستی کے باوجود کئی پہلوؤں سے اس سے اختلاف رکھتا ہوں، مگر بعض باتوں کا قدر دان ہوں، جن میں سے ایک یہ ہے۔ ذرا سنیے:

”آپ اپنے نفس میں خدا کو حاضر جان کر یا اپنے ضمیر کو گواہ بنا کر یہ فیصلہ کر لیں کہ آپ

---

[۱] مراد ہے دولت بڑھانے کی دوڑ میں باہمی مقابلہ۔

ادیب رہنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر ادیب رہنا چاہتے ہیں تو پھر اپنے زمانے کی سچائیوں کو بے نقاب کریں۔ اور اپنے نفس اور معاشرے کے بدلے میں سچائی سے کام لیں، خواہ اس کی کوئی بھی قیمت دینی پڑے۔ ادب کی تخلیق لفظوں کی تجارت نہیں ہوتی ــــ تخلیق ایک طرزِ زندگی ہے۔ یہ ادیبوں، درویشوں، صوفیوں، انقلابیوں اور پاگلوں کا کام ہے۔ اس میں زر پرست، سماجی ریاکار، منافق، ہاتھی دانت رکھنے والے معلم شامل نہیں ہو سکتے۔''

''ادیب کے لیے ایک مخصوص معنوں میں تارک الدنیا ہونا لازمی ہے ــــ آپ ادیب بننے کی تمنا اور کوٹھی اور کار کی تمنا اور بینک بیلنس کی تمنا اور سب سے خوش گوار تعلقات رکھنے کی تمنا کو ایک سینے میں جمع نہیں کر سکتے۔''

''سوال یہ ہے کہ تم معاشرے کو اپنی شرائط پر قبول کرنا چاہتے ہو، یا معاشرے کو اس کی شرائط پر ماننے کے لیے تیار ہو، معاشرہ تمھیں سب کچھ دینے کے لیے تیار ہے اور دے سکتا ہے، مگر اس کے لیے تمھیں اس کے شرط نامے پر دستخط کرنے ہوں گے۔''

''ادب کو میں نے کبھی لکھنا لکھانا نہیں سمجھا، ادب ایک طرزِ حیات ہے اور اپنی تکمیل کے لیے صوفیوں جیسی ریاضتوں اور مجاہدوں کا طالب ہے۔ زندگی میں کامیابی کا راستہ، ادب کا راستہ نہیں ہے۔ یہ دو مختلف منزلیں ہیں اور دونوں کے راستے، جدا جدا ہیں اور دونوں کے درمیان میں انتخاب کا مسئلہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے ادب کو طرزِ حیات بنانے کے بجائے کاروبار بنایا اور اس میں کامیاب ہوئے۔ تم بھی ایسے ادیب بننا چاہو تو'' .... ''جیسے لوگوں کی پیروی کرو۔''

''میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آڈن کے الفاظ میں ادیب کو کوئی ایسا چھوٹا موٹا پیشہ اختیار کرنا چاہیے، جو اس کا زیادہ وقت نہ لے اور جس کے ذریعے وہ معاشرے میں عزت کی ایک متوسط زندگی گزار سکے۔ اسے نہ اتنا آرام ہو کہ سو جائے اور نہ اتنی تکلیف کہ سوچنا بھی مشکل ہو جائے۔''

اِن اقتباسات میں لکھنے اور ادب اور تخلیق کے الفاظ نکال کر تحریک اسلامی اور دعوتِ اسلامی کے الفاظ رکھ دیجیے اور پھر اس معیار پر سوچیے کہ سچّی روح خدا پرستی کے ساتھ آخرت کے

لیے کام کرنے والوں اور ہم لوگوں میں دولت اور دنیا کے بارے میں ویسا احساسِ تقویٰ موجود ہے جیسا کہ ایک ادیب نے ادب کے حوالے سے تصوّر دلایا ہے؟ ہم لوگ ہر اُس چیز اور لذّت کو حاصل کرنے کے درپے ہیں اور ہر اُس رسم کو پورا کرنے میں لگے ہیں جو معاشرے میں رائج ہے۔ خون پسینہ ایک کر کے اور تحریک کا نقصان کر کے ہم ''دنیا'' کا وہ پورا معیار حاصل نہیں کر سکتے، لہٰذا کچھ ناقابلِ عمل حسرتیں بھی ہمارے ذہنوں میں کنکھجوروں کی طرح اپنے ہزار پا گاڑے ہوئے ہیں۔ سادہ زندگی کی کوئی لکیر ہم اپنے لیے نہ کھینچ سکے کہ یہاں تک جا کر لازماً رُک جانا ہے۔ کچھ چیزوں اور رواجوں کے متعلق اپنے اوپر یہ پابندی لگانا کہ ان کو ہمارے گھروں میں داخلہ نہیں مل سکتا۔ حتیٰ کہ مغرب کی ملحدانہ اور مادّہ پرستانہ تہذیب جس سے ہماری اصل لڑائی ہے، اس کے شئون اور اطوار بھی تدریجاً قبول کر رہے ہیں۔ ہمارے لوگوں کو دیکھ کر یہ کسی کو محسوس نہیں ہوتا کہ خدا کے یہ بندے کچھ ایسے بندے ہیں جنھوں نے ایک مقصدِ عظیم کے لیے اپنے آپ کو ایک صاف ستھری مگر درویشانہ زندگی میں محدود کر لیا ہے۔ '' لَاتُحِبُّوا الدُّنیَا'' کی پکار روز ہماری مسجدوں میں بلند ہوتی ہے، مگر دنیا کی کون سی چیز یا اس کی کون سی مقدار ہے جس کے لیے ہمارے دروازے بند ہوں۔ مسلمان کے پاس زیادہ دولت آتی ہے تو وہ اس کے اخراجات کو بڑھانے کے بجائے اس کے جذبۂ انفاق کو بڑھاتی ہے اور انفاق ہی دولت پرستی اور حُبِّ دنیا کا واحد علاج ہے۔

مجھے دکھ ہے کہ مسجد مسجد ایسے لوگ '' لَاتُحِبُّواالدُّنیَا'' کے نمائشی اور ریاکارانہ وعظ کرتے پھرتے ہیں جو یا تو دنیا طلبی کی مسابقت میں بہت کچھ جیت چکے ہیں اور یا اندر اندر حسرتوں سے کٹے جا رہے ہیں کہ ہائے فلاں فلاں چیزیں ہمارے پاس نہیں ہیں۔

رُفقائے محترم! خدا کے ہاں پوچھ عملی حقیقت کی ہے، نمائش وریاکاری کی نہیں، کھرا سکہ لائیے، ورنہ حسابِ آخرت کی تپش سے ملمع اتر جائے گا۔

جماعتی عہدوں اور ملازمتوں کا معاملہ

اسلام کے لیے صحیح شعور اور پاک صاف ضمیر کے ساتھ کام کرتے تنظیمی عہدوں کے بارے میں خبردار رہیے۔ عہدوں کا حریص ہونا ایک مجرمانہ ذہن کا آئینہ دار ہے اور اس سے ذرا ہی کم درجہ اس رویے کا ہے کہ آدمی کو جونہی کسی عہدے کے لیے بلایا جائے فوراً ادھر لپک جائے۔ گویا

کہ حضرت پہلے سے منتظر بیٹھے تھے۔ اور مزید عہدے ملتے جائیں تو بصد شوق انھیں شرفِ قبولیت دیا جاتا رہے۔

تنظیمی اداروں کے دفتری نظاموں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر شعوری طور پر چند افراد ایک دوسرے کو عہدہ و مناصب اور صدارتوں اور ثالثیوں کے لیے تجویز کرنے لگتے ہیں اور نیچے کے لوگ بھی سمجھ لیتے ہیں کہ فلاں فلاں آدمی کو اہمیت دینی ہے۔ دنیا میں مروّجہ سیاست اور بیوروکریسی کے طور اطوار ایسے ہیں کہ عہدہ و جاہ کی ایک جنگ ہمیشہ جاری رہتی ہے، سازشیں ہوتی ہیں، گٹھ جوڑ ہوتے ہیں، طے کرلیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں کو فلاں فلاں مقام تک لانا ہے اور بعض دوسروں کو ہٹانا ہے، گرانا ہے۔ اس پلید سیاست کی کوئی جگہ اسلام میں نہیں ہے۔

پھر اس بات سے بھی خبردار رہیے کہ عہدے کی ذراسی قوت ہاتھ میں آتے ہی آدمی اسے بے باکی سے استعمال کرنے لگے۔ کسی کو ادھر سے اٹھا کر اُدھر پھینکا، کسی سے کوئی انتقام لے لیا، اور کبھی اپنے قریبی آدمی کے لیے جب چاہا جگہ پیدا کرلی۔ اگر کوئی اعتراض اٹھائے یا تنقید کرے تو اس کا گلا دبا دیا، یا جب کبھی اس کا کوئی مسئلہ سامنے آیا تو پھر سارا حساب لے لیا۔

یہ طریقے دنیا دار لوگوں کے کاروباری اور ملازمانہ معاملات میں چلتے ہیں مگر خدا پرستوں میں نہیں۔

آج وقت ہے کہ ہم بیت المال اور عہدوں کے متعلق ایسے قواعد وضوابط اور ایسی کڑی روایات قائم کردیں کہ بعد کی جس نسل کو ہم کام سونپیں وہ اسے خراب تر کردینے کے بجائے اور زیادہ بہتری اور پاکیزگی اور نیکی کی طرف لے جائے۔

معرکۂ دعوت میں پسپائی

جس طرح میدانِ قتال میں فراراً من الزحف کسی شخص کے لیے پسپائی سخت ترین گناہ ہے اسی طرح دعوتِ حق پیش کرنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سیاسی اور تہذیبی کش مکش میں پسپائی نہایت معیوب اور تحریک کے لیے نقصان دہ ہے۔ جتنا مقام آپ علم، اخلاق، نظم وغیرہ میں حاصل کرچکے ہیں، اس کو ضائع کر کے پیچھے چلے جانا نہایت مضر ہے۔ آپ کے اپنے ایمان و ضمیر کے لیے بھی اور دوسرے ساتھیوں کے لیے بھی، ڈاڑھی نہ رکھنا اچھا نہیں، مگر رکھ کر منڈوا دینا

خود اپنے اوپر، بچوں پر اور معاشرے پر دین کی تحقیر کا اثر ڈالنا ہے۔ نماز کے پابند آدمی کا تارکِ نماز ہو جانا یا ایک عفیف الطبع فرد کا بدکاری کے اکھاڑے میں کُود جانا اپنے اندر دوہری برائی رکھتا ہے۔

آپ اپنے متعلق تہِ دل سے سوچیں کہ تحریک نے یا دینی شعور نے آپ کو ذہنی اور اخلاقی طور پر کس بلندی تک پہنچایا۔ اور پھر دیکھیں کہ پچھلے دس، بیس، تیس یا چالیس برس میں آپ بلند تر ہوتے چلے گئے، یا کٹی ہوئی پتنگ کی طرح آہستہ آہستہ پستی کی طرف گرتے چلے گئے۔ میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جنھوں نے بہت سے مسرفانہ طریقے چھوڑ کر سادہ گزر بسر اختیار کی اور زائد مال تحریک کو دینے لگے، مگر بعد میں ان کی یہ کیفیت برقرار نہ رہی۔ ان کا رہن سہن اور خرچ اخراجات کا معیار بڑھتا چلا گیا اور خوئے انفاق کم ہوتی چلی گئی۔ بعض افراد ایسے دیکھے کہ انھوں نے مولانا مودودیؒ کی دی ہوئی تعلیم قرآن وحدیث کو پلّے باندھا اور موسیقی کا بہت شوق رکھنے کے باوجود اس سے کلیتہً مجتنب ہو گئے، مگر بعد میں وہی ہیں کہ گھنٹوں ان کے گھروں میں موسیقی کا دریا بہتا رہتا ہے۔

پردے کے معاملے میں بات چہرے کے پردے اور مکمل برُقعے سے چلی اور مخالفانہ ماحول کی پروا نہ کرتے ہوئے پردہ داری کے اس شان دار معیار کو ہماری خواتین نے قائم کیا۔ بعد میں ماحول کا دباؤ جب بڑھنے لگا تو ''چادر'' کی بات چلی، میں نے محسوس کیا کہ اب پسپائی کا آغاز ہو گیا ہے۔ پہلے پہل چادر اس طرح اوڑھی جانے لگی کہ تمام جسم ولباس اور زینتیں مخفی ہو جائیں، پھر وہی چادر سکڑتی دیکھی اور شلوار کا ایک طرف کا پورا حصہ دکھائی دیتا۔ پھر شلوار کے دونوں حصے پورے سامنے آ گئے۔ چہرے پر چادر کے پلّوؤں کو پکڑ کر زیادہ اچھی طرح جوڑ لیا جاتا تھا۔ اب ان پلّوؤں میں فاصلہ آنے لگا۔[۱]

---

[۱] یہ وہی عمل ہے جس سے گزر کر جدید طرز کی خواتین کے گھرانے میدان میں بڑھے۔ ایک رویہ نانی اماں کا تھا، پھر آزادی کے کچھ کواڑ بیٹی نے کھولے۔ آخر میں نواسی کھل کھیلی اور سیدھی اسٹیج پر آ گئی۔ میں اسے شکست سمجھتا ہوں اور مخالف الحادی نظریات کی فتح، جیسے کہ سلیم احمد ہی نے ایک طنزیہ مگر حزنیہ نظم کہی تھی۔ ''مشرق ہار گیا ہے''، ''ہم ہار گئے ہیں''، ''میں ہار گیا ہوں۔'' اب یہ شکست باہر سے نہیں، ہمارے اندر سے نمودار ہو رہی ہے۔ اگر ہمتیں اتنی پست تھیں تو خواہ مخواہ اسلامی تحریک کا پرچم اٹھا لینے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کام عقابوں کا ہے، ممولوں کا نہیں!

اسی طرح باقاعدہ قومی لباس مقرر ہو جانے کے باوجود بھی پتلون پہننے والوں کا شوق جا بجا نمودار ہوتا ہے۔ کئی عورتیں اپنی پانچ سات سالہ بلکہ دس بارہ سالہ بچیوں کو بھی اسکرٹ اور سایہ پہنا کر گویا یہ حسرت پوری کرتی ہیں کہ ہمیں تو یہ سعادت نصیب نہ ہو سکی، اب ہم اولاد کو اس لباس میں سجا سنورا دیکھ کر اطمینان حاصل کریں گے۔ میں نے چھوٹی لڑکیوں کو پینٹ پہنتے ہوئے بھی دیکھا۔ کھڑے ہو کر کھانے اور چائے پینے کا فیشن مغرب سے آیا تو بجائے اس کے ہم لوگ مضبوطی سے اس کے سامنے حائل ہو جاتے کہ کم از کم ہمارے گھروں میں اجنبیوں اور ملحدوں کا ایجاد کردہ یہ تہذیبی طریقہ جگہ نہ پا سکے گا، ہم نے اس کے فوائد گنوانے شروع کر دیے۔ حالانکہ نقصانات زیادہ ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی تو قائم ہی اس لیے ہوئی کہ ایک دینی روایت، حکم، شعار، قدر کا تحفظ کرے۔ اگر خود جماعت ہی کے خیمے میں تہذیبِ نو کی چڑیلیں آ گھسیں تو پھر ہمارا کیا فائدہ؟ اور یہی ہونا ہے تو پھر اس جماعت کی ضرورت ہی کیا ہے؟

اعتذار

یہ باتیں میں نے تصنّع سے نہیں بلکہ دل کے تقاضے سے کہیں۔ یہ میرے ضمیر کی آواز تھیں، اگر کسی کو ناپسند ہوئی ہوں تو معذرت خواہ ہوں کہ ان کے احساسات کو کوئی تکلیف کیوں پہنچی۔ لیکن کسی کو ناگواری ہو یا خوشی، ہر حال میں مجھے ایسے باتیں کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اگر میں یہ نہ کہہ سکوں تو میرا بحیثیت مسلمان اور رکنِ جماعتِ اسلامی، خادمِ اسلام اور نگہ دارِ تحریک ہونا کتنا بے معنی ہوگا۔ میں مانتا ہوں کہ ماحول مجھ پر دباؤ ڈال کر پھر بہ لطائف یہ سمجھاتا ہے کہ چھوڑو بھئی، اب ایسی باتوں سے کیا فائدہ۔ لوگوں کے دل بُرے ہوں گے۔ مگر میں ابھی مسلکِ عاشقی سے تائب نہیں ہوا۔

یہ مرحلہ جبکہ تنظیم آہستہ آہستہ اگلی نسل کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ اس میں ضروری انتباہات سامنے آنے چاہییں!

ایمان اور اُس کے تقاضے

ایمان ایک بیع یا معاہدہ ہے اللہ تعالیٰ سے۔ اِس معاہدے کی بنیاد شعور و دلائل پر ہوتی ہے اور یہ کسی دباؤ کے بغیر آزادیٔ ضمیر اور اختیار کے ساتھ استوار کیا جاتا ہے۔

رضا کارانہ فیصلہ

ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کے نتیجے میں آدمی رضا کارانہ طور پر کچھ چیزوں کو مسترد اور کچھ کو قبول کرتا ہے، کچھ کو اپنے لیے جائز اور حلال اور کچھ کو ناجائز اور حرام شمار کرتا ہے۔ کچھ امور کے لیے اس کی طبیعت میں رغبت اور کچھ کے لیے نفرت و کراہت کام کرنے لگتی ہے۔ بعض رابطوں کو وہ ناپسند کرتا ہے اور بعض کو پسند۔ اس کے ذہن میں ایک نیا نقطۂ نظر (Outlook) اور ایک پیمانۂ اقدار کام کرنے لگتا ہے۔ اس کے ضمیر میں قوت اور بیداری پیدا ہوتی ہے اور ہر وہ چیز جو ایمان کے خلاف ہو اس پر وہ ٹوکنے لگتا ہے۔

مختلف نظریات، تحریکیں، نظام، شخصیتیں اور کردار اس کے سامنے آتے ہیں اور اُس کا ایمانی شعور اسے احساس دلا دیتا ہے کہ تم کدھر کتنا جھکاؤ اختیار کر سکتے ہو اور کدھر نہیں۔ خواہشوں، جذبوں، مفاد، لذتوں، ردعملی لہروں کا جو ہجوم آدمی کو گھیرے رہتا ہے، اس میں بھی ایمانی شعور (اور اس سے وابستہ ضابطۂ قرآن و سنت) ہی رہنمائی دیتا ہے کہ کس چیز کو کن حالات میں کتنی وقعت دی جاسکتی ہے۔

ایمان محرک جنگ ہے

ایمان ایک مسلسل جنگ کا محرک ہے جو ایک طرف اپنے نفس کے خلاف، دوسری

طرف ناسازگار ماحول کے خلاف، تیسری طرف اس ایمان سے ٹکرانے والے نظریات وافکار کے خلاف عمر بھر جاری رکھنی ہوتی ہے۔[۱] ایمان ہی کی قوت پر اس کا دار و مدار ہے کہ یہ جنگ جاری رہے، پرُجوش طریق سے اقدام ہو، جو زخم اور نقصانات پیش آئیں، حوصلے سے برداشت کیے جائیں۔لیکن پسپائی — خواہ چیونٹی کی رفتار سے ہو — کسی حال میں قبول نہ کی جائے۔ نیز اس جنگ کے لیے زیادہ سے زیادہ سپاہ اور زیادہ وسائل اکٹھے کرنے کی مہم ساتھ ساتھ جاری رہے، یعنی ایمان کو انجیل کی اصطلاح میں ایسا خمیر ہونا چاہیے کہ جو جہاں جہاں تک اثر کرے خمیر بناتا چلا جائے۔

ایمان کی کردار سازی

ایمان اگر شعوری اور جاندار ہو تو اس کے ساتھ لازمی طور پر ایک درخشاں کردار نشو و نما پاتا ہے۔کردار بمعنی اخلاقی تصور کے اور کردار بمعنی ایک مستقل مجموعی رویے کے بھی۔

یہ عمل بھی رضا کارانہ عمل ہے کہ سوچنے سے لے کر رفتار و گفتار اور مجموعی کردار تک، ہر چیز میں آدمی اپنے اوپر پابندی عائد کر لے کہ اسے بعض چیزوں کو کبھی اختیار نہیں کرنا ہے اور اسی طرح یہ التزام بھی کرے کہ فلاں فلاں ہدایات کے مطابق اپنے آپ کو چلانا ہے۔ مثلاً آپ نے طے کر لیا کہ مجھے تمام عمر جھوٹ یا وعدہ خلافی سے پرہیز کرنا ہے، مجھے حسبِ مقدرت خدا کی راہ میں انفاق کرنا ہے، مجھے خدا کے بندوں سے محبت کرتے ہوئے اُن کی خدمت کرنی ہے، مجھے کِبر، ریا اور نمائش اور شہرت کے چسکوں سے بچنا ہے۔ مجھے صاف صاف طریق سے حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دینا ہے، مجھے منظّم زندگی گزارنی ہے، مجھے معروف میں جماعت کا ساتھ دینا ہے، مجھے سمع و طاعت کا حق ادا کرنا ہے، مجھے خدا و رسولؐ اور دینِ برحق کے علاوہ ہر مسلمان کی جماعت کی اور جماعت کے اکابر کی خیر خواہی کے تقاضے سبھی پورے کرنے ہیں۔ مجھے غیبت اور نجویٰ سے بچنا ہے، مجھے رازداریٔ مجالس کا پاس کرنا ہے، مجھے لوگوں کے درمیان غلط فہمیاں اور شکر رنجیاں پیدا کرنے کے بجائے ان میں صلح و سازگاری کو بڑھانا ہے، مجھے اپنے سے بڑوں کی تعظیم کرنی ہے اور چھوٹوں اور کمزوروں کے لیے شفقت کا طرزِ عمل اختیار کرنا ہے، مجھے جتھہ بندیاں

---

[۱] یہ جنگ دعوت سے شروع ہوتی ہے اور ہر موقع و مرحلہ اور مخاطب کے لحاظ سے بڑی حکمت کے ساتھ اس کی تدبیر کرنی پڑتی ہے۔

نہیں پیدا کرنی ہیں، مجھے کسی دوسرے کو کہنی نہیں مارنی ہے اور کسی کی ٹانگ نہیں کھینچنی ہے اور اگر کوئی شخص یا گروہ اجتماعیت سے ناجائز فائدہ اٹھائے تو اسے جرأت سے ٹوک دینا ہے۔

ایمان اور مفاد پرستی

ایمان والے آدمی کی اوّلین و آخرین ترجیح اپنے مقررہ نصب العین کی خدمت ہے۔ اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس نصب العین سے محبت کرنے اور اس کی خدمت کے دلدادگان کو مغالطہ دے کر ذاتی مفاد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا، وہ تحریکِ اقامتِ دین کے شجرۂ طیبہ پر نفسانیت کی بیل کو نہیں پھیلنے دے گا، وہ دین کی خدمت کی آر میں دنیا نہیں بنائے گا۔

لہو ولعب کا ترک

ایمان والوں کا کام لہو ولعب سے دور رہنا ہے۔ ان کو نہ صرف رقص وسرود اور منشیات سے اور مخلوط تقاریب اور بے پردگی و بے حیائی کے تمام مظاہر سے گریز کرنا ہے اور ان کے خلاف معاشرے میں محاذ پیدا کرنا ہے، بلکہ ہر وہ چیز جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہو، اس کا ترک ہی نہیں کرنا، اسے قابلِ نفرین سمجھنا ہے۔

ایمان کا تقاضائے شائستگی

بڑی باتیں تو بڑی باتیں، ایک سچے صاحبِ ایمان کے اندر بیٹھا ہوا خفیہ نگہدار و پاسبان تو اسے اس کی اجازت بھی نہیں دیتا کہ وہ لوگوں کے سامنے تھوکے، گزرگاہ میں کوئی روڑا، کنکر یا کوئی گندگی پھینکے، جمائی لے تو پورا منہ کھول دے، ڈکار لے تو کھلے منہ کے ساتھ ''ہا'' کرے، چھینک یا کھانسی آئے تو منہ پر رومال یا ہاتھ تک نہ رکھے، کسی بھی ناگوار حرکت پر قریب کے متاثرین سے معذرت تک نہ کرے، کھانا کھائے تو ہاتھ دھونے یا بسم اللہ پڑھنے سے بے نیاز رہے، کوئی احسان کرے تو شکریہ تک ادا نہ کرسکے، غرض کہ زندگی کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تمام چھوٹے اور بڑے معاملات میں اسے ایمانی شعور اور علم کتاب وسنت (جس کا بقدرِ ضرورت حاصل کرنا لازم ہے) کے مطابق ایک خاص طرزِ عمل کی پابندی کرنی ہے اور اس کی برعکس صورتوں سے اجتناب کرنا ہے۔

داخلی دباؤ

یہ سارا کچھ خارجی دباؤ سے نہیں ہوسکتا، اس کے لیے داخلی دباؤ ہی کارآمد ہے۔ صرف ایمانی شعور یا شعوری ایمان کا دباؤ۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی رویہ رضا کارانہ رویہ ہے، یعنی اپنے اوپر خود عائد کردہ دینی ضابطے اور پابندیاں ـــــ اور پھر ان کو دو چار دن نہیں، سال دو سال نہیں، ساری عمر نبھانا۔ حالات کی گردشیں کچھ ہی ہوا کریں، ضروریات کیسی کیسی پیدا ہوتی ہیں، ماحول کیا کیا دباؤ ڈالتا رہے، اکثریت کی روش کیسی کیسی رغبتیں اور ترغیبیں پیدا کرے، اس سارے سیلابِ بلا کی تند و تیز موجوں کے سامنے ایک مومن صرف رضائے الٰہی اور جزائے اخروی کے لیے مضبوطی سے کھڑا رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص سالہا سال کھڑا رہا، لیکن ایک بار خود اس کی دوں ہمتی یا نفس پرستی کی وجہ سے اس کے قدم اکھڑ گئے اور مخالفانہ حالات کے دھارے میں بہہ نکلا تو اس نے محنتوں سے حاصل کردہ کمائی پل میں ضائع کر دی، حتیٰ کہ ساری عمر بخیر و خوبی گزار کر موت سے کچھ ہی گھڑیاں پہلے وہ بہک گیا تو کارناموں کا سارا اکاؤنٹ ختم ہوگیا۔ خدا ہر صاحبِ ایمان کو ایسے خسران سے بچائے۔

ایمان کا تقاضا احتساب

خسران سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی باقاعدگی سے اپنا احتساب خود کرتا رہے۔ ہر نماز کے بعد اور ہر دن کو ختم کرنے پر، وہ یہ دیکھے کہ کسی ادنیٰ رفتار سے بھی عقائد میں، عبادات میں، مقاصد میں، اخلاق میں، تحریکی جدوجہد میں، فریضۂ سمع و طاعت میں، دعوتِ حق کے پھیلانے میں پسپائی تو نہیں ہو رہی؟ فخر و ریا اور شہرت طلبی اور مفاد پسندی کی منحوس پرچھائیاں تو ذہن پر نہیں پڑ رہیں؟

خرابی جب آتی ہے تو چوروں کی طرح دم سادھے ہمارے حریم ذات میں داخل ہوتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر اپنا زہر پھیلاتی ہے۔ آدمی اپنے نفس اور ماحول کے دباؤ سے بعض اُمور میں ہلکی ہلکی تاویلیں کرتا ہے اور انحرافی طرز اختیار کرنے کے لیے خاصے دلائل جمع کرتا ہے تاکہ اپنے ضمیر اور بیرونی ناقدین و معترضین کا مقابلہ کر سکے۔ تاویلوں کا مقصد یہ ہوا ہے کہ اُصول و حدود اور مقاصد و غایات اور اخلاق و شعائر کی جو لکیریں کتاب و سنت کی روشنی میں

بہت سوچ سمجھ کر لگائی گئی تھیں اور جن کی سالہا سال تک پاسداری کی جاتی رہی ہے، انھیں ذرا آگے پیچھے کیا جاسکے۔ بس ایک دفعہ اگر کسی گوشے میں یہ عمل کامیاب ہوجاتا ہے تو پھر دوسرے گوشوں میں بھی ایسا ہونے لگتا ہے۔ پہلے اگر پسپائی یا انحراف کا عمل انچ کے دسویں حصہ تک محدود تھا تو کسی دوسرے مرحلے میں پورے انچ کا فرق پڑ جاتا ہے اور بعدازاں کسی اور موقع پر فٹ بھر کا اور آگے چل کر میل بھر کا۔

تاریخ میں انسانی کردار کے لیے سُنّۃ اللہ یہی ہے کہ جو تھوڑا سا آگے بڑھنے کے لیے زور لگاتا ہے، اسے زیادہ پیش قدمی کے لیے حالات مہیا کیے جاتے ہیں، اسی طرح جو قدم کو پیچھے ہٹاتا ہے اس کو مزید پیچھے ہٹانے والے حالات پیش آتے ہیں۔ نُوَلِّہٖ مَاتَوَلّٰی۔

اس خطرے سے تحفظ صرف احتساب میں ہے۔ احتساب کرتے ہوئے ہمیشہ اپنے اولین طے کردہ خطوط وحدود کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے اور پھر دیکھنا چاہیے کہ ان خطوط وحدود میں کیا تبدیلی کی گئی۔ یوں بھی سوچا جاسکتا ہے کہ کل تک کسی معاملے میں التزام یا کسی غلط چیز سے اجتناب اور کسی خاص رویے کی پسند وناپسند کے بارے میں ایک شخص (یا سارا گروہ) کہاں قدم جمائے ہوئے تھا اور آج کہاں ہے؟

اسلامی تحریک کے چھے نکات

وہ گراں قدر رفیق جو تحریکِ اسلامی کے ساتھ اوّل روز سے چلے تھے " فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ قَضٰى نَحۡبَهٗ " [۱] کے بمصداق اپنا فریضہ باحسنِ وجوہ انجام دے گئے، ان کی صف میں سے اب چند حضرات " مِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّنۡتَظِرُ " [۲] کے مقام پر باقی رہ گئے ہیں۔ اس چھوٹے سے حلقۂ یارانِ طریق میں معمولی سے درجے کا ایک فرد میں بھی ہوں۔

میرا سفرِ تحریک

ان معزز و مکرم ہم سفروں کے ساتھ مجھ جیسا ناچیز آدمی بھی یہ دولتِ افتخار رکھتا ہے (اور اس کی بھاری ذمے داریوں کا احساس) کہ میں نے پانچ افراد پر مشتمل تحریک دارالاسلام اور اس کے بعد ۱۹۴۱ء میں ۷۵ موسّسینِ جماعتِ اسلامی کے ساتھ بیٹھ کر دین کے عقائد اور نصب العین کی روشنی میں اقامتِ دین یا غلبۂ اسلام کی جس تحریک کا آغاز کیا اس کی تقریباً اکتالیس سالہ سرگرمیاں میرے سامنے عمل میں آئیں۔ (مضمون ہذا ۱۹۸۲ء میں لکھا گیا) حالات کے مختلف پیچ و خم سے گزرتے ہوئے جو فیصلے ہوئے اور جس طرح کے اقدامات کیے گئے ان کا میں گواہ ہوں۔ بہت سے معاملات میں خود میں نے تحریک کی یا دلائل دیے، بے شمار قرار دادوں اور بیانوں کی ڈرافٹ میں نے تیار کیے۔ پمفلٹ لکھے، مضامین شائع کرائے، خط و کتابت کی۔ نوجوانوں نے جب اسلامی جمعیتِ طلبہ کے مختصر سے حلقے کا آغاز کیا تو مولانا مودودیؒ کے ساتھ

---

[۱] اُن میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ (سورۃ الاحزاب: ۲۳)

[۲] اور اُن میں سے بعض وہ ہیں جو (اپنی باری کا) انتظار کر رہے ہیں۔ (سورۃ الاحزاب: ۲۳)

اس کی نشست میں میں بھی موجود تھا۔ اور اس وقت جس مقصد اور نصب العین کے مقرر کرنے اور کام کے جس نقشے پر چلنے کا فیصلہ ہوا میں اس کا گواہ ہوں۔ قرار دادِ مقاصد کے پاس ہونے پر جماعت کے نقشۂ کار اور پالیسی میں جو ناگزیر تبدیلی آئی اس کی بحثوں کا بھی مجھے علم ہے۔ پہلے انتخابات جن میں پنچایتی سسٹم بنا کر جماعت نے حصہ لیا، اس سسٹم کی نقشہ بندی اور اس کے متعلقہ عہد نامے کی تیاری میں میرا خاص حصہ رہا۔ مولاناؒ کی پہلی نظر بندی (ملتان) کے دور میں ''نظر بندی کیوں؟'' والا پمفلٹ میں نے لکھا جس کے اثرات اُس دور کے اصحاب جانتے ہیں۔ میرے سامنے ایک گروہ کی علیحدگی جماعت سے ہوئی۔ پھر جتنے بھی انتخابات ہوتے رہے ان کے ہونے کے بعد یہ جائزہ لے کر احتساب کیا جاتا رہا کہ اس دوران میں اخلاقی حدود اور اصولی تقاضوں کو کہاں کہاں نظر انداز کیا گیا۔ کئی بار متحدہ محاذ بنے اور ٹوٹے، ہر بار کے تجربے سے فائدہ بھی ہوا اور بعد کی ناکامی کے زخم بھی کارکنوں کے دلوں میں رہ گئے۔ اشتراکیت پسند اور لادینیت پسند طبقوں کے ساتھ اتحاد کی اگر اِکّا دُکّا صورت تجربۂ عمل میں آئی بھی تو اس کا آخری نتیجہ یہی نکلا کہ ایسے عناصر کے ساتھ سیاسی ضرورتوں کے لیے محاذ بنائے جائیں۔ اور اگر کوئی محاذ بنے تو صرف ایسی صورت میں جبکہ غلبۂ اسلام کو ایک اصول کے طور پر مانا جائے۔ اس وقت تجربوں کا ماحصل یہ تھا کہ اسلامی مقصد کو الگ رکھ کر عام قسم کے محاذ بنانا مفید نہیں ہوسکتا۔ بحالیٔ جمہوریت کے لیے متعدد بار متجانس عناصر کے ساتھ بھی رابطہ ہوا، مگر بالعموم اُس صورت میں کہ اسلامی رجحانات اور پاکستان کی سالمیت واستحکام کو پسند کرنے والا عنصر غالب رہے۔

پچھلے دور کا ایک اصل الاصول

لیکن بہرحال پچھلا سارا دور اس کڑی پابندی کے ساتھ گزرا کہ ہمارے تمام فیصلوں اور اقدامات میں اسلام اور اس کے تقاضے بطور اصل الاصول کارفرما رہیں گے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ حالت تا حال باقی ہے، مگر پھر بھی حالات کے بھنور آج اس بُری طرح ہمارے رفقاء کے سفینوں کو گھما رہے ہیں کہ اپنے آپ کو ایک طرح کا انتباہ دینے کی ضرورت ہے۔

میرا مقصودِ کلام

یہ سطور میں نے اپنی شان میں قصیدے کے طور پر نہیں لکھی ہیں بلکہ اس ذمے داری کے

احساس سے لکھی ہیں کہ کاروانِ اقامتِ دین کے ہر راہ گیر کو اب تک کے لمبے دور کی روشنی میں توجہ رہے کہ اس کا رخِ اقدام کیا ہے۔ضروری نہیں کہ میری گزارشات ہر کسی کے لیے مؤثر یا قابلِ توجہ ہوں، مگر یہ مجھے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل اور موجودہ نسل نہیں تو بعد کی کوئی نسل اور میرے ملک میں نہیں تو باہر کے کسی ملک میں کبھی نہ کبھی ان باتوں کو پڑھا جائے گا اور ان پر غور کیا جائے گا۔ میں صرف اپنے ضمیر کے تقاضے سے خدا کی خوشنودی کے لیے لکھ رہا ہوں۔ وہ راضی ہو تو اور کسی کی مجھے پروا نہیں اور وہ اگر ناپسند کرے تو میں ہزار بار اُس سے معافی کا خواست گار ہوں۔

یہ چند باتیں محض یاد دہانی ہیں-خود میرے اپنے لیے بھی اور مخلص رفقائے مقصد کے لیے بھی اور عام مسلمانوں کے لیے بھی- یہ سب کچھ ہمارے لٹریچر میں موجود ہے، مگر بسا اوقات ہم خود اپنی ہی فکر اور اپنی ہی دعوت اور اپنے ہی مقاصد سے غافل ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کبھی کبھی پرانی باتیں تازہ ہوتی رہیں، البتہ یہ ممکن ہے کہ اندازِ بیان میں کچھ تھوڑا سا نیا رنگ پایا جائے۔

حرفِ اوّل

دین وسیاست کی تفریق کی جو لمبی صدیاں ہم پر گزری ہیں، ان کی وجہ سے ایک عرصۂ دراز سے دین وسیاست کے دائرے الگ الگ ہو گئے۔ اہلِ دین نے کہا کہ سیاست دُنیاداری ہے اور اس کی ضرورتوں کے ساتھ اسلام کے ایمانی و اخلاقی تقاضے صحیح سلامت رہ ہی نہیں سکتے۔ اور اہلِ سیاست نے طے کرلیا کہ سیاست جس نت نئے ہیر پھیر اور اتار چڑھاؤ کے ساتھ چل سکتی ہے۔ اس میں انفرادی دین داری کی کچھ باتیں تو کھپ سکتی ہیں مگر سچّے خدا پرستانہ اُصول و مقاصد کو برقرار نہیں رکھا جاسکتا، یعنی دین پسند ہو تو سیاست حرام اور سیاست پسند ہو تو دین سے چھٹی۔ یہ دونوں چیزیں یک جا اور یک جان نہیں ہو سکتیں۔ بدقسمتی سے بعض ائمہ اور مجددین کی مساعی، تحریکوں اور قربانیوں کے باوجود ہماری یہ دُوئی صدیوں غالب رہی۔

پھر انگریزی دور مغرب کا لادین طرزِ سیاست ساتھ لایا اور اس سے اثر پزیر معاشروں میں ''یک بام ودو ہوا'' کا فتنہ اور بڑھ گیا۔ جس نے دین کو پسند کیا اس نے مسجد، مدرسہ اور خانقاہ کو سنبھالا اور دنیا کے خیر وشر سے قطع تعلق کرلیا اور جس کو سیاست کے کارزار میں حصہ لینا پسند آیا، اُس نے تخت یا تلوار سنبھالی، نعرے ایجاد کیے، عوام کو آج ایک مقصد سے بھڑکایا اور کل دوسرے

مقصد سے، آج ''الف'' سے دشمنی ہوئی اور ''ب'' سے دوستی تو کل ''ب'' سے ہم پیالگی و ہم نوالگی قائم ہوئی اور ''الف'' سے کُٹی ہوئی، محاذ کا رُخ کبھی مشرق کی طرف اور کبھی مغرب کی طرف۔ اہلِ سیاست کا مقصد حصولِ اقتدار یا تحفظِ اقتدار یا خاتمۂ اقتدار اور تبدیلیٔ اقتدار پایا اور ان کا قانون اوّل و آخر'' قانونِ ضرورت'' بن گیا۔ اس طرح بے اُصولی اور مطلب برآری اور وقت وقت کی نئی بولیاں اُصول بن گئیں۔ نتیجہ یہ کہ دین داری کا مزاج خانقاہی بنا اور سیاست کا مزاج جنگی و تصادمی۔ جہاں اس طرح کی دین داری آئی وہاں سیاست کے دروازے بند، اور جہاں اُس انداز کی سیاست بازی آئی وہاں دین کے چشمے خشک!

یہ تھا ہماری تاریخ کا عظیم ترین فتنہ جو صدیوں ہمارے اعمال کی آبیاری سے پنپتا رہا اور نئے دور میں خوب برگ و بار لایا۔

اس فتنے کے خلاف برصغیر میں جس طرح پہلے کے اکابرِ ملت، جن میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ اور سیّدین شہیدینؒ نے فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے مؤثر کام کیا، وہاں حکیم اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ نے بڑی زبردست فکری مہم چلائی کہ ذہنوں کو اس تخیلِ باطل کے شجرۂ خبیثہ سے پاک کر دیا جائے۔ اور مولانا مودودیؒ نے تو عملاً صحیح و جامع تصورِ دین کے تحت کئی سال تک ایک تحریک عملاً چلا کر دکھا دیا کہ دین کے تمام حدود و قیود کو قائم رکھ کر سیاست کی اصلاح کی سعی کی جاسکتی ہے۔ انتخابات اور پارلیمانی ایوانوں میں حصہ لیا جاسکتا ہے، عوامی حرکات جاری کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح ہر قسم کی سیاسی تگ و تاز کے ساتھ تمام اسلامی عقائد، عبادات، اخلاقیات اور پیمانہ ہائے خیر و شر کو بغیر کسی ردّ و بدل کے برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ یہ نئی دعوت بجائے خود بڑی انقلابی دعوت تھی جس کو آگے بڑھانے کے لیے ایک طرف مذہبی طبقوں کی طرف سے پتھروں کی بوچھاڑ کو سہنا پڑا اور دوسری طرف آزاد سیاست کے علم بردار سیکولرسٹ مسلمانوں کی صفوں کی جانب سے تیر کھانے پڑے، مگر بحمد اللہ کہ ہماری دعوتِ حق نے ذہنوں کو دلائل سے فتح کیا۔ یہاں تک کہ نوخیز نسلوں نے بھی اس کو دوسروں سے بڑھ چڑھ کر اپنے اندر جذب کیا۔

اب مشکل یہ پیش آ رہی ہے کہ ہم خود اپنے ہی وضع کردہ اور اعلان کردہ تصوّرِ وحدت دین و سیاست کے بارے میں جب کبھی ٹھوکریں کھاتے ہیں تو ایک طرف اسلامی انقلاب کے کارکنوں کے ذہنوں میں خطرناک جوار بھاٹا پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف وحدتِ دین و سیاست

کے تصوّر کی دعوت ہمارے مخاطب خواص وعوام کے لیے کمزور ہونے لگتی ہے۔

میری عاجزانہ درخواست ہے کہ دینی وسیاسی سرگرمیوں میں انتہائی احتیاط کے ساتھ توازن قائم کیا جائے بلکہ ان کو دو الگ الگ چیزیں بنا کر چلنے کے بجائے صرف دین میں اسی طرح سیاست کو شامل سمجھا جائے، جیسے دعوت وتعلیم اور اخلاق و جہاد شاملِ دین ہیں۔ سیاست کو الگ سے لا کر دین میں ٹانکنے کا مسئلہ نہیں ہے۔

حرف دوم

یہ امر ہر معاملے اور ہر مرحلے میں ہمارے سامنے رہنا چاہیے کہ دین کو ایجاد کرنے والے ہم نہیں ہیں، بلکہ اسلامی تحریک کے اُصول ومقاصد سے لے کر اس کے طریقہ ہائے اقدام تک خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کے پابند ہیں۔ ہم اس گھوڑے کی طرح نہیں ہیں جس کی اگاڑی پچھاڑی کھلی ہو اور وہ جس کھیت میں چاہے گھسے اور اس کی فصل چرتا پھرے یا جس باغ میں چاہے جا کر لوٹنیاں لگائے اور گل وگیاہ کو روند ڈالے۔

جب بھی کوئی مرحلۂ اقدام آئے یا کسی کارروائی کے لیے غور وفکر کیا جائے تو پہلے یہ سوچ لیا جائے کہ طریقِ قرآن اور طریقِ سنت کیا ہے۔

زمانے کے حالات اور تقاضوں کے تغیر کے ساتھ اجتہاد کیا جاسکتا ہے مگر شرائطِ اجتہاد اور اصولِ اجتہاد کے ساتھ آپ امورِ منصوص یا سنتِ محکمہ کو کسی بھی قانونِ ضرورت کے تحت بدل نہیں سکتے۔ اور اگر نصوص کے جنگلوں کو پھاند جانا ہو تو پھر آخر اس تکلف کی سرے سے ضرورت ہی کیا ہے کہ ہم سیاسی بے راہ روی کے ساتھ یہ دعوے بھی کریں کہ ہم تو اقامتِ دین کا کام کرنے چلے ہیں، لہٰذا ''جو بھی رَستے میں آئے گا کٹ جائے گا۔''

آپ کو یہ امر بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ پارلیمانی انتخابات کی مخصوص سیاست، ضروری نہیں کہ آپ کو اسلامی انقلاب کے آخری مرحلے تک پہنچا دے۔ اب جبکہ آپ اصلاً ''دعوت'' ہی کے مرحلے میں ہیں، آپ کو سیاسی جدوجہد کو بھی کسی قدر احوال کی اصلاح کے جذبے کے ساتھ اصولاً دعوت ہی کے لیے ایک ذریعۂ اثر اندازی بنا کر استعمال کرنا ہے۔ اگر ہماری سیاسی سرگرمیاں لوگوں کے سامنے ہمارا ایسا کردار پیش کریں اور ہمارے بیانات اور اعلانات اور اداروں کے قیام، نعروں اور سلوگنوں کی ایجاد اور بعض تبدیلیوں کے لیے اپیل کے

طریقوں اور دوسری پارٹیوں کے ساتھ اتحاد واختلاف کی ایسی تصویر پیش کریں کہ جس کی وجہ سے خود ہماری اصل ہی کا اعتبار اٹھ جائے تو اگر ہم نے اقتدار کا بڑا حصہ اور جمہوری ایوانوں میں بہت سی سیٹیں بھی حاصل کرلیں تو ایسی جیت میں فی الحقیقت ہماری ہار پوشیدہ ہے۔

حرفِ سوم

اسلامی تحریک میں جدید دور کی اصطلاح کے مطابق ریڈیکل ازم یا استعجال پسندانہ اندھا جوشِ رفتار نہیں پایا جاتا۔ ریڈیکل ازم یہ ہوتا ہے کہ ایک بڑی جماعت میں سے ایک مختصر گروہ اس جذبے سے سر اٹھاتا ہے کہ وہ ان اصول وحدود اور تاریخی تسلسلِ کار کے بعض تقاضوں کو توڑ کر جلدی سے آگے بڑھ جائے گا اور آناً فاناً انقلاب لے آئے گا،[۱] بلکہ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ وہ مارکسی تصوّر کی اصطلاح میں تاریخ کو جست لگانے پر مجبور کردے گا یا نئے انداز سے کہیں تو وہ دس بیس برس بعد کے انقلاب کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا حال کے لمحے تک لے آئے گا۔[۲]

اس قسم کا ریڈیکل ازم لوگوں کو ایڈونچرسٹ یا کارنامہ گر (اور یہ اصطلاح عام مہم جُو) بنا دیتا ہے۔ وہ قسم قسم کے نئے اصول اور نئے تجربے ایجاد کرتے ہیں۔ اور ہر قسم کے اُصول اور تجربے کے بعد وہ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ اسلام سلامت ہے، آخر اسلام کو کیا خطرہ؟ وہ کوئی کانچ کا بنا ہوا تو نہیں ہے۔

اسی نظریے کے تحت فارورڈ بلاک بنتے ہیں اور جہاں فارورڈ بلاک بنتے ہیں وہاں عام

---

[۱] عالمِ اسلام کی دینی تحریکوں میں کہیں کہیں یہ رجحان انقلابِ ایران کے ظہور کے بعد اُبھرا ہے، حالانکہ انقلابِ ایران کا عمل بہت پیچھے سے شروع ہوکر یہاں تک پہنچا اور وہاں کے حالات کی کچھ خصوصیات بھی ہیں جن پر دوستوں کی نظر نہیں۔ محض جوشیلے پَن کے اضافے سے کوئی فرق اصل کام میں واقع نہ ہوگا۔ صرف ایران کی فکری سیادت کا سکہ زیادہ خوبی سے چل سکے گا۔

[۲] بھارت میں تقسیم سے قبل کی کانگریس کے ہوتے ہوئے پہلے پہل تھوڑا سا ریڈیکل رجحان جواہر لال نہرو میں تھا مگر مہاتما گاندھی کے نظریہ عدم تشدد نے اس نورس رجحان کو زیادہ اُبھرنے نہیں دیا۔ بعد میں جوں جوں نہرو صاحب پر ذمہ داریاں بڑھتی گئیں وہ کانگریس کی بنیادی پالیسی کے علم بردار بنتے گئے۔ اسی طرح ایک تجربہ سبھاش چندر بوس کا تھا، مگر جیسا وہ تجربہ تھا اور جو کچھ حشر اس کا ہوا سب کے سامنے ہے۔

دنیوی سیاسی جماعتوں میں اندر ہی اندر ایک رسہ کشی چلتی رہتی ہے، لیکن دینی سیاسی جماعتوں کے ذہنوں میں پہلے انتشار پیدا ہوتا ہے، پھر بحران اور آخر کار شکست وریخت ہونے لگتی ہے۔

لہٰذا خدارا آپ اپنے آپ کو ریڈیکل ازم اور فارورڈ بلاک جیسے تصورات سے بچائے رکھیے۔ یہ راستہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ بالآخر تخریب وتشدد کی طرف جاتا ہے۔ اسلامی دعوت میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی جب وہ تخریب وتشدد کے راستے پر پڑ جائے۔ اسلامی انقلاب کے راستوں پر چلنے والوں کی سب سے بڑی قوت ''مظلومیت'' ہوتی ہے اور یہی مظلومیت چاروں طرف دل ودماغ کو فتح کرتی جاتی ہے۔

حرفِ چہارم

دینِ برحق کی تحریک چاہے کسی مرحلے میں ہو، خاص طور پر دعوت کے ابتدائی یا ارتقائی مراحل میں، اس کے لیے ایسا جوش کارآمد ہے جو ہوش کے تحت رہ سکے، ایسا اقدام مفید ہے جو تدبر وتفکّر سے اٹھایا جائے، ایسا انقلابی عمل نتیجہ خیز ہے جو صبر وحکمت کا پابند ہو۔ ہر کام جو کیا جائے، پہلے اس کے متعلق شرعاً یہ سوچ لیا جائے کہ یہ کیسا ہے اور سنتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسّلام اور سنت صحابہؓ (خصوصاً خلفائے راشدین) رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روشنی میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ پھر اس کام کا پورا نقشہ تیار کیا جائے، سوچنے میں ملحوظ رکھا جائے کہ حامی قوتیں کون سی ہیں، مخالف کون سی اور ان کے درمیان کس طرح اقدام کیا جاسکتا ہے کہ حمایت میں اضافہ ہو اور مخالفت میں کمی، یا مخالفت زیادہ ہو بھی تو وہ دوسروں کی حمایت کو اور بڑھا دے۔ غور کر لینا چاہیے کہ کسی جنگ کے لڑنے کی صورت میں فتح ہوئی تو کیا ملے گا اور شکست ہوئی تو نتائج کیا ہوں گے؟ آپ کے مصروفِ کش مکش ہونے سے دوسری کون سی طاقتیں ہیں جو اپنا میدان پیدا کرنے کا فائدہ اٹھائیں گی؟ کس وقت کے حالات کیسے ہوں گے؟ کس مرحلے میں کیا طریقے کارگر ہوسکتے ہیں؟ پھر کیا کسی معرکے میں آپ کی قیادت آپ کے کارکنوں کو پابندِ حدود اور وابستۂ اخلاق رکھ سکے گی؟ آپ ظلم کو مٹانے کے لیے یا اسے کمزور کرنے کے لیے ظلم کا طریقہ تو اختیار نہ کریں گے، جھوٹ کے توڑ کے لیے جھوٹ سے تو کام نہ لیں گے، جبر وتشدد کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے خود تو جبر وتشدد کی حرکات نہ کرنے لگیں گے؟

یہ ساری چیزیں اگر وقت پر توازن سے نہ سوچی جاسکیں اور جوشِ اقدام اور جنونِ انقلابیت غالب آجائے تو آپ جو چاہیں کریں، آپ دینِ برحق کی اقامت کا حق اللہ کی نگاہ میں ادا نہیں کر سکتے۔

فیصلہ کن چیز تو آپ کا کردار ہے۔ کیا آپ کا کردار کسی مہم میں ایسا رہے گا کہ عوام متاثر ہو جائیں؟ پولیس اور جیل کا عملہ متاثر ہو جائے؟ بیوروکریسی کی صفوں میں آپ کے قدرداں پیدا ہو جائیں؟ اخبارات اور سیاسی لیڈر آپ کی دعوت کا لوہا ماننے لگیں کہ کیسی اعلیٰ دعوت اور مقدس نصب العین ہے جس نے اس درخشاں کردار کے ساتھ ظلم کے سامنے کھڑے ہونے والے انسان پیدا کیے ہیں؟

یہاں میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ۱۹۵۲ء کے قادیانی ایجی ٹیشن کے زمانے میں مولانا مودودیؒ جہاں ایک طرف قادیانیت کو دائرۂ اسلام سے باہر سمجھتے تھے اور حکومت سے یہ منوانا چاہتے تھے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے، وہاں وہ اس بات کے بھی سخت خلاف تھے کہ ایک تو مسئلہ دستور کی اسلامی بنیادیں طے کرانے کی لبِ بام پہنچی ہوئی تحریک کو موخر کر دیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ لاقانونیت کا راستہ اختیار کیا جائے۔ مولاناؒ پر اس زمانے میں سخت دباؤ تھا۔ بہت زیادہ بیرونِ جماعت سے اور کسی قدر خود جماعتی کارکنوں کی طرف سے بھی۔ لیکن مولاناؒ اپنے اصولی موقف پر چٹان کی طرح مضبوطی سے جمے رہے۔ مجھے اس مجلس شوریٰ کا حال یاد ہے جبکہ قادیانی ایجی ٹیشن کے متعلق جماعت کے رویے کا فیصلہ کرنے کی بحثیں ہو رہی تھیں اور بیچ بیچ میں ہر دو چار منٹ کے بعد کبھی فیصل آباد سے اور کبھی ملتان سے اور کبھی راولپنڈی سے اور کبھی لاہور کے کسی علاقے سے جوش انگیز خبروں کے ٹیلی فون آرہے تھے۔ اور جب آپریٹر کی کوئی چٹ پڑھ کر سنائی جاتی تو ذہنوں میں افکار کا سارا تانا بانا بکھر جاتا، مگر مولانا مودودیؒ ٹھنڈے دل سے چٹ ایک طرف رکھ کر زیرِ غور مسودہ کو پھر پڑھنے میں لگ جاتے اور اس کے الفاظ اور جملوں پر گفتگو ہوتی۔ ایک جملہ پورا ہوتا تو پھر اک ٹیلی فونی پیغام آجاتا اور پھر وہی صورت۔ مگر کام پھر اسی تدبّر و تفکر کے ساتھ ہونے لگتا جیسے پہلے ہو رہا ہوتا، یہاں تک کہ تحریر مکمل ہوگئی اور سب ارکان اس پر مطمئن ہو گئے۔

جذباتیت سے اس طرح ماورا رہ کر اصول پسند تحریکوں کے لیڈر اور مشیر اور کارکن حکمت و تدبّر سے کام کرتے ہیں۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ جسے یہ کام آئندہ کرنا ہو، تحریک خواہ کسی بھی مرحلے میں ہو، وہ اس طرح کے دل ودماغ لے کر آئے۔ جذباتی ہیجانات اور اندھے فیصلوں کے ساتھ دوسرے انقلاب چل سکتے ہیں، مگر اسلامی انقلاب کا کام نہیں ہوسکتا۔

حرف پنجم

اسلامی سیاست کی راہ پر کبھی کوئی منفی کام بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ مثلاً راستے سے کسی روڑے یا کانٹے کو ہٹا دینا تاکہ آگے بخوبی چلا جا سکے۔

لیکن اُصولاً اسلامی سیاست منفی سیاست نہیں ہے۔

منفی سیاست کے یہ معنی ہیں کہ آپ کا سارا زور اس بات پر ہو کہ فلاں کے دورِ اقتدار کو ختم کرنا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے کسی ''لا'' کے بعد ''اِلّا'' کیا ہوگا؟ برصغیر کی تاریخ میں آج تک ہر طرف سے طرح طرح کی جماعتیں منفی سیاست کی علم بردار بن کے کام کرتی ہیں۔ کسی حکمراں سے اذیت اٹھانے کے بعد وہ اس غرض کے لیے جمع ہو جاتی ہیں کہ اور جو کچھ ہو، اس شخص سے نجات ملے۔ حالانکہ ہمارا اصل کام یہ ہے کہ یا تو ایک اصول کو ختم کر کے اپنا دوسرا اصول غالب کریں، یا کسی شخص کے ہٹائے جانے کے بعد اس سے بہتر شخص کو کرسی پر بٹھانے کا قابلِ اطمینان منصوبہ رکھتے ہوں۔ ورنہ خالص منفی سیاست وہی رنگ اختیار کرے گی جیسا اس مشہور مقولے میں تھا کہ انگریزوں کے تسلط کو ختم کرنے کے لیے کتوں اور سوروں کے ساتھ بھی اتحاد کیا جا سکتا ہے۔

اس منفی سیاست کا ایک تجربہ ایوب خاں کا خاتمہ تھا۔ پھر قوم کو کیا ملا؟ یحییٰ خاں گیا تو ذوالفقار علی بھٹو کو چھوڑ گیا۔ بھٹو کے خلاف طوفان اٹھا اور ان کی کشتی الٹ گئی۔ پھر کیا ملا؟ ایک نیا مارشل لاء جس کی عمر مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ اس مارشل لاء کو ہٹا دیکھیے۔ اس کے بعد کیا ملے گا، یا تو ایک اور مارشل لاء یا ایسی جمہوریت جس کی لایعنیت کی مار کھا کر قوم پھر چیخ اٹھے گی۔ اس اندھے جوئے کے لیے ہم اتحاد قائم کرنے بھی چلیں تو اور نہیں تو کم سے کم نفاذِ اسلام کی شرط ساتھ ہو، کم سے کم مظلوم افغانوں کی ہمدردی وحمایت کی شرط ساتھ ہو، کم از کم انسانوں کو خدا کے عطا کردہ حقوق کی بحالی کی ضمانت ساتھ ہو، کم از کم منکرات وفواحش اور مخلوط معاشرے کے فروغ کے روک تھام کی یقین دہانی ساتھ ہو۔

کیا ایسے جوئے میں ایم آر ڈی سے اتحاد موزوں رہے گا؟ پیپلز پارٹی سے موزوں رہے گا؟ سوشلسٹوں اور سیکولرسٹوں سے موزوں رہے گا؟ تمام بھلی بری جماعتوں سے موزوں رہے گا؟

ہمارے کندھوں پر اُصولوں اور اعلانوں کا ایک پشتارہ لدا ہے۔ ہمارے تاریخی تسلسل کی روداد کا طومار ہماری بغلوں میں ہے۔ کتاب وسنت کی کسوٹیاں سامنے رکھی ہوئی ہیں۔ ان چیزوں کو چھوڑنے سے ہم موقع پرستوں (Opportunists) کی تعریف میں داخل ہو جائیں گے۔ ایک مرتبہ کا غلط اقدام ہماری پچھلی ساری تاریخ کو دریا بُرد کر دے گا اور ہمارے کردار کا برسوں پرانا کھرا سکہ کھوٹا ہو جائے گا۔

ہمیں یہ بھی زیرِ غور رکھنا ہے کہ ہزار ہا لوگ جو ہماری طرف محبت وعقیدت کی نظریں اٹھائے ہم سے رہنمائی لینا چاہتے ہیں، کیا ان کے ذہن پراگندہ نہ ہو جائیں گے؟

کسی گٹھ جوڑ کے بجائے جس کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ بے اصول اور آزادی پسند لیڈروں کا غلبہ قائم ہو جائے، ہمارے لیے ممکن اور صحیح راہِ عمل یہی ہے کہ ہم تنہا اپنی بازی اپنے شرائط پر کھیلیں اور دوسروں کو پاؤں رکھ کر چڑھنے کے لیے اپنا کندھا پیش نہ کریں۔ لیکن اگر اتحاد حالات کے تحت مفید اور ضروری ہی سمجھا جائے تو پھر صرف محبانِ دین ووطن کے ساتھ اتحاد کیا جائے۔

یوں بھی سارے اتحاد دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اگر اتحاد ہوا تو صدر صاحب جن لوگوں کو اپنی پارٹی قرار دے رہے ہیں (اور ان میں کچھ اور قوتیں بھی شامل ہیں) آنا تو ان کو ہے۔ پھر کیوں نہ اپنا کھیل صرف اپنے بل بوتے پر کھیلا جائے، خواہ چار پانچ یا دس پندرہ سیٹوں ہی کے لیے ہو۔

جب تحریک کی پالیسی اس بارے میں طے پا جائے گی تو میں بھی ہر دوسرے ساتھی کی طرح اسے قبول کروں گا ــــ بادلِ ناخواستہ یا خواستہ!

حرف ششم

اس دور میں ہر جگہ طلبہ کی نوجوان قوت کی اہمیت بڑھی ہے اور نوجوان قیادت کے غلغلے

بلند ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں جن لوگوں نے ان سلوگنوں کو بطور ایک نئے نظریے کے قبول کیا ہو، میں انھیں غلط سمجھتا ہوں۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی قیادت کے لیے بالعموم چالیس برس پورے کرنے پر انبیاءؑ کو دعوت الی اللہ اور قیادتِ جماعت (اور بعد میں سربراہیِ ریاست) کے لیے اٹھایا ہے تو پھر اسلامی اصولوں کے تحت اسلامی مقاصد کا کام کرنے کے لیے نوجوانوں کو خالدِ جاں بازؓ تو بننا چاہیے مگر صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کی جگہ نہیں لینی چاہیے۔ اوّل الذکر بزرگ نے خالد کو آگے بڑھایا وہ زور شور سے آگے بڑھے، مؤخر الذکر بزرگ نے ان کو یک لخت پیچھے ہٹا دیا، حضرت خالدؓ نے ادب سے اس حکم کے آگے سر جھکا کر اپنے آپ کو ایک عام سپاہی کی جگہ کھڑا کر لیا۔ نہ کوئی گلہ نہ کوئی شکایت، نہ احتجاج۔ پہلے بھی اللہ ہی کی رضا سامنے تھی، اب بھی اللہ ہی کی رضا سامنے تھی۔ پہلے بھی خلیفۂ اوّل کو امت کے قائد کی حیثیت سے واجب الاحترام سمجھا، بعد میں بھی خلیفۂ دوم کے حکم کی اطاعت نہایت ادب سے کی۔ حضرت خالدؓ نے تاریخ اسلام میں وہ عظیم الشان مثال چھوڑی ہے کہ آج کے ہر صاحبِ صلاحیت نوجوان لیڈر کو اس سے سبق لینا چاہیے۔

نوجوانوں کا کام ہے کہ والدین کا ادب کریں، اساتذہ کا احترام کریں، اپنے ہم مرتبہ نوجوانوں سے اختلاف کرتے ہوئے رواداری سے کام لیں، کوئی بات منوانے کے لیے تشدد سے کام نہ لیں اور احیائے اسلام کے کام کے لیے جو بزرگ میدان میں موجود ہوں (اور جن کے خلوص پر انھیں اعتماد ہو) ان سے رہنمائی لیں اور مشورے حاصل کریں اور وہ اگر کسی امر میں روک دیں تو اسلام کے ایک اطاعت پسند سپاہی کی حیثیت سے رک جائیں۔

اگر عمر کے ابتدائی جوشیلے مرحلوں میں دل و دماغ کو اس طرح سے تربیت نہ دی گئی تو آگے چل کر پھر اپنے آپ پر بریک لگانا ممکن نہیں ہوگا۔ پھر نوجوان قوت ایک چمکے ہوئے منہ زور گھوڑے کا روپ اختیار کر سکتی ہے۔ اگر ہٹلر کے طرز کا زلزلہ افگن کام کرنا ہو تو پھر ٹھیک ہے۔ مگر اسلام کے مطلوبات اور معیارات دوسرے ہیں۔

میں جب اس طرح کی باتیں نوجوانوں سے کہتا ہوں تو انھیں پسند نہیں آتیں، بلکہ انھیں خوشامدانہ لہجہ بہت مرغوب ہوتا ہے۔ لوگوں نے انھیں چاٹ ڈال دی ہے کہ ان کی منت سماجت ہوتی رہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اہم دینی اُمور اور بڑے بڑے معاملات واقدامات سے

متعلق اخلاقی تقاضوں کو ان پر اچھی طرح واضح نہ کرنا مداہنت ہے۔ میں اُن سے بہت محبت بھی رکھتا ہوں، مگر دینی معاملات میں ان سے مداہنت نہیں برت سکتا۔ چاہے میرے سامنے کیسے کیسے شاندار لوگ ان کو رام کرنے کے لیے، بہلانے پھسلانے کی تکنیک کیوں نہ اختیار کریں اور ان کے غلط کاموں پر بحث ہو تو صفائی کے وکیل کا پارٹ ادا کریں۔

یہ نوخیز قوت مجھے اس لیے عزیز ہے کہ شاید کل یہ لوگ تحریکِ اسلامی کے علم بردار بن کے اٹھیں گے، لہٰذا اسلامی ذہن کے نوجوانوں کو ایمان واصول اور اخلاق وشائستگی کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے اعتماد کے بزرگوں سے (جن کو بھی وہ پسند کریں) رہنمائی حاصل کریں اور تقاضا کریں کہ ہماری غلطیاں بھی ہمیں واضح طور پر بتائی جائیں تا کہ ہم ان سے پرہیز کریں اور ہمیں راہِ صداقت پر اقدام کے لیے صاف صاف لفظوں میں ہدایت بھی دیں تا کہ ہم ان کی پابندی کریں۔

اس معاملے میں جو شخص بھی نوجوان قوت میں کوئی غلط فکر بھر دے گا یا غلط جذبات و رجحانات ابھار دے گا، یا ترکِ جادۂ حق پر بھی ان کو تھپکی دے گا تو پھر وہ ان حرکات سے بپا ہونے والے ہر بگاڑ کا قیامت میں جواب دہ ہوگا جو ہمارے نوجوانوں کی زندگیوں اور ان کی کارکردگی میں نمودار ہو۔

دین ایک سرچشمۂ محبت

دین خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے اور اس میں انسانیت سے محبت کی روح کام کرتی ہے۔ دین خدا کی محبت کا سرچشمہ دلوں میں جاری کرتا ہے اور پھر اس سے محبتِ صداقت اور محبتِ انسانیت کے دھارے بہہ نکلتے ہیں۔ محبتِ انسانی کی معراج اخوت ہے:

فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا ۚ (آل عمران: ۱۰۳)

''پھر اس نے تمھارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے بھر دی اور تم بھائی بھائی بن گئے۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَاتَدۡ خُلُوا الۡجَنَّۃَ حَتّٰی تُؤۡ مِنُوۡا وَلَا تُؤۡ مِنُوۡا حَتّٰی تَحَابُّوۡا

(مسلم، کتاب الایمان۔ اقتباس از روایت ابو ہریرہؓ)

''تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک تم صاحبِ ایمان نہ بنو اور تم صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے جب تک تم آپس میں محبت نہ کرو۔''

صبر و تحمل، رواداری، ہمدردی، رحم دلی، ایثار، خیر خواہی، خاطر و مدارت، تواضع اور حلم وغیرہ بے شمار خوبیاں ہیں جن کے سوتے سرچشمۂ محبت ہی سے پھوٹتے ہیں۔ بصورتِ دیگر اگر نفسانیت کی گدلاہٹ چشمۂ دل میں پیدا ہو جائے تو پھر متذکرہ خوبیوں کے بجائے کبر، حسد، نفرت، انتقام، تصادم، اشتعال، غیبت، تشدد، جتھے بندیاں، سازشیں اور اس طرح کے دوسرے رذائل انسان کی زندگی پر چھا جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ہو سکتا ہے کہ اپنی ذات کے خول کو بڑا خوش نما بنائے رکھنے کے ماہر ہوں، مگر اس خول میں کوئی نہ کوئی منفی خصلت (ایک یا زیادہ) مخفی ہوتی ہے۔ اور بس کبھی کبھی وہ جھلک دکھا کر اپنے ہونے کی شہادت فراہم کر دیتی ہے۔

دینی محبت کے تقاضے

آنحضورؐ نے محبت کا ایک تقاضا یہ بتایا کہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند کرو، جو کچھ اپنے لیے کرتے ہو، یعنی تم اپنے ساتھ کیسا برتاؤ چاہتے ہو؟ تم دوسروں کی طرف سے کس لہجہ میں بات کرنا پسند کرتے ہو؟ تم کِبر اور تحقیر کو دوسروں کی طرف سے اچھا سمجھتے ہو؟ کیسی عزت اپنے لیے چاہتے ہو؟ کیا تمھیں اچھا لگتا ہے کہ بات بات پر لوگ تمھیں مجرم ٹھہرائیں؟ کیا تم ضد اور ہٹ دھرمی کے مظاہروں کو پسند کرتے ہو؟ کیا تم کو دھمکیاں دی جائیں تو تم خوش ہوتے ہو؟ کیا تمھیں گوارا ہوگا کہ لوگ تم پر تحکم کا ڈنڈا برسائیں اور تمھاری خودداری کو کچوکے دیں؟ کیا تمھاری طبیعت میں اس پر کوئی ردِعمل نہ ہوگا کہ لوگ مقام تکبر پر کھڑے ہو کر تضحیک و تمسخر کر کے اور ذرا ذرا سی جسمانی یا ذہنی کمزوری کو ہر طرف اچھال اچھال کر تمھیں احساس کمتری کے دلدل میں پھینک دیں؟ کیا تم اس رویے کو معقول کہو گے کہ تم سے تمھارے کام کے ساتھی، خواہ کمتر ہوں تعاون نہ کریں؟ کیا کسی بھی شخص کو یہ تجربہ پسند آئے گا کہ اس سے معاوضہ لے کر کام کرنے والے کام چوری کریں یا اس سے کام لینے والے کام تو خوب لیں مگر ادائیگی کے وقت حق ماری کریں؟ پس جو جواب تم ان سوالوں کا اپنے لیے چاہتے ہو وہی اپنے ہر بھائی کے لیے چاہو۔

محبت ذریعہ ہم آہنگی ہے، محبت ایک دوسرے کا احترام سکھاتی ہے، محبت دلوں کو جوڑتی ہے، محبت ازالۂ شکوک وشبہات کا ذریعہ بنتی ہے اور محبت پر ذہنی صحت مندی اور کردار کی مضبوطی کا انحصار ہے۔

محبت ہو تو آدمی اپنے اقرباء اور رفقاء کی خوبیاں اور اُن کے فضائل کی قدر کرتا ہے، ان کی کمزوریوں سے درگزر کرتا ہے اور اگر کسی کمزوری کی اصلاح مطلوب ہو تو ایسے خیر خواہانہ اسلوب سے ملاقات اور بات چیت کرتا ہے کہ اختلافات کے پہاڑ روئی کی طرح اُڑ جاتے ہیں۔

محبت دوسروں کے دلوں کو نرم کر دیتی ہے اور محبت ذہنوں کے بند دروازے کھول دیتی ہے۔ کسی کو بھائی کہہ کر (اور حقیقتاً سمجھ کر) بلانا، پاس بٹھانا، خود اس کے پاس چلے جانا، اس کے شکوک دور کرنا، اُس سے شکایت ہو تو خوب صورت طریق سے بیان کرنا، یہ سب کچھ بہترین نتائج کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

محبت ہوتی ہے تو آدمی دوسرے بھائی کو معاف کرنے کے لیے بآسانی رضامند ہو جاتا ہے اور محبت ہی یہ ترغیب بھی دلاتی ہے کہ ایک شخص خود آگے بڑھ کر دوسرے سے اپنی کسی غلطی پر معافی مانگے۔

محبت سے دل مالا مال ہو تو وہ کسی دوسرے کی کمزوری دیکھنے سے پہلے اپنے احوالِ دروں اور اعمالِ ظاہر پر بھی نظر ڈال لیتا ہے۔

محبت دوسروں سے خراج نہیں مانگتی بلکہ وہ اپنی طرف سے دوسروں کے لیے ایثار کرتی ہے۔

محبت ہو تو آدمی اپنے سے اوپر والوں کا احترام کرتا ہے اور اپنے سے نیچے والوں سے شفقت رکھتا ہے۔

محبت احترام آدمیت پیدا کرتی ہے اور ایک بھائی بڑے سے بڑے مرتبے پر ہو کر بھی کسی کو چھوٹا اور ادنیٰ قرار نہیں دیتا۔ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور سارے انسان اس کے دیے ہوئے اعزاز سے مالا مال ہیں، خصوصاً وہ لوگ جو کلمۃ اللہ کے قائل ہوں، وہ چاہے امیر ہوں یا فقیر ایک خاندان ہیں۔

محبت ہو تو سینے میں کسی کے لیے کینہ بھرا نہیں رہ سکتا۔ اور سینۂ بے کینہ سے جو بات نکلتی ہے وہ اثر رکھتی ہے۔

محبت، ذریعہ توسیعِ دعوت

محبت دعوتِ حق کو پھیلانے کے لیے بھی اشد ضروری ہے۔ جو شخص یہ کام کرنا چاہے اس میں اتنا حوصلہ ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کی طرف سے نہ صرف تنقید اور اعتراض ٹھنڈے دل سے سُنے بلکہ ان کی بدکلامی اور یاوہ گوئی کو بھی برداشت کرے۔

محبت کا جوہر پاس ہو تو آدمی دشمنوں سے بھی بات کرنے سے نہیں جھجکتا۔ لیکن اگر لوگوں سے نفرت ہو تو پھر بہترین طریقے بھی کارگر نہیں ہوتے۔ خیال رہے کہ نفرت کا دوسرا روپ غرور ہے۔ اگر آدمی اپنے متعلق یہ کہنے لگے کہ میں تو مقام پا گیا اور دوسروں کو نااہل اور احمق قرار دے تو نتائج وہی نکلتے ہیں جو نفرت سے نکلنے چاہئیں۔ نخوت اور نفرت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ غرورِ دنیا کی طرح غرورِ علم اور غرورِ ایمان اور غرورِ تقویٰ بھی تباہ کن ہے۔

محبت کی فضا میں دلائل کا وزن اور بڑھ جاتا ہے۔ جب کسی کو یقین ہو کہ ایک ایسا شخص مجھ سے بات کر رہا ہے جس میں نہ کبر ہے، نہ تحقیر ہے، نہ وہ کسی اونچائی پر کھڑا ہو کر بول رہا ہے، بلکہ وہ مجھ تک محض اس لیے ایک پیغامِ فلاح پہنچا رہا ہے کہ اُس کے دل میں محبت اور خیر خواہی ہے تو وہ بات سنتا ہے اور اس سے اثر لیتا ہے۔ اگر فوراً نہیں تو کچھ مدت کی مساعیٔ پے بہ پے کے نتیجے میں اس کے اندر تبدیلی نمودار ہوتی ہے۔

لوگ جب ایک دعوت کے علم برداروں میں ایک مدت تک محبت کا نور جلوہ فرما دیکھتے ہیں، کوئی جھگڑا ان کے سامنے نہیں آتا، کوئی گالم گلوچ اور ہاتھا پائی نہیں ہوتی، اختلافات پر رسّہ کشی کا تماشا دکھلائی نہیں دیتا، کہیں وہ ان کی الگ الگ ٹولیوں میں کُھسر پُھسر کا دور چلتا نہیں پاتے تو پھر وہ ایسے لوگوں کے مجموعی طرزِ عمل سے متاثر ہو کر آہستہ آہستہ اُن کے قریب ہوتے اور ان کی دعوت قبول کرتے ہیں، کیونکہ ایسے ہی لوگوں کے درمیان رہ کر اور اُن سے تعلقات بڑھا کر ذہنی سکون مل سکتا ہے۔

صاحبِ دعوت کے طرزِ عمل کے کسی پہلو میں محبت کے بجائے اگر نفسانیت کارفرما ہوئی ہے تو خوش نما ساحرانہ لفاظیوں سے اوّل تو کوئی بڑا نتیجہ نہیں نکلتا اور اگر اِکاّ دُکاّ افراد جذباتی اثر لے بھی لیتے ہیں تو اندر چھپی ہوئی غلاظتوں کے وہ جس قدر قریب جاتے ہیں اور اُن کی بدبو اور سڑاند محسوس کرتے ہیں تو وہ یا تو ساتھ چلتے ہوئے خود بھی بگڑتے ہیں اور دوسروں میں بھی مزید بگاڑ پیدا کرتے ہیں، یا پھر وہ کوسوں دور بھاگتے ہیں اور پھر کوئی خوش نما نعرہ اور کوئی پرجوش مظاہرہ ان کو کھینچ کے واپس نہیں لا سکتا۔

احتیاط کیجیے کہ کوئی بھی شخص جو اپنے قول یا عمل سے کسی کو دین سے دور یا بالکل بے گانہ کر دیتا ہے، وہ خدا کے ہاں دوہرا مجرم ہوگا۔ خدا بچائے!

محبت میں انسانوں کے لیے کشش ہے ـــــ بیوی بچوں کے دائرے میں، پڑوسیوں اور دوستوں کے دائرے میں، رفیقوں اور ہم سفروں کے دائرے میں، ایک دفتر اور ایک ادارے میں مل کر کام کرنے والوں کے دائرے میں، محبت نہ ہو تو آدمی کی شخصیت دوسروں کو دور دھکیلنے کا سبب بن جاتی ہے۔

یہ کشش جب کم ہو جاتی ہے تو لوگ چھوٹے چھوٹے قواعد اور ضابطوں کی کسی ایک تعبیر کی آڑ لے کر مشکل سے حاصل شدہ قیمتی افراد کو پل بھر میں دور پھینک دیتے ہیں، حالانکہ اہلِ دعوت

کا اصل کام یہ ہے کہ وہ تھوڑی سی خوبیاں رکھنے والے انسانوں کو بھی اپنی طرف کھینچیں، پھر اور قریب کریں، یہاں تک کہ اُن کو جذب کرلیں۔ خدا معاف کرے، اگر اچھی صلاحیتوں کے کسی آدمی کو ذراسی ناپسندیدگی یا جتھابندی کی وجہ سے دور پھینکنے کے باعث بنے ہوں۔

پس خدا کے دین کی دعوت دینے والے لوگ اگر الفتِ قلوب اور مقامِ اخوت تک پہنچنے میں کوتاہ رہ جائیں تو وہ درحقیقت اپنی دعوت اور مقصد کو نقصان پہنچانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ خدا جس کام کے لیے " کُونُوْا اَنْصَارَاللّٰہ " کہہ کر پکارتا ہے اس کے لیے وہ بالکل غیر موزوں ثابت ہوتے ہیں۔ اس بھاری ذمہ داری کو اٹھا کر پھر، نااہل ثابت ہونا ایک ایسے خسران تک پہنچاتا ہے کہ جس کی تلافی ممکن نہیں۔

اجتماعیت کی ضرورت

محبت خود اجتماعیت کی بھی ایک ضرورت ہے۔

اول تو قسم قسم کے کِبر اور طرح طرح کی کدورتیں رکھنے والے لوگ کبھی جمع ہو کر کوئی ٹھوس نظم بنا ہی نہیں سکتے ،لیکن اگر بنا بھی لیں تو اسے چلا نہیں سکتے اور اگر انھیں پہلے سے کوئی بنا بنایا دینی نظامِ محبت واخوت مل جائے تو وہ اپنے طرزِ عمل کے چند جھٹکوں سے اس کے بھی انجر پنجر کو ہلا کر رکھ دیں گے۔ جماعتوں اور تنظیموں کے ایسے بے شمار تجربات گزشتہ تاریخ میں بھی ہیں اور آج کے دور میں بھی۔

وہ بھی محبت ہی ہوتی ہے جو رہنماؤں اور ذمہ دار اصحاب کے ساتھ ارکان اور کارکنوں کو جوڑتی ہے اور اُن کے دلوں میں اپنی صفِ اوّل کا خاص احترام پیدا کرتی ہے۔ جواباً رہنماؤں اور ذمہ دار حضرات کا بھی فریضہ یہ ہے کہ ان ارکان اور کارکنوں سے مشفقانہ محبت رکھیں جن کے جوڑنے سے اجتماعیت کی ایک مشینری بنی اور چل رہی ہے اور ان میں سے ہر فرد اُن کی بڑائی اور عظمت اور ان کے احترام کا اعتراف کرتے ہوئے اور ان سے محبت رکھتے ہوئے ان کے احکام کو تسلیم کرتا ہے۔ واضح رہے کہ اصل بڑائی ایمان، علم، کردار اور رویوں سے ثابت ہوتی ہے۔

کوئی شک نہیں کہ عمائد واکابر کو کبھی نہ کبھی کسی خرابی کا ازالہ کرنے کے لیے سخت احکام بھی دینے پڑتے ہیں۔ اور وہ سب محبتِ صداقت اور محبتِ اجتماعیت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

مگر دین کے لیے جو رضا کارانہ اجتماعیت کام کررہی ہوتی ہے اس میں اگر اکثر و بیش تر تحکم کا طریقہ اختیار کیا جانے لگے، لوگوں کی بات نہ سنی جائے، اُن کی معقول شکایات کا اعتراف کر کے اصلاح کرنے کا جذبہ نہ ظاہر کیا جائے، ان کو اطمینان بخش جواب نہ دیے جائیں، ان کے جائز حقوق کو وزن نہ دیا جائے، ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ نہ کیا جائے تو آہستہ آہستہ پھر سارا نظامِ سمع و طاعت ایک مشینی سیاست کاری بن جاتا ہے جس میں بے جان پرُزے مل کر ایک حرکت کرتے ہیں، مگر ان میں انسانی نظم کی اصل روح باقی نہیں رہتی۔

لوگ اگر تنقید و احتساب کریں تو محبت باہمی کا تقاضا یہ ہے کہ خندہ پیشانی سے ان کے احساسات کو معلوم کیا جائے، کوئی غلط فہمی ہو تو انھیں مناسب طور سے بات سمجھا دی جائے، اگر ان کے اُٹھائے ہوئے نکات کا کوئی جزو بھی برحق ہو تو اُن کے سامنے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُس کا اعتراف کیا جائے یا کسی خرابی یا کمزوری کے ازالے کی فکر کی جائے، بلکہ علو مرتبہ تو یہ ہے کہ خود دعوتِ تنقید و احتساب دی جائے اور اگر کوئی بات کرنے میں جھجکے تو اس کی ہمت افزائی کی جائے کہ دل جمعی سے اپنی پوری بات کہو۔

خاص احتیاط یہ کی جائے کہ کسی خاص امر میں استدلال کرنے کے حق کو اکابر مناظرہ و مباحثہ کی شکل نہ دیں اور مخاطب کو لفظوں اور جذبوں سے گھیر گھار کر زچ کرنے کی کوشش نہ کریں۔

اجتماعیت کی لازمی صورت شورائیت ہے۔ اس سطح پر بھی جب دس پچاس افراد یکجا ہوتے ہیں تو پیشِ نظر موضوعات پر لوگوں کی رائیں مختلف ہوتی ہیں۔ اندازِ بیان مختلف ہوتے ہیں، لب ولہجہ مختلف ہوتا ہے۔ ایسی مجالس میں تنقید و احتساب کے مراحل بھی آتے ہیں، لیکن یہ ساری چیزیں جس قوت سے صاف ہوجاتی ہیں وہ دلائل وحقائق کے اندر کام کرنے والی محبت ہوتی ہے۔

اجتماعیت میں کبھی کبھار خاص خاص نزاعات بھی نمودار ہوتی ہیں اور ان کو یا تو مصالحانہ طریق سے حل کرنا ہوتا ہے یا عدالتی طریق سے۔ اور ہر دو طریقوں میں وہی جذبۂ محبت (محبتِ خدا اور محبت صداقت اور محبتِ رفقاء) کارفرما ہونا چاہیے۔ ایسی کارروائی میں ہر فریق کو یہ احساس ہو کہ اس کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے اور کسی شخص کے ساتھ عمر یا علم یا عہدے کی بنا پر کوئی خاص رعایت روا نہیں رکھی گئی ہے، نیز کسی کی غلطی کے بالمقابل اس کی خدمات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اس جوہرِ محبت سے خالی جب کوئی شخص میدان میں آتا ہے تو اچھی خاصی اجتماعیت کو بکھیر دیتا ہے اور جب کوئی دوسرا شخص پیکرِ محبت بن کر ذمہ داری سنبھالتا ہے تو بکھرتے ہوئے تارے مل کر پھر کہکشاں بن جاتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ مجموعی طور پر ہمارا دعوتِ دین کا کام اور اقامتِ دین کی تحریک اور اس کے لیے اجتماعیت کا دروبست متذکرہ جذبۂ محبت ہی کے بل پر چل رہا ہے اور وہی سب کو جوڑنے والی روح ہے۔

یہ گفتگو تو محض برائے تذکر ہے کہ نفسانیت کو پروان چڑھانے والے اس مادہ پرستانہ دور میں ہم خدا کی محبت، صداقت کی محبت اور انسانوں (خصوصاً رفقائے مقصد) کی محبت کا سرمایہ اپنے خزانۂ روح میں کم نہ ہونے دیں۔

یہ یاد دہانی اس لیے ضروری معلوم ہوئی کہ خود ہمارے وطن میں زر پرستی، عیش پسندی، جرائم، قتل وغارت، تباہ کاریاں، تخریبی کارروائیاں اور بات بات پر تشدد عام ہو رہا ہے۔ اور اختلافات کو حل کرنے کے بجائے ہر کوئی اپنے نقطۂ نظر پر ڈٹ کر دوسرے کا مقابلہ کرتا ہے۔ پولرائزیشن کی یہ بیماری سیاست، مذہب اور روزمرہ کی زندگی کے معاملات میں پھیل گئی ہے۔

اُدھر جس انسانیت کی محبت یہ تقاضا کرتی ہے کہ اُس کی اصلاح کی ذمہ داری بھی داعیانِ حق سنبھالیں، وہ سپر پاورز اور جدید مادہ پرستانہ تہذیب کے تسلط سے زار و نزار ہو چکی ہے۔ علم جہالت کی نئی تاریکیاں ساتھ لایا ہے۔ سائنس نے انسان کو عقل پرستی کی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے، ٹیکنالوجی نے اپنے صنم کدے میں اسبابِ تعیش کے سامانوں کے بت بنا کر رکھ دیے ہیں اور ان کی پوجا کرائی جا رہی ہے۔ عورت کو آزادی اور ترقی اور مساوات کے نام پر گھروں سے نکال کر سرمایہ دار کے روپے کے زور سے اسفلیت کی انتہائی گندگیوں میں گھسیٹا جا رہا ہے، ملکوں کے ٹکڑے ہو رہے ہیں، قوموں کو لڑایا جا رہا ہے۔ اسلحہ کے انبار لگائے جا رہے ہیں۔ جرائم کا وہ زور ہے کہ کسی گزرے ہوئے دورِ وحشت میں بھی نہ تھا۔ ہر وعدے میں مکر کی آمیزش اور ہر دوستی میں دشمنی کا زہر شامل ہے۔ نہ قوموں کو قوموں سے محبت ہے اور نہ افراد کو افراد سے۔ ادبی تحریروں میں بڑے اینچ پینچ ہوتے ہیں، صحافتی نگارشات میں نت نئے تضاد رُونما ہوتے ہیں، حکام اور لیڈروں کے انٹرویو اور بیانات اور پھر حریفانہ جواب اور پھر تردیدیں ایک ایسا گرداب پیدا کرتی ہیں جس میں سچائی کی

کشتی تو بالعموم ڈوب جاتی ہے، ہاں کچھ بلبلے پانی کی سطح پر ایسے رہ جاتے ہیں جو بڑے دل کش معلوم ہوتے ہیں۔

آج کے معاشروں میں سیلزمینوں کا میٹھا تکلم رہ گیا ہے یا ایئر ہوسٹسوں کا مصنوعی تبسم۔

کرۂ ارضی کے تمام انسان قسم قسم کی جھوٹی خدائیوں کے پجاری ہیں اور ہر کسی پر خوف وغم، حسرت وارمان، یاس وقنوط، قلق واضطراب اور انتشار والتہاب کی وباؤں کا شدید حملہ ہے۔

اس قسم کی فضا کے محافظوں کے خلاف کبھی اگر کسی ملک اور زمانے میں جہاد کرنا پڑتا ہے تو اُس میں ان ہزار ہا انسانوں کو بچانے کے لیے محبت انسانیت کام کر رہی ہوتی ہے۔ جو اس فضا میں پس رہے ہوتے ہیں۔

اے وہ لوگو جو ساری نوعِ انسانی کو کینہ ونفرت اور مفاد و تعیش اور تشدد و جرم سے بھرے ہوئے اس ماحول سے بچا نکالنا چاہتے ہو، خدا کے لیے تاریکی میں ڈوبی ہوئی انسانیت کے سامنے محبتِ خدا اور محبت صداقت اور حمیتِ انسانیت کے چراغ روشن کرو۔ اگر تم نے خود اپنے اندر یہ چراغ گل کر لیے، اپنے ہی دلوں کے گرد دھواں دھاری پیدا کر دی اور آہستہ آہستہ تم خود ہی بحرِ ظلمات میں ڈوبتے چلے گئے تو پھر اربوں انسانوں کو کون سہارا دے گا؟

کُونُوا عِبَادَ اللّٰہِ اِخوَانًا۔

داعیانِ حق کا کردار

دعوت الیٰ اللہ کی باتیں کرتے کرتے اور اُن کے بارے میں سوچتے سوچتے ایک سوال سامنے آیا کہ داعیانِ حق کا کردار کیا ہونا چاہیے۔ یوں تو داعیانِ حق کے کردار کا تصور اتنا وسیع ہے کہ اس میں ایک مومن متقی کے سارے ہی اوصاف آجاتے ہیں، خصوصاً قرآن نے اپنے انسان مطلوب کے جابجا جو صفاتی خاکے پیش کیے ہیں ان کو ہر اس شخص کے لیے معیار بنانا لازم ہے جو خدا کی راہ میں کوئی دعوتی کام کرنا چاہتا ہو۔ یہاں ہم صرف چند ایسے امور کا ذکر کریں گے جو دعوتی لحاظ سے اصولی اہمیت رکھتے ہیں۔

پہلی بات

ہم جو دعوت الیٰ اللہ، شہادتِ حق یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مصروف ہیں تو یہ کسی مفاد یا شہرت یا تفریح کے حصول کے لیے ہمارا کوئی ذاتی کام نہیں ہے جسے ہم نے خود ہی سوچا ہو، اس کی راہیں خود ہی تجویز کی ہوں اور اپنے مفاد اور جذبات کی ضروریات کے تحت اُس کے اصول و مقاصد خود ہی متعین کیے ہوں اور پھر جب جس چیز کو چاہیں بدل کر کوئی اور تجربہ کرلیں۔ یہ خدا کا اپنا کام ہے اور اسی نے اس کام کو کرنے کا اپنے بندوں سے مطالبہ کیا ہے، اسی نے اس کے اصول و مقاصد مقرر کیے ہیں، پس اس کام کو جو لوگ کرنا چاہیں وہ نفسانیت سے اس معنی میں بھی پاک ہوں کہ وہ اپنی امنگوں اور جذبات کی تسکین کی فکر نہ کریں اور اس لحاظ سے بھی پاک ہوں کہ وہ خدا اور رسولؐ سے ہدایات لینے کے بجائے اپنے لیے خود ہی طور طریقے وضع نہ کرلیں۔ اجتہادی تدابیر کا میدان ہر شعبۂ کار میں شریعت نے رکھا ہے، مگر ایک تو اصول و حدود واضح طور پر طے

کردیے ہیں اور دوسرے کسی ایسے اجتہاد کا کوئی جواز نہیں چھوڑا جو شرعی اصول وحدود کے دائرے سے باہر نکل جائے۔ گویا یہ مقام اخلاص کا مقام ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا کام اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں پر اللہ کے لیے کیا جائے۔ کام اگر اللہ کا نہ ہو تو بھی سب کچھ غارت، اللہ کے مقررہ طریقوں پر نہ ہو تو بھی عبث اور اللہ کے لیے نہ ہو تو بھی ہباءً منثوراً۔

دوسری بات

قرآن وحدیث کی تعلیمات وتلقینات تقاضا کرتی ہیں کہ جنھیں اللہ کا بتایا ہوا کارِ دعوت کرنا ہو وہ اللہ سے گہرا دلی رشتہ استوار کریں، اس کی عبادات پوری کریں، اس کے لیے حمد وثناء کریں، اس کا ذکر جاری رکھیں، اس کے سامنے بار بار اپنا دل کھول کر رکھیں، اپنی ناچیز خدمات کی قبولیت کی تمنا کریں، اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر اُس سے معافی مانگیں، اس کے لیے نوافل ادا کریں، اس کی راہ میں مال خرچ کریں، اس کی مسجدوں سے لو لگائیں، اس کے بندوں کے لیے خادم بنیں اور جانیں کہ دعوتِ الی اللہ سب سے بڑی خدمتِ خلق ہے۔ قرآن کو بار بار پڑھیں اور جو اصولِ دعوت اس میں مذکور ہیں اور داعیانِ حق کی جو ذمہ داریاں بیان ہوئی ہیں اُن کو سمجھیں اور اختیار کریں، نیز انبیاء وصلحاء کے نمونے کے کاموں سے روشنی لیں، احادیث اور سیرت کے مطالعے سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ وصحابیات کی خدماتِ دعوتِ حق کا شعور و ادراک پائیں، جن جن اُمور پر حضورؐ نے تربیتِ صحابہ کے دوران میں گرفت کی یا جن رویوں کی اصلاح کی اُن کو الگ الگ رکھ کر سمجھیں۔ اس سلسلہ میں ائمہ وعلماء نے جو لٹریچر تیار کیا ہے، اُسے پڑھیں۔

خدا سے تعلق اگر اس طرح کا گہرا نہ ہو بلکہ دو چار سجدوں اور دس پانچ اجتماعات ہی پر سارا دارومدار رکھا جائے تو اندیشہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں سرگرم ترین داعیانِ حق کسی نہ کسی امتحانی مرحلے میں پھسل جائیں گے اور ایسی چوٹ کھائیں گے کہ کیا کرایا سارا کچھ درہم برہم ہو کے رہ جائے گا۔

خدا اور رسولؐ سے گہرا اور سچا قلبی تعلق رکھنے والا آدمی قرآن وحدیث کی کوئی بات سن کر موجودہ عدالتی نظام کے وکلاء کی طرح بحثیں اور تاویلیں نہیں کرتا، بلکہ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَاللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ (الانفال:۲) ''یہ ہیں وہ لوگ کہ جن کے سامنے جب اللہ کی

باتیں کی جاتی ہیں تو ان کے دلوں پر اس کی ہیبت چھا جاتی ہے۔'' خدا کا ذکر سن کر سچے خدا پرستوں کے دل لرز اٹھتے ہیں، اور وہ قرآن سنانے والے سے الجھنے کے بجائے یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کہیں واقعی ہم سے کوئی خلاف ورزی تو نہیں ہوگئی۔ ایسے مواقع پر معاملہ اپنا دفاع کرنے کا نہیں ہوتا (اگرچہ کبھی کبھار اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے جبکہ بات کرنے والا قرآن کے منطوق کو صحیح نہ سمجھ رہا ہو یا وہ مخاطب کے متعلق غلط فہمی رکھتا ہو) بلکہ ضرورت اپنا احتساب کرنے کی ہوتی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ایسی مثالیں شاید شاذ ہی ملی ہوں گی کہ کسی نے آیت یا حدیث کو سن کر یہ کہا ہو کہ میں اس کے آگے سر تسلیم خم کر کے اپنے موقف سے دست بردار ہوتا ہوں یا اس لمحے مجھ پر منکشف ہوگیا کہ فلاں معاملے میں میرا طرزِ فکر غلط تھا۔ آدمی کی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنا دفاع جھگڑالو[۱] ہونے کی حد تک کرتا ہے۔ لیکن یہ کیفیت گہرے تعلق باللہ کی عدم موجودگی میں ہوتی ہے۔ داعیانِ حق کو خیال رکھنا چاہیے کہ قرآن کو ہماری دعوت اور اجتماعی سرگرمیوں کے اوپر اوپر سے نہ گزر جانا چاہیے اور ہمیں اور ہمارے کام کو قرآن کی حقیقی برکات سے محروم نہ رہ جانا چاہیے۔

تیسری بات

دعوتِ حق کے بیج سے یقیناً ایک سیاست بھی نمودار ہوتی ہے اور ایک نظام بھی پیدا ہوتا ہے، مگر فی نفسہٖ دعوت ایک سیاسی مشغلہ نہیں ہے۔ اور ہمارے ہاں تو خود سیاست بھی ایک دینی فریضہ ہے، لہٰذا سیاست بھی غیر سیاسی ہے۔ غیر سیاسی سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ کوئی خانقاہی سرگرمی ہے اور اس میں کش مکش کا کوئی دخل نہیں، بلکہ اصل مدعا یہ ہے کہ جس ذہنیت اور جس اسلوب سے دنیا کے سیاست کار اور سیاست باز سیاست چلاتے ہیں وہ ہمارا طریقہ نہیں ہے۔ ہماری سیاست کا بھی اپنا ایک نہج ہے۔ ہمارا سیاسی سرگرمی سے مقصود بھی رضائے الٰہی ہے، جس کا معیاری مرتبۂ حصول ''وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ''[۲] کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ہاں تو اصل بات ہو رہی تھی دعوت کی ـــــ باوجودیکہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور کفر بالطاغوت کی دعوت کامل درجے کی سیاسی نوعیت رکھتی ہے، مگر اس کا طریقۂ فروغ مروجہ طرز کی سیاسی جدوجہد سے مختلف ہے۔

---

[۱] وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (الکہف: ۵۴)

[۲] اور دین (نظام اطاعت) سارے کا سارا اللہ ہی کے لیے خاص ہو جائے۔ (الانفال: ۳۹)

ہماری دعوت اصولی طور پر نعرہ بازی کا سلسلہ ومشغلہ نہیں ہے، یہ کوئی دھونس جمانے کا ہتھیار نہیں ہے بلکہ دعوت کا سارا کام معلمانہ نوعیت کا ہے۔ سچا معلم خلقِ خدا سے گہری محبت رکھتا ہے، وہ لوگوں کا بہترین خیر خواہ ہونے کی وجہ سے ان کی دنیا کو بھی سنوارنا چاہتا ہے اور ان کی عاقبت کو بھی۔ جیسے کہ پہلے کہا گیا، یہ اول درجے کی خدمت ہے۔ داعیِ حق جہاں بات ماننے والوں کو سینے سے لگاتا ہے، وہاں وہ نہ ماننے اور مخالفت کرنے والوں کو بھی یہ الاؤنس دیتا ہے کہ "اِنَّھُمْ لَایَعْلَمُوْنَ"[۱] انھیں اپنے بھلے برے کا پتہ نہیں ہے۔ ان کی سمجھ سے ابھی تک یہ بات بالاتر ہے کہ خدا کے دین کا پیغام ان کو بیڑیوں اور بوجھوں سے نجات دلانے کے لیے ہے۔ وہ گالیاں دینے، استہزاء کرنے اور ظلم ڈھانے والے مخالفین کے لیے بھی یہی سوچتا ہے کہ یہ لوگ سالہا سال سے باطل افکار اور غلط عادات ورسوم کے جادو سے مسحور ہیں اور اس جادو کے ٹوٹنے میں دیر لگ سکتی ہے۔

چوتھی بات

اس معلّمانہ اور محبانہ کام میں صبر ایک شرطِ لازم ہے۔ اپنے صحیح کام پر اور اس کے اصولوں پر جمے رہنے کے لیے صبر چاہیے اور دوسروں کی زیادتیوں کے جواب میں ہاتھ نہ اٹھانے کے لیے صبر چاہیے۔[۲] وہ لوگ جو دعوت کا معلّمانہ کام کرتے ہوئے دوسروں کی فضول باتوں یا ان کے مظالم پر اشتعال میں آجائیں اور مخالفین سے انتقام لینے لگیں، وہ اپنے متعلق ثابت کردیتے ہیں کہ وہ خدا کے دین کی طویل اور مردافگن مہم میں صحیح حصہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ مخالفین

---

[۱] غزوۂ اُحد کے موقع پر حضورؐ سے کہا گیا کہ ان دشمنوں کے لیے تباہی کی دعا کریں، تب حضورؐ نے جو جواب دیا اس کا ایک جملہ یہ تھا کہ میری قوم کے یہ لوگ (مجھے اور دین کو) جانتے نہیں ہیں۔

[۲] مرحلۂ جہاد کی بات کو بعض لوگ دعوت کی مہم پر منطبق کرتے ہیں، حالانکہ جہاد بہ معنی قتال ایک ایسی جماعت کرسکتی ہے جس کی قیادت اغیار کی مداخلت سے آزاد ہو اور اس جہاد کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ کارِ دعوت کو اتمامِ حجت کی حد تک پہنچا دیا گیا ہو۔ پھر قتال محدود ہوتا ہے میدانِ جنگ تک۔ نہ یہ کہ جو بات نہ مانے وہ جہاں ملے اس کا سر اڑا دیا جائے۔

دعوت اس معنی میں جہاد ہے کہ یہ غلط بنیاد پر قائم معاشرے اور نظام کو چیلنج کرتی ہے، نیز استبداد کا مقابلہ صبر سے کرنے کی تربیت دے کر اپنے علم برداروں کو خوف اور مرعوبیت کی حالت سے باہر نکال لیتی ہے۔ دعوتِ حق اس معنی میں بھی جہاد ہے کہ یہ ماحول کے ساکت سمندر میں تموج پیدا کرتی ہے اور کام اگر بڑھتا جائے تو یہی تموج طوفان بن کر ساحل سے ٹکرانے لگتا ہے۔

کی غلطیوں کو اپنی غلطیوں کے جواز کی دلیل بنانا داعیانِ حق کا کام نہیں ہے۔ داعیانِ حق میں اتنا ظرف ہونا چاہیے کہ وہ یاس انگیز مخالفانہ ماحول میں کبھی گھبرائیں نہیں، گھبرا کر جذباتی توازن نہ کھوئیں، مخالف افراد اور اداروں کے ذرائع و وسائل اور قوتوں سے مرعوب نہ ہوں، معاندوں کی اشتعال انگیز حرکات سے بارود کی طرح بھک سے نہ اُڑ جائیں، بلکہ یقین رکھیں کہ خیر خواہی اور نیکی کے جذبے سے بے لوث کام کرنے والے جب تک مظلومی کے مقام پر رہتے ہیں اُن کا پیغام پھیلتا جاتا ہے اور اُن کے لیے ہمدردیاں بڑھتی جاتی ہیں، اُن کے لیے غیر جانبدار عناصر میں بھی اور خود مخالف گروہوں میں بھی ایک دھیمی دھیمی اور دبی دبی حمایت نشو ونما پاتی رہتی ہے جو خاصی دیر میں کسی خاص موقع پر سامنے بھی آجاتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر داعیانِ حق دسیوں سال صابرانہ کام کرتے کرتے کسی ایک موقع پر جارحانہ یا ظالمانہ اقدام کی تہمت کا نشانہ بن جائیں تو انھیں بہت بڑا نقصان پہنچتا ہے، خواہ وہ نقصان ابتداء میں پوری طرح واضح نہ ہو۔ معلم اگر ایک بار تھانے دار کا ڈنڈا حرکت میں لے آئے تو پھر محبت و خدمت کی بنا پر حاصل ہونے والی قدر و قیمت میں ایسی کمی آجاتی ہے جس کا پورا ہونا تادیر مشکل ہو جاتا ہے۔ جب تک دعوت دینے کا کام کرنا ہو، مظلومانہ مقام پر رہ کر خوشی خوشی سے زخموں کو سینے سے لگائے رہیے اور مظالم کے حسابات چکانے کا کام اللہ پر چھوڑ دیجیے (عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَعَلَیۡنَا الۡحِسَابُ○: رعد:۴۰) اور اگر "اَنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ ۙ وَالۡعَیۡنَ بِالۡعَیۡنِ" (المائدہ:۴۵) کے اصول پر آپ اپنے حسابات روز کے روز چکانا چاہتے ہوں تو پھر اسی کام میں لگے رہیے، دعوتِ حق کی علم برداری کو دوسرے مناسب لوگوں کے لیے چھوڑ دیجیے۔[۱]

---

[۱] مطلوب اتنا بے حس اور بے حمیت ہو جانا بھی نہیں کہ آدمی کسی بے جا زیادتی کرنے والے سے پوچھ ہی نہ سکے کہ آخر یہ جرأت تم نے کیسے کی؟ چور چوری کرے تو خود اٹھا کے سارا سامان اس کے حوالے کر دے، آپ کا پرس دیکھ کر کسی کا جی للچائے اور وہ اسے اڑانے کی مختلف تدبیریں سوچ رہا ہو تو آپ نیازمندی سے اس کے سامنے ہدیہ کر دیں، کوئی بچہ فروش کسی بچے کو ورغلانے لگے تو کسی طرح کی مزاحمت نہ کی جائے۔ مدعا صرف یہ ہے کہ دعوت کے دائرے میں چھوٹی چھوٹی زبان درازیوں، قابلِ برداشت حد تک تھوڑی بہت زیادتیوں اور رویّے کی پستیوں کو گوارا کر لیا جائے۔ یہ قربانی بڑے مقصد کے لیے ضروری ہے۔ نہ یہ کہ ایک گال پر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا بھی پیش کر کے درخواست کی جائے کہ ذرا اور بھی نواز دیجیے۔

پانچویں بات

داعی کوئی فرد ہو یا کوئی گروہ، برسوں میں اس کا کردار ایک خاص شکل اختیار کرتا ہے اور وہ اپنے امتیازی خدوخال کے ساتھ پہچانا جاتا ہے ـــــ اس کردار کا بنیادی ڈھانچہ صدق، دیانت اور عدل کی صفات سے بنتا ہے۔ اس کردار سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا اور اُسے بغیر مسخ کیے برقرار رکھنا، شروع سے آخر تک صبر چاہتا ہے، مثلاً سچ بولتے بولتے اگر ایک بار...... داعیِ حق فرد یا گروہ جھوٹ بول دیتا ہے تو گویا وہ اپنے برسوں کی پرورش کردہ کردار کو خود ہی ایک ایسا زخم لگاتا ہے جسے کوئی مرہم مندمل نہیں کرسکتا۔ اسی طرح عدل کا تقاضا یہ ہے کہ دوسروں کی برائیوں کے ساتھ اُن کی خوبیوں کا بھی اعتراف کیا جائے اور دوسروں کو ان کی غلطیوں پر ٹوکنے والے داعیوں کو خود اپنی غلطیوں پر زیادہ سختی سے گرفت کرنی چاہیے۔ دوسروں کا احتساب کرنے کی بھی ضرورت پیش آسکتی ہے، مگر اپنا احتساب کرنا تو شرعی ذمہ داری ہے۔ ضمیر اگر زندہ ہو تو نہ اس کی آواز کو دبایئے اور نہ اس کے منہ میں مٹی ڈالیے، بلکہ اس کی آواز کو اپنی آواز بنا کر اعتراف کر لیجیے کہ ہم سے غلطی ہوئی۔ اور جس کے حق میں غلطی ہوئی ہو اس سے معافی مانگ لیجیے۔ دنیا میں ایک طریقہ یہ بھی رائج ہے کہ کسی بڑی کوتاہی اور غلطی پر لوگ قیادت یا عہدوں سے مستعفی ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے استعفے بھی دراصل اس بات کا اعلان ہوتے ہیں کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے۔

عدل ہی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اگر کوئی موقع بالفرض کسی کے ساتھ تصادم کا پیدا ہو ہی جائے تو کسی کی زیادتی کی جوابی کارروائی ہرگز اس کی زیادتی سے بڑھ کر نہ ہو۔ داعی کا اصل مقام تو معاف کرنا ہے، لیکن استثنائی طور پر کوئی ایسی صورت پیدا ہو ہی جائے کہ کسی کی ظالمانہ حرکت کا دفاع کرنا پڑے تو اصول یہ ہے کہ "فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَااعْتَدٰی عَلَیْكُمْ ص" (البقرہ: ۱۹۴) بس ٹھیک اتنی ہی زیادتی ان پر کرو، جتنی انھوں نے تم پر کی ہو۔ اس حد سے آگے جانا جائز نہیں، نیز قرآن کریم کی یہ ہدایت بڑی جامع ہے کہ "وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ط" (المائدہ: ۸) یعنی کسی گروہ کی دشمنی تمھیں اس بات پر نہ اُکسا دے کہ تم انصاف ہی سے کام نہ لو۔

مختصر یہ کہ صدق، دیانت اور عدل پر صبر سے کاربند رہنا اہلِ دعوتِ حق کے لیے ضروری ہے۔

چھٹی بات

دین کے ہر کام کی طرح دعوتِ اساسی کا کام بھی اس کام کے شرکاء کے باہمی مشورے سے ہونا چاہیے۔ مشورے ہی سے ہر خاص مرحلے کی کارروائی کا فیصلہ ہونا چاہیے اور کام پر نکلنے سے پہلے ہدفِ مقصود اور طریقِ کار متعین ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ میدانِ دعوت کے شہ سواروں کو پتہ ہی نہ ہو کہ آج وہ کس غرض سے نکلے ہیں۔ اور اچانک چلتے چلتے انھیں اشتعال آجائے اور پھر بے اختیارانہ طور پر ان سے بعض حرکات صادر ہوجائیں۔ یہ کام تو مجذوبوں کا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے وہ جب جو چاہیں کہہ دیں اور جو چاہیں کر بیٹھیں۔ ذی شعور اور ہوش مند داعیانِ حق کا راستہ مجذوبوں کا راستہ نہیں ہے۔

ساتویں بات

لفظِ انقلاب کو بھی مشورے اور منصوبہ بندی کی کوتاہیوں کی ڈھال نہیں بنایا جاسکتا اور نہ انقلاب کے معنیٰ یہ ہیں کہ کام کرنے والے جو ہنگامہ چاہیں کھڑا کردیں، سب روا ہے۔ انقلاب کے لفظ سے اِس دور میں جو غیر اسلامی مطالب وابستہ ہوگئے ہیں، ہمارے دل ودماغ کو اُن کے چنگل میں نہیں پھنسنا چاہیے۔ اسلامی دعوت کے انقلابی ہونے کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ صرف وعظ نہیں ہوتی بلکہ تبدیلی کا پیغام ہوتی ہے اور تبدیلی بھی وہ فقط فرد کی زندگی میں نہیں چاہتی بلکہ اجتماعی نظام میں چاہتی ہے۔ لیکن اسلام کی انقلابیت یہ معنیٰ نہیں رکھتی کہ کام کرنے کے نہ کوئی اصول ہیں، نہ حدود، نہ اخلاقیات اور نہ کسی مشورے کی ضرورت ہے، نہ تدبیر کی، نہ حکمت کی، نہ منصوبہ بندی کی، اسلامی انقلابیت کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ داعیانِ حق جدھر چاہیں چڑھ دوڑیں اور جس کی گردن چاہیں ناپ دیں، اسلام کا داعی تو برسوں پس پِس کر تبدیلی لانے کی قوت حاصل کرتا ہے۔

اسلام نے تبدیلی کی جدوجہد کا جو راستہ اختیار کیا ہے اس کا خالص دعوتی کام جو میدانِ جنگ میں قدم رکھنے سے پہلے تک کرنا ہوتا ہے وہ مظلومیت اور " کُفُّوا اَیْدِیَکُمْ " (اپنے ہاتھ روک رکھو) کا راستہ ہے۔ اس مرحلۂ کار کو طے کرتے ہوئے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ آپ بات بات پر بپھر جائیں، ہر زیادتی کا جواب لامتناہی جذبۂ انتقام سے دیں اور انتقام بھی ایسا اندھا کہ

قوم کی گاڑیوں کو جلا دیا جائے، عام لوگوں کی املاک تباہ کر دی جائیں، بسوں میں سفر کرتے ہوئے مسافروں (بچوں، بوڑھوں اور عورتوں) کو اذیت دی جائے۔

دوسری قسم کی انقلابی تکنیک کمیونسٹوں نے ایجاد کی اور اس کے اثرات دنیا بھر میں حکومت یا مختلف اداروں کے خلاف ہونے والے مظاہروں اور احتجاجوں پر پڑے۔ کچھ اسلامی رجحان کے لوگوں نے بھی شاید ''جلاؤ'' اور ''اجاڑو'' کو لفظِ انقلاب کا لازمی تقاضا سمجھ لیا ہے اور ان چیزوں کو اسلامی جدوجہد میں لا داخل کیا ہے۔ ہرگز نہیں، یہ تخریبی طریقے ہرگز اسلامی نہیں اور ان کے بل پر کامیابی حاصل کرنے والے اسلام کی اصل روح سے دور جا پڑیں گے۔

آٹھویں بات

اسلام کی خدمت کرنے کے لیے نوجوانی کا دور بہترین دور ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ نوجوان اپنی اُبلتی، امڈتی ہوئی ذہنی اور جذباتی قوتوں کو انضباط میں رکھ سکیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت پر لبیک کہنے والے، بالعموم نوجوان تھے۔ حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ پر ایمان لانے والوں کے علاوہ اصحابِ کہف بھی نوجوان ہی تھے۔ حضورؐ کی تحریک کو بھی نوجوانوں ہی نے آگے بڑھایا۔ اور پورا اسلامی انقلاب نوجوانوں کی پوری ایک نسل کی قربانیوں کا ثمرہ ہے۔ لیکن یہ سارے نوجوان ایسے تھے جنھوں نے اپنے آپ کو مرضیاتِ الٰہیہ میں جکڑ لیا تھا۔ حدیث میں خدا کی طرف سے ایسے ہر نوجوان کے لیے قیامت کے دن سایۂ عرشِ الٰہی میں جگہ دینے کا وعدہ ہے جس کو حسب نسب یا جمال اور جاہ وجلال رکھنے والی کوئی خاتون خود آگے بڑھ کر خلوت میں دعوتِ گناہ دے اور وہ یہ کہہ کر اس دعوت کو رد کر دے کہ "اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰہَ" (حدیث)

صالح نوجوان کی ایک شان یہ ہے کہ ہمیشہ اپنے سے بڑے — علم اور سرگرمیِ کار اور کردار میں بڑے لوگوں سے بہ ادب رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اگر نوجوان اپنی پیش روصفوں سے بے تعلق ہو جائیں اور علم وتقویٰ میں بڑے لوگوں سے استفادہ کرنے سے بے نیاز ہو جائیں تو وہ سعادت کا مقام مشکل ہی سے حاصل کر سکتے ہیں۔

تو نوجوان اسلام کے بہترین خادم اور علم بردار اور دعوتِ حق کو پھیلانے والے سپاہی جبھی بن سکتے ہیں، جب اُن کا کردار اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰہَ کی اسپرٹ سے بنا ہو۔ جوانی کی قوتوں

کی تند موجوں کو ایمان وخودی سے مسخر کر لینا وہ کمال ہے جس کے نتائج بڑے بابرکت ہیں۔ لیکن اگر یہ تند موجیں اخلاقی حدود سے اچھل کر باہر نکل آئیں تو ایسی غیر مسخر موجیں تباہی کا باعث بھی ہو سکتی ہیں۔ وہ اسلام جیسے سچے اور اعلیٰ و برتر دین کے نازک تقاضوں کو سخت مجروح کر سکتی ہیں۔

نویں بات

کسی بھی فرد یا گروہ کو دعوتِ حق اور اقامتِ دین کے سلسلے میں کوئی کام کرتے ہوئے ان دوسرے تمام عناصر کا خیال رکھنا چاہیے، جو دین کی علم برداری کا کام کر رہے ہیں۔ یہ سوچتے رہیں کہ کسی اقدام کا نتیجہ یہ تو نہیں ہوگا کہ سارے ہی کام کرنے والوں پر برا اثر پڑے اور سبھی کی ساکھ مجروح ہو۔ ایک ہی مقصد کی راہ پر چلنے والے تمام قافلوں کے ساتھ ربط بھی ہونا چاہیے۔ اُن کے نقطہ ہائے نظر بھی سامنے ہونے چاہییں اور اُن سے ہم آہنگی بھی برقرار رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دینی دائرے کے کچھ کیمپ اگر مخالفانہ گولہ باری کریں تو عالی ظرفی سے نظر انداز کر دیا جائے۔ ماسوا اس کے کہ کسی کی یک طرفہ جارحانہ جنگی کارروائی تحریک اور خود دین کے لیے ضرر رساں بن جائے یا اپنے صحیح نقطۂ نظر سے کارِ دعوت کو جاری رکھنا مشکل ہو جائے، یا دین کے حقائق سے نو متعارف حلقوں میں غلط فہمیاں اور انتشاری رجحانات پیدا ہوں۔

مختلف دائروں میں کام کرنے والی تنظیمیں اگر اسلام کی نسبت سے کام کر رہی ہوں تو ہر ایک کے اچھے اقدام کا اثر بھی اور غلط حرکات کا اثر بھی دوسروں پر پڑتا ہے۔

داعیانِ حق کو یہ امر پوری طرح ملحوظ رکھنا چاہیے۔

آخری بات

انتظامیہ میں بھی، صحافت اور ذرائع ابلاغ میں بھی، تعلیم اور پولیس میں بھی، محکمہ خارجہ اور سی آئی ڈی میں بھی، سیاسی جماعتوں اور مذہبی جتھوں میں بھی جگہ جگہ اسلام کی ہمہ گیر انقلابی دعوت کے مخالفین بکثرت موجود ہیں۔ تمام وہ لوگ جو مفاد پرست ہیں، تمام وہ لوگ جو لادینیت پسند ہیں، تمام وہ لوگ جو مغرب پرست ہیں، تمام وہ لوگ جو اشتراکیت زدہ ہیں، تمام وہ لوگ جو خیانت کار ہیں، تمام وہ لوگ جو تفرقہ باز ہیں، وہ جہاں بھی بیٹھے ہیں، داعیانِ حق کے خلاف گھات لگا کر بیٹھے ہیں۔ جوں ہی ادھر کوئی کمزوری نمودار ہوتی ہے، وہ کسی بڑے اُصولی تقاضے کی

بنیاد پر کسی نہ کسی محاذ سے بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔

اپنا کام کرتے ہوئے چاروں طرف پھیلی ہوئی ان کمین گاہوں کا خیال رکھیے، جن میں دوربینیں اور ہیڈ فون لگائے بڑے بڑے گھاگ آپ کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرکت کا جائزہ لینے کے لیے بیٹھے ہیں، جہاں آپ اُن کی زد میں آئے، وہ فائر کھول دیں گے۔

یہ تو ظاہر کی معاندانہ نگرانی ہے، آپ کی اصل توجہ تو خدا کی طرف سے مامور فرشتوں پر رہنی چاہیے جو آپ کے ہر قول و فعل کا ریکارڈ رکھ رہے ہیں۔ اور اُن سے اوپر خود اللہ تعالیٰ ہے جسے آپ کی چھپی نیتوں کا حال بھی معلوم ہے۔ آپ اگر ساری دنیا کو بھی مغالطے میں ڈال دیں تو وہ خبیر و بصیر اصل مخفی حقیقت کو جانتا ہے جو سینوں میں مستور ہے۔ اگر نگاہ ادھر رہے تو پھر معاشرے اور نظامِ وقت کی کمین گاہوں میں چھپے دشمنوں پر توجہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اُن کا بس تو اسی وقت چلتا ہے جب ہمارا تعلق اپنے خدا سے کم ہوتا ہے۔

تو دوستو! فی الوقت یہ چند گزارشات پیشِ خدمت ہیں، ان پر غور کیجیے اور اپنے منصوبوں اور نقشوں کو درست کر لیجیے۔ ورنہ غلط کار اور کج کیش خادموں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔ اور وہ جب چاہے اپنے بنائے ہوئے قوانین تقدیر و تاریخ کے تحت ادنیٰ ادنیٰ دشمنوں سے انھیں پٹوا سکتا ہے۔

استغفر اللہ لہ ولکم اجمعین

رزقِ حلال

"ایک سچا داعیِ حق اپنا فرض ادا کر ہی نہیں سکتا، اگر اس کی زندگی رزقِ حلال پر نہ گزر رہی ہو۔ وہ اگر دنیوی لذّات اور نعمتوں کی تکثیر اور معیارِ زندگی کی مسابقتِ عام میں شریک ہو جاتا ہے تو اوّل تو اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا کہ وہ عوام میں دعوت پھیلانے کا کام کر سکے اور اگر وقت بچتا ہے تو اس کا تھکا ماندہ، درماندہ دماغ اور جسم اپنی قوتیں پوری طرح نچوڑ چکا ہوتا ہے۔ وہ اگر تحریک کی خدمت کرنے کے لیے اٹھتا بھی ہے تو پوری صلاحیت سے کام نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں حرام آمدنی کو اپنی معاش میں شامل کر لینے کے بعد اس کا ضمیر مجروح ہو جاتا ہے اور اخلاقی کمزوری اُس پر چھا جاتی ہے۔ مجروح ضمیر اور کمزور اخلاق کے ساتھ دعوتِ حق کے میدانِ کش مکش میں جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر نکلنا ممکن نہیں ہوتا۔ بے دلی یا نیم دلی سے، جامد انداز سے اور اکھڑے اکھڑے لہجے کے ساتھ کون سا کارنامہ انجام دیا جا سکتا ہے۔ میں اپنے یارانِ طریقت سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ نہ صرف اپنی ذات کی حد تک رزقِ حلال کی پابندی کریں بلکہ اُس کو اپنی دعوت کا ایک نکتہ بنا لیں اور اُس کے لیے پوری سرگرمی سے کام لیں۔"[۱]

آج ہم ایک ایسے غیر صحت مند ماحول میں گھرے ہیں کہ ہمارے ضمیر زخم زخم ہیں اور ایک اضطرابِ مسلسل ہمارے عروق و اعصاب پر چھایا ہوا ہے، ہر کوئی اپنی روحانی تونس میں مبتلا

---

[۱] آگے میرا ایک صدارتی خطبہ ہے جو شامِ ہمدرد (مورخہ یکم اپریل ۱۹۸۲ء) کی تقریب منعقدہ لاہور میں پڑھا گیا۔

ہوکر مادیت کے سرابوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اور جتنا بھاگتا ہے، تو تُس بڑھتی جاتی ہے اور کوئی سراب ایسا نہیں جو ایک گھونٹ پانی فراہم کر سکے۔

اس مادّہ پرستانہ دورِ زندگی نے آدمی کی ساری توجہ جسمانی زندگی پر مرتکز کرادی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے جسم کی آسائشوں کے لیے رنگا رنگ سامانوں کے انبار لگادیے ہیں، انسان ہوائے نفس کے آسیب کا شکار ہوگیا ہے۔ انسانی دل و دماغ کی ساری دل چسپیاں خواہشوں کے رنگین کھلونوں اور غباروں کے گرد جمع ہوگئی ہیں۔ دولت خادم انسان ہونے کے بجائے صنم خانۂ تمدن کی مہادیوی بن گئی ہے۔ معیارِ زندگی کی پرستش شروع ہوگئی ہے۔ لوگ ناجائز کمائیوں کے گندے پانی کے سیلِ تُند میں بہہ رہے ہیں اور بہتے ہوئے غوطے بھی کھا رہے ہیں۔ رزقِ حرام کے طوفان میں جیسے ہر شخص جہازِ عمرِ رواں پر بے اختیار بیٹھا ہو۔ جس کا کوئی بادبان ہے، نہ ساحل!

تشویش ناک حقیقت یہ ہے کہ دولت پرستی اور جذبۂ خدمت، یا رزقِ حرام اور حسنِ اخلاق آپس میں شدید تضاد رکھتے ہیں اور آپس میں ملتے نہیں بلکہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ جس شخص نے جان بوجھ کر حرام کی روزی کمائی اس نے حسنِ اخلاق کے دروازے اپنے اوپر بند کرلیے۔ اور جس کے ہاں حسنِ اخلاق نہیں ہے اس کی روزی کبھی پاکیزہ نہیں رہ سکتی۔ رزق حرام کے ساتھ بعض افراد میں جو اخلاق پایا جاتا ہے وہ محض ایک خول ہوتا ہے۔

دین کی ایک جامع اصولی ہدایت

اللہ نے اپنے تمام انبیاء کو اور انبیاء کی معرفت ان کی پیرو اُمّتوں کو یہ اصولی ہدایت دی کہ یٰۤاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ط (المومنون:۵۱) یعنی اے میرے رسولو! پاکیزہ روزیاں کھاؤ اور عملِ صالح پر کاربند رہو۔ چھ سات الفاظ کا یہ مختصر ارشاد ایسا ہے کہ اُصولی طور پر قریب قریب پورے دین کا منشاء اس میں آ گیا ہے۔ اگر کوئی شخص رزقِ حلال و طیب کی پابندی کے ساتھ عمل صالح میں زندگی گزارتا ہے تو گویا اس نے حسنۂ دُنیا کو بھی پالیا اور حسنۂ آخرت کو بھی! اس مختصر سے کلمہ میں نمایاں اشارہ موجود ہے کہ پاکیزہ روزی یا حلال رزق کے بغیر اعمالِ حسنہ اور اخلاقِ عالیہ کا ہونا ممکن نہیں اور اسی طرح اعمال حسنہ یا اخلاقِ حسنہ سے جس شخص کی زندگی خالی ہو، یہ تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے دامن معیشت کو حرام کی آلائشوں سے بچائے گا اور رزقِ

حلال کمانے کے لیے غیر معمولی جہد و مشقت کرے گا۔ حضورؐ نے بروایت عبداللہ بن مسعودؓ فرمایا کہ رزقِ حلال کا کسب فرض ہے۔

دراصل جب کوئی شخص پہلی بار ناجائز کمائی حاصل کرنے کے لیے میدان میں بڑھتا ہے تو کسی نہ کسی اخلاقی اصول کو توڑتا ہے، بلکہ بیک وقت ایک سے زیادہ اخلاقی تقاضوں کو پامال کرتا ہے۔ جھوٹ، بد دیانتی، کام چوری، ناپ تول میں گڑ بڑ، ملاوٹ، غصب، سود، رشوت، جعل سازی، سفارشِ بے جا، عہدہ و اختیار کا ناجائز استعمال یا اسی طرح کی غلط حرکات میں سے جن جن کو وہ مفیدِ مطلب پائے گا، اختیار کرے گا۔ ایسے اقدام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ضمیرِ زندہ کا جو احساسِ حیا غلط کاموں میں رکاوٹ بنتا ہے وہ پہلے کمزور، پھر غیر مؤثر اور پھر کالعدم ہو جاتا ہے۔ یہی احساسِ حیا جو ایک شعبہ ایمان ہے، ہمیں خیانت نگاہ سے روکتا ہے، قولِ بد سے روکتا ہے، ناشائستگی سے روکتا ہے، دوسروں کو تکلیف پہنچانے سے روکتا ہے، بے انصافی سے روکتا ہے، بد دیانتی سے روکتا ہے، جھوٹ بولنے اور اور جھوٹ لکھنے اور جھوٹ پر عمل کرنے سے روکتا ہے۔ مگر جو شخص حرام کمائی کی راہ پر پڑتا ہے وہ پہلے اسی احساسِ حیا کا گلا گھونٹتا ہے۔ حرام کے دس روپے حاصل کرنے والا آدمی کسی دوسرے فریق کو تھوڑا سا مالی نقصان ہی نہیں پہنچاتا، بلکہ اپنے اندرون میں ایک گراں بہا قوت کا قتل کر رہا ہوتا ہے۔ پس جس معاشرے میں حرام کمائیاں عام ہو جائیں اور یہ کہا جانے لگے کہ حرام سے بچنا ناممکن ہے، اس معاشرے میں لازمی طور پر اخلاقی اقدار برباد ہونے لگیں گی۔ آپس کا انسانی احترام ختم ہو جائے گا، بڑوں کا ادب ختم ہو جائے گا، چھوٹوں کے لیے شفقت نہیں رہے گی، انسانیت کا وقار اور امومت کا تقدس نہیں رہے گا۔ وعدوں پر اعتبار نہیں رہے گا، لوگوں میں احساسِ تحفظ ختم ہو جائے گا، بلکہ بات اور آگے بڑھے گی اور بات بات پر لوگ تشدد کے چھُرے نکالنے لگیں گے، ہر معاملے میں دھینگا مشتی ہوگی، طبیعت کا ذرا سا تکدّر انتقام کا روپ دھار لے گا، ہر اختلاف پر نفرت بھڑکے گی، ہر ناپسندیدہ واقعہ پر بے قابو اشتعال پیدا ہوگا— اور ان احوال کے نتیجے میں بہیمانہ جرائم کا ایک طوفان اُمڈ پڑے گا۔ جبھی تو رسولِ مقبولؐ نے فرمایا: حبّ الدنیا راس کل خطیئة یعنی دنیا یا دولتِ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

اپنا باطنی انضباط

اب یہ آپ خود سوچ لیجیے کہ کیا آپ ایسے ہی حالات سے دوچار نہیں ہیں؟

اگر اخلاقی قدروں کے نقصان کی وجہ سے زندگی زہرناک بنتی جارہی ہے تو اس صورتِ حالات سے جلد نکلنے کی فکر کیجیے، ورنہ جتنا جتنا آگے بڑھیں گے، پیچھے پلٹنا روز بہ روز مشکل ہوتا جائے گا۔اس اذیت ناک صورتِ حالات سے نکلنے کی ایک مؤثر صورت یہ ہے کہ آپ اپنے دل کے نہاں خانے میں اُتر کر اپنے خدا سے عہد باندھیے کہ میں رزق حلال حاصل کرنے کی بھرپور سعی کروں گا اور حرام کا ایک ذرّہ اور ایک قطرہ بھی اپنی زندگی میں داخل نہ ہونے دوں گا۔ میں لمبی چوڑی حسرتوں اور آرزوؤں کے محلات میں اپنے آپ کو قید نہیں رکھوں گا، بلکہ جتنی کچھ حلال وطیب روزی مل سکے گی، اسی پر اکتفاء کروں گا۔رزق حلال کے سچے طالب کو دوسروں پر رشک وحسد کی عادت چھوڑ کر متوسط یا غریبانہ گزران کو ہنسی خوشی سے قبول کر لینا چاہیے۔آپ اپنے بیوی بچوں کو حرام سے بچائیں، چاہے آپ کو بہت سی آسائشیں حاصل نہ ہوں۔آپ اس کی پروا نہ کریں کہ اونچے لوگوں سے آپ کی دوستی نہیں چل سکتی، یا آپ زندگی کی تقریبوں میں ٹھاٹ باٹ نہیں دکھا سکتے، یا آپ مفاخرت کے میدان میں دوسروں سے بڑھ نہیں سکتے، رزقِ حلال پر بسر ہونے والی زندگی خود اپنے اندر بڑائی رکھتی ہے اور یہ ایسا پودا ہے جو چاہے قد اور پھیلاؤ میں چھوٹا رہے مگر اس پر حسن اخلاق کے لالہ وگل کھلا کرتے ہیں۔رزقِ حرام سے نشو ونما پانے والی مصنوعی زندگی کے درخت پر اخلاقی لحاظ سے حنظل اور مغیلاں نمودار ہوتے ہیں۔

نبی اکرمؐ کے ارشادات

اب میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات بیان کرتا ہوں جو کسی صاحبِ ایمان کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک روایت میں اس شخص کی مثال بیان کی ہے جس کے متعلق حضورؐ ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ لمبا سفر کر کے آتا ہے، اُس پر تھکن طاری ہے اور اُس کا جسم اور لباس غبار آلود ہے مگر اس کے شوقِ عبادت کا یہ عالم ہے کہ وہ نہایت بے تابی سے خدا کے حضور کھڑا ہو جاتا ہے اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر پکارتا ہے ''یا ربّ! یا ربّ!'' حضورؐ فرماتے ہیں کہ اُس کی دعا اور

پکار کیا اثر دکھائے جب کہ اُس کا کھانا حرام کا ہے اور اُس کا لباس حرام کا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دس درہم کا ایسا لباس پہن کر عبادت کرے جس میں ایک درہم حرام کا شامل ہے تو جب تک یہ لباس اُس کے بدن پر ہے، اس کی کوئی عبادت قبول نہیں ہوتی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہم تک پہنچاتے ہیں کہ حرام کمائی کا سارے کا سارا مال اگر صدقہ کر دیا جائے تو اس کا کوئی ثواب نہیں اور اُس مال سے اگر نان و نفقہ کا انتظام کیا جائے تو اس میں برکت نہیں۔

ایک روایت اور! حضرت جابرؓ سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ہم تک پہنچاتے ہیں اور حضرت ابو بکرؓ کی ایک روایت بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ وہ گوشت جس کی پرورش حرام سے ہوئی ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکتا، اُس کی جگہ جہنم میں ہے۔

آدمی دنیا پرستی کی رَو میں پڑ کر بڑی بڑی حقیقتوں سے غافل رہتا ہے۔ مثلاً ایک حدیث یہ بتاتی ہے کہ آدم کے کسی بیٹے بیٹی کے قدم آخرت کی عدل گاہ کے کٹہرے سے ہل نہیں سکیں گے جب تک وہ چند بنیادی سوالات کا جواب نہ دے لے۔ ان میں سے ایک سوال یہ ہے کہ وعن ماله من این اکتسب وفیم انفق نہایت خوف ناک سوال ہے۔ ایک ایک پیسے کے متعلق۔ زمین، مکان، کاروبار، ملازمت، خرید و فروخت۔ ہر چیز کے بارے میں یہ جواب دینا کہ کون سی آمدنی کہاں سے اور کس طریقے سے حاصل کی گئی اور پھر کن مقاصد و مشاغل کے لیے خرچ کی گئی، کوئی سہل امر نہیں ہے۔ کسٹم اور انکم ٹیکس والوں کے سامنے اس دنیا میں حساب پیش کرتے ہوئے آپ کو کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں اور کتنی پریشانی ہوتی ہے، مگر آخرت میں تو نہ دولت کا کوئی حصہ کالے دھن کی شکل میں لُکایا چھپایا جا سکے گا، نہ حساب کتاب میں کوئی ہیر پھیر چل سکے گا، نہ کوئی وکیل قانونی موشگافیاں کرنے کے لیے درمیان میں ہوگا اور نہ کوئی درمیانی کارندہ ایسا ہوگا، جسے رشوت دی جا سکے۔ درمیان میں ہوگا اور نہ کوئی درمیانی کارندہ ایسا ہوگا، جسے رشوت دی جا سکے۔ ذرا آج ہی بیٹھ کر ایک سال، یا ایک ماہ یا ایک ہفتے یا ایک دن کی دولت کا سچا حساب اپنی نگاہوں کے سامنے رکھ کر دیکھیے، کیا آپ کا حساب اپنی نگاہوں میں صاف ستھرا ہے؟ اکلِ اموال بالباطل، یعنی ناجائز طریقوں سے مال ہڑپ کرنا اور صرفِ اموال برائے تبذیر و اسراف،

یعنی گناہ کے ممنوعہ کاموں میں، یا حقیقی ضروریات کو خواہ مخواہ بڑھا چڑھا کر روپیہ اُڑانا، یہ دو بڑی چیزیں ہیں جن سے اپنے آپ کو بچا لیجیے۔ فقراء یعنی تھوڑی آمدنی رکھنے اور محدود مصارف میں گزربسر کرنے والے کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ وہ آخرت کی عدالت سے جلد فارغ ہوں گے اور سستے چھوٹیں گے اور دولت مندوں سے بہت پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ جبکہ امراء کا حساب بڑی دیر میں مکمل ہوگا۔ امام غزالیؒ نے مکاشفۃ القلوب میں یہ تک لکھا ہے کہ انبیاء میں سے حضرت سلیمان علیہ السلام اور صلحاء میں سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ تاخیر سے جنت میں داخل ہوں گے، حالانکہ دونوں کے جنتی ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔ اسی وجہ سے حضورؐ نے رزقِ کفاف پر اکتفا کرنے کی ترغیب دلائی۔ اَفْلَحَ مَنْ اَسْلَمَ وَ کَانَ رِزْقُہٗ کَفَافًا یعنی فلاح پائی اُس شخص نے جس نے اسلام کو اختیار کیا اور جو گزربسر کی روزی رکھتا ہے۔

ایک سبق یہ دیا کہ دنیا کو اور اس کے اموال اور نعمتوں کو متاعِ غرور سمجھو اور دُنیا میں اس طرح وقت گزارو جیسے تم پردیسی اور مسافر ہو۔ دوسرا سبق یہ دیا کہ موت کو یاد رکھو، کیونکہ بالفاظ حضرت اَنسؓ ''موت کی یاد گناہوں کو مٹاتی اور دنیا پر فریفتہ ہونے سے بچاتی ہے۔'' اور بالفاظ حضرت کعبؓ ''جس نے موت کو جان لیا، اُس پر دین کے مصائب اور غم آسان ہوگئے۔'' تیسرا سبق یہ دیا کہ دنیوی معاملات میں باہمی مفاخرت اور تکاثر سے بچو۔ تکاثر سے مراد ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ تلقین یہ فرمائی کہ اُمورِ دنیا میں اپنے سے کم مرتبہ لوگوں کو دیکھو کہ کثیر التعداد غریب لوگ کس طرح گزر کر رہے ہیں اور اپنی دینی خدمات، سعی دعوت و اصلاح، انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد برائے غلبہ حق میں اپنے سے اوپر والوں کو دیکھو اور اُن سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔

بے بنیاد شیش محل

جو شخص گمراہ لوگوں کے بنائے ہوئے معیارِ زندگی کی پرستش کرنے لگتا ہے اور بے بنیاد حسرتوں اور آرزوؤں کے شیش محل کھڑے کرتا ہے، وہ آہستہ آہستہ اس ڈگر پر پڑ جاتا ہے کہ ایک خاص معیار کے مطابق نمائش، آرائش اور آسائش کے اسباب جمع کرنے کے لیے ناجائز آمدنیوں کے راستے نکالے۔ ناکام ہوتا ہے تو قلق و یاس میں پڑ کر نفسیاتی کیس بن جاتا ہے اور کامیاب

ہوتا ہے تو معیار پرستی اسے خدا اور اس کے بندوں کے لیے مال خرچ کرنے کا اِذن نہیں دیتی۔ وہ لازماً اسراف اور تبذیر کے راستے پر پڑ جاتا ہے۔

شکست خوردہ ذہنیت

آج کچھ لوگوں نے یہ کلیہ بنالیا ہے کہ صاحب! رزق کو حرام کی آمیزش سے پاک رکھنا ممکن ہی نہیں۔ یہ کلیہ اُن لوگوں کا ہے جو گزر بسر کی حلال روزی پر اکتفا کرنے والے نہیں ہیں، بلکہ ہزاروں لاکھوں کی آمدنیاں سمیٹنے کے درپے ہیں اور پلاٹوں، کوٹھیوں، کاروں اور دیگر بڑے بڑے مفاد کو سمیٹنا چاہتے ہیں۔ یہ اپنا کلیہ بیان کر کے، ان بزرگوں اور نوجوانوں کو مایوس کر کے کسب رزقِ حلال کی جنگ میں شکست تسلیم پر آمادہ کرتے ہیں جو حرام کی روزی سے بچنا چاہتے ہیں پھر کچھ لوگوں کا طرزِ استدلال یہ ہے کہ جب اضطرار اور مجبوری سے کچھ نہ کچھ حرام کی آلائشیں قبول کرنا ہی پڑتی ہیں تو پھر کیوں نہ کھل کر حرام خوری کی جائے تا کہ کچھ بنے بھی۔ حالانکہ اضطرار اور مجبوری کی رعایت خدا کے ہاں وقتی اور جزئی اُمور پر تو شاید مل جائے، لیکن حرام کے خوانِ یغما پر کھلے ہاتھ مارنے والوں کا معاملہ ایسا نہیں جس پر وہ خدا کے سامنے معذرت پیش کر سکیں۔

رزقِ حرام کے خلاف جنگ

آخر میں مجھے اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے کہ ہزار بگاڑ پھیلنے کے باوجود اُمتِ محمدیہؐ اور خود ملت پاکستان میں ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو حرام کی ترغیبات سے لڑ لڑ کر، رزقِ حلال تک اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں۔ ہمارے سارے اخلاقی استحکام اور قومی فلاح کا دارومدار اسی عنصر پر ہے۔ یہ لوگ اگر اٹھ کھڑے ہوں اور رزق حلال کو دین کے ایک اہم تقاضے کی حیثیت سے پھیلائیں تو تھوڑی مدت میں اخلاقی لحاظ سے ہمارا نقشہ بدل سکتا ہے۔ حکومت کو قوانین کے ذریعے حرام کے راستے بند کرنے چاہئیں۔ ادیبوں اور صحافیوں کو اپنا زورِ قلم اس مقصد کے لیے صرف کرنا چاہیے، خطیبوں اور واعظوں کو جزئیات پر عوام کو لڑانے کے بجائے اتحاد بین المسلمین اور رزق حلال جیسے موضوعات پر کلام کرنا چاہیے۔ مشائخ کو بیعت لیتے ہوئے اپنے مریدوں سے اقرار کرانا چاہیے کہ وہ رزقِ حلال کی پابندی کریں گے، دینی اور سیاسی جماعتوں کے دستوروں میں ایسی ایک شق ضروری ہونی چاہیے کہ ہمارے ارکان کو...... رزقِ حرام

سے اجتناب کرنا ہوگا۔ جدید وقدیم معلمین کو شاگردوں میں یہ جذبہ بیدار کرنا چاہیے کہ اپنی آئندہ زندگی میں حلال وطیب روزی پر اکتفا کریں، خصوصاً ہمارے ہاں کی بیگمات کو یہ طے کر لینا چاہیے کہ وہ حرام آمدنی کو اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دیں گی اور نہ گھر والوں سے ایسے اسباب، ایسے لباسوں اور زیورات یا ایسی تقریبوں کا مطالبہ کریں گی، جن کو بہم پہنچانے کے لیے وہ رزقِ حرام کی چراگاہ میں داخل ہونے پر مجبور ہو جائیں، نیز وہ عہد کر لیں کہ اپنے کسی بچے کے منہ میں دودھ کا ایک ایسا قطرہ بھی نہ جانے دیں گی جس میں حرام کا زہر ملا ہوا ہو۔ اور ان سب عناصر کو اگر ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی پشت پناہی بھی حاصل ہو جائے تو مساعیِ اصلاح میں دس گنا زیادہ زور پیدا کیا جا سکتا ہے۔

اگر یہ مہم کچھ عرصہ چلے تو اخلاقی قدروں کی ٹمٹماتی ہوئی شمعیں پوری طرح روشن ہو جائیں اور سارا معاشرہ جگمگا اُٹھے۔

مالِ حرام

ایک اخباری اطلاع

اخبارات میں اس واقعہ کا چرچا ہے کہ پولیس کے ایک سابق ملازم کو کسی بزرگ کے وعظ و تلقین سے یہ احساس بہ شدت لاحق ہوا کہ حرام کمائی پر زندگی بسر کرنے والے کے لیے قیامت کے دن کوئی راہِ نجات نہیں ہے۔ اور وہاں کی طویل سزائے بے اماں سے نمازیں اور روزے بھی نہیں بچا سکتے، چنانچہ مالِ حرام کے اس وبال کا شعور ہوتے ہی اس نے ایک ایسا فیصلہ کیا کہ اس کی قائم کردہ مثال موجودہ تاریکی میں ایک مشعل بن گئی ہے۔ اس کے پاس تھوڑی سی اراضی تھی، وہ اس نے بیچی اور اس کی قیمت ان افراد میں تقسیم کرنا شروع کی جن سے اس نے رشوت لی تھی۔ وہ جگہ جگہ کا سفر کر رہا ہے اور اپنے زخم رسیدگان کو تلاش کر کر کے اُن تک اپنے سچے جذبۂ تلافی کا مرہم پہنچا رہا ہے۔ اور ان سے معافی مانگ رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسے اپنے بہت سے مظلوم افراد یاد ہی نہ آئے ہوں، بہت سے فوت ہو چکے ہوں یا نقل مکانی کر گئے ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی پونجی سارا حساب بے باق کرنے کے لیے کافی نہ ہو، مگر اُس نے سچی توبہ کا ایک نمونہ پیش کر دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ باقی رہ جانے والے ستم رسیدگان جب قیامت کے دن اُس کے احوال سے آگاہ ہوں تو اسے معاف کر دیں۔

تباہی کا طوفان اُمڈ پڑے گا

اصل مصیبت یہ ہے کہ آج میخانۂ دولت پرستی کے جام چڑھا چڑھا کر لوگ اس طرح بدمست ہیں کہ کسی مال دار کو مالِ حرام کے وبال کا احساس ہی نہیں رہا۔

اپنی عمر کی ابتداء میں ایسے گھر ہم نے دیکھے جنھوں نے کسی ناجائز آمدنی کو یہ کہہ کر ٹھکرادیا کہ میرے تو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، ایسی مائیں ہم نے دیکھیں جنھوں نے کبھی یہ گوارا نہ کیا کہ ان کے شیرخوار بچوں کے منہ میں دودھ کا کوئی ایسا قطرہ چلا جائے جس میں حرام کی آمیزش ہو۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہماری آبادیوں میں ایسے لوگ بکثرت موجود رہے ہیں جو شرافت کی قدروں سے محبت کرتے تھے اور جن کے ضمیر زندہ تھے۔ بخلاف اس کے آج رزقِ حرام کی پروردہ نسلوں میں جو ہر شرافت ختم ہو رہا ہے۔ اور ایمان کی حرارت، ضمیر کی حساسیت، اسلامی اُخوّت اور جذبۂ خدمتِ انسانیت کے لحاظ سے لوگ دیوالیہ ہو رہے ہیں۔[۱]

رزقِ حرام کے جو اثراتِ بد ہر کسی کو چشم سر سے دکھائی دے سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ دولت کی تونس بڑھتی جاتی ہے، مصارف کا بھاؤ کا ہر بند توڑتا جاتا ہے، تفریحات وتعیّشات کا رجحان بڑھتا ہے، جرائم میں افزودگی ہوتی ہے۔ تشدد کے خنجر کی کاٹ بڑھتی جاتی ہے۔ فحاشی و آوارگی زور پکڑتی ہے اور ایک عام ذہنی انتشار واضطراب، قلوب کو گھیر لیتا ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہے اور اگر کوئی روک تھام نہ ہو سکی تو تباہی کا یہ طوفان پورے زور سے اُمڈے گا۔ یہ طوفان اُمڈ پڑا تو ہر قیمتی چیز کو بہالے جائے گا۔

فکر کرنی چاہیے کہ اس خطرے کی روک تھام ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقینات

رزقِ حرام کے متعلق حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حقائق ہمارے سامنے رکھے ہیں، ایمان والوں کو لرزا دینے والے ہیں۔ بطورِ تلخیص چند اشارات درج ہیں:

جو گوشت (یعنی جسم) حرام سے پرورش یافتہ ہو، اُس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ جس کسی نے کسی جھوٹے مقدمے (یا کسی اور باطل طریق سے) دوسرے کا مال حاصل کیا اُس نے اپنے لیے آگ کا ٹکڑا حاصل کیا۔

[۱] بعض جگہ اب بھی یہ اثرات باقی ہیں۔ قریب کا واقعہ ہے کہ میرے ایک محبّ مکان بنانے کے لیے بنک سے سود پر قرض کی رقم لے کر گھر پہنچے۔ اپنی بیگم کو جب انھوں نے اپنا کارنامہ بتایا تو عین دوپہر کے وقت اس نے ان کو واپس کیا کہ اس سودی رقم کو ابھی واپس کر کے آئیں اور انھوں نے رقم واپس کر دی۔ مکان کے لیے کوئی دوسرا انتظام ہو گیا۔

جس شخص کا لباس اور کھانا پینا حرام ہو، اس کی نمازیں اور دعائیں اورزاریاں قبول نہیں ہوتیں۔

رشوت کھانے والا ہو یا کھلانے والا دونوں کا ٹھکانا آگ ہے۔

ایک شہید کے مال میں اگر کوئی معمولی سی چیز بھی ایسی ہو جو مالِ غنیمت میں سے امیرِ لشکر کے اذن کے بغیر کسی شخص نے اپنے آپ حاصل کر لی ہو تو صرف اتنے سے ناجائز مال کے بدلے میں حضورؐ نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا کہ وہ دوزخ میں جائے گا۔[۱]

زکوٰۃ کے تحصیل داروں اور محکمہ کے کارکنوں کے متعلق آپ نے واضح طور پر خطبۂ عام میں فرمایا کہ تم میں اگر کوئی شخص قیامت کے دن اس حال میں ہوگا کہ رشوت کے مال کی کوئی بکری اس کے کندھوں پر لدی ہوگی، یا کوئی اونٹ اُس پر سوار ہوگا، یا کپڑے کے تھان سر سرا رہے ہوں گے اور وہ میرے پاس آکر کہے گا کہ یا رسول اللہ! مجھے اس مصیبت سے چھڑایئے تو ایسے لوگوں کو میں بتائے دیتا ہوں کہ میں نہیں چھڑا سکوں گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عزیز رفقاء میں سے ایسے حضرات کے جنازے پڑھانے سے انکار کر دیتے تھے جن پر قرض کی صورت میں دوسروں کا کوئی حق باقی ہو اور اس کے فوری طور پر ادا کر دینے یا کسی دوسرے شخص کے ضامن و ذمے دار بن جانے کا انتظام نہ ہو سکے۔

ان اشارات کی مدد سے ایک صاحبِ ایمان آدمی آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ مالِ حرام

---

[۱] ابوداؤد کتاب الجہاد کی چند روایات ملاحظہ ہوں:

حضور اکرمؐ کے مدعم نامی غلام کو وادی القریٰ میں دشمن کا تیر لگا اور وفات پا گیا۔ صحابہؓ نے اس موقع پر اس کی شہادت پر تحسین کی تو حضورؐ نے فرمایا: ''بخدا ایسا نہیں ہے۔ وہ جنت میں نہیں، بلکہ غنائم کے اموال میں سے ایک چادر جو اس نے تقسیم سے پہلے (بالا بالا) حاصل کر لی تھی، وہ اس پر آگ بن کر بھڑک رہی ہے۔'' ایک موقع پر اس اعلانِ عام کے باوجود کہ غنائم کے تمام اموال جمع کر دیے جائیں۔ ایک صحابیؓ نے بالوں کی بنی ہوئی ایک لگام کو جمع کرانے میں دیر کی۔ پھر وہ جب لے کر آیا تو حضورؐ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ تو اسے لیے ہوئے قیامت کے دن حاضر ہوگا۔

خیبر کے غزوہ میں ایک صاحب وفات پا گئے۔ حضورؐ کو اطلاع دی گئی تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم جا کر اس کی نمازِ جنازہ پڑھ لو، حضورؐ نے جنازہ نہیں پڑھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُس نے راہِ خدا میں خیانت کی تھی۔ چند پتھر کے نگینے تھے جن کی مالیت دو درہم بنتی تھی۔ وہ اس نے چرُا لیے تھے۔

شریعتِ محمدیہ کی رو سے آدمی کے کردار اور اس کی عاقبت کے لیے کسی درجہ خطرناک ہے۔

ایک لمحۂ فکر

امت کی بدقسمتی ہے کہ اس کے علماء اور واعظ معاملات کی طرف تو آتے ہی نہیں، نہ کبھی کسی دینی جلسے میں مالِ حرام کو موضوع بنایا گیا، نہ اس کے برعکس رزقِ حلال کی اہمیت واضح کی گئی۔

ہمارے واعظینِ شیریں مقال لہک لہک کر اور سُر لگا لگا کر جن چیزوں کو بیان کرتے ہیں وہ اُن کی فرقہ وارانہ پسند کے عقیدوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ دوسرا بڑا موضوع یہ ہوتا ہے کہ شانِ رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) بیان کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ایسا تصوّر دلایا جائے کہ بس چند اذکار وظائف ہیں اور کچھ درود و سلام کا سلسلہ ہے جس نے یہ کرلیا اُس کے لیے شفاعتِ حضورؐ واجب اور جنت لازم ہوگئی۔

واشگاف الفاظ میں مَیں کہتا ہوں کہ آپ کلمۂ طیبہ (افضل الذکر) کا وِرد کریں یا "كَلِمَتَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ وَثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ" (سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحٰنَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ) کا خواہ آیت کریمہ کی تسبیحیں پڑھیں یا آیت الکرسی کا وظیفہ کریں، حتیٰ کہ آپ بکثرت نفل نماز پڑھیں یا نفل روزے رکھیں، ان ساری چیزوں کی برکات اسی صورت میں حاصل ہوسکتی ہیں، جبکہ آپ کی مجموعی زندگی دینی لحاظ سے صحت مندانہ ہو۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک تندرست شخص اگر عام غذا کے ساتھ تھوڑی سی مقدار میں ایک آدھ انڈا یا چار چھ بادام یا تھوڑا سا مربہّ یا دودھ وغیرہ کوئی چیز استعمال کرے تو اس کی توانائی بہت بڑھے گی۔ لیکن اگر آپ معدے کے مریض کو سوہن حلوا کھلائیں، یرقان زدہ آدمی کو خوب انڈے ٹھونسوائیں یا پیچش کے مریض کو کُشتۂ فولاد دینے لگیں تو وہ سفرِ حیات کو زیادہ تیزی سے طے کرے گا۔

پُر تضاد روش

ذکر و اذکار اور درود و سلام تو اُس وقت کارگر ہوتے ہیں جب توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان درست ہو، فرائض کا اہتمام اور منہیات سے اجتناب ہو رہا ہو اور خدا کے حقوق کے علاوہ خاص طور پر بندوں کے حقوق ادا ہو رہے ہوں۔ صرف ایسی صورت میں ہر ذکر، ہر دعا، ہر خدمت، ہر انفاق کی بڑی جزا ہے۔ ایک ملازم ایک طرف سے فرم میں خیانت کر رہا ہو

اور دوسری طرف ڈائریکٹر کے سامنے قصیدوں اور سلامیوں کا ڈرامہ کرکے یہ چاہے کہ اسے تنخواہ کے علاوہ بونس اور انعام اور ترقی دی جائے، تو یہ بڑا غلط اندازِ فکر ہے۔ وہ تو فی الحقیقت غبن کرنے کے بعد ملازمت اور تنخواہ کا بھی مستحق نہیں ہے، الٹا اس کی جگہ جیل میں ہے۔ اسی طرح دین میں بھی شرطِ اوّل یہ ہے کہ دیانت داری سے فرائض پورے کیجیے، حقوق ادا کیجیے، لازمی ڈیوٹیاں انجام دیجیے اور پھر کچھ زائد خدمات کرکے خصوصی انعام کا شوق رکھیے۔ نہ یہ کہ فرائض سے کوئی مطلب نہیں، خدا کے احکام و حدود کی کوئی پروا نہیں، رسول اللہؐ کی سنت اور آپ کی تاکیدوں اور تنبیہوں کا پاس نہیں، حرام و حلال کا کوئی خیال نہیں — اور چلے ہیں چند فرقہ وارانہ عقیدوں اور خاص خاص اذکار کے بل پر حضورؐ کی شفاعت اور خدا کی جنت حاصل کرنے کے لیے!

دین سے تغافل

فرائض اور ضروریاتِ دین کے بارے میں لاپروائی، معاملات و اخلاق کے اچھا یا برا ہونے کے متعلق دلوں کی غفلت اور حلال و حرام کے احساس سے بیگانگی اور غلبۂ دین اور اقامت نظامِ حق کی جدوجہد سے لاتعلقی جو چاروں طرف پائی جاتی ہے اس میں بہت بڑا حصہ اُن واعظین کا ہے جو محراب و منبر پر قابض ہیں اور لوگوں کو اچھی اچھی میٹھی گولیاں کھلا کر دین کے ٹھوس عملی تقاضوں سے غافل کرنے کی خدمت نسلاً بعد نسلٍ انجام دے رہے ہیں۔

عوام میں یہ احساس رچ بس گیا ہے کہ زندگی میں جو چاہیں کرتے رہیں، بس کسی موقع پر ایک ختمِ قرآن کا انتظام، کسی عرس میں شرکت، کسی بزرگ کی قبر پر حاضری، کچھ دعائیں، کچھ اذکار، کبھی درود کی تسبیح خوانی اور کبھی سلام کے لیے کھڑے ہو کر زور زور سے یا رسول اللہ پکارنا یا لوگوں کا کلمہ سیدھا کرا دینا تمام گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہیں۔ یہ مذہبی تصوّر ایک ایسا چورن ہے کہ جس کے اثر سے حلال، حرام سب یکساں طور پر، ہضم ہو جاتا ہے اور جزوِ بدن بن جاتا ہے، بلکہ سرے سے حلال حرام کی تمیز اور فکر ہی سن ہو جاتی ہے۔

ہمارے ہاں کے قاتل، چور، جواری، مغوی، زناکار، خائن، راشی اور غنڈہ عناصر سب کے سب اس چورن کو استعمال کرتے ہیں۔

علماء و مشائخ کی ذمے داری

مجھے عرصہ دراز ہوا ہے کہ میں بار ہا مذہبی جلسوں میں شریک ہوتا رہا ہوں، نہایت ہی محترم دینی بزرگوں کی بہت سی تقریریں سنی ہیں، لیکن شاذ و نادر ہی کہیں کوئی ایسی گفتگو سنی کہ انسانوں کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے کون سے رویے ہیں جو ایمان کو نقصان پہنچاتے اور آخرت کے لیے خطرے کا باعث بنتے ہیں۔ اسی طرح میرے سامنے کم ہی کسی نے اس موضوع پر کلام کیا کہ رزق حلال کی اہمیت شرعاً کیا ہے اور رزقِ حرام میں کیا وبال ہے۔

اگر ایک بار تبدیلی آسکے کہ ہمارے مختلف فرقوں کے بزرگ یہ فیصلہ کرلیں کہ اخلاق و معاملات اور حلال و حرام کے متعلق عوام کے شعور کی آبیاری کرنی ہے تو بڑی تبدیلی آسکتی ہے۔

علماء کی جماعتیں بھی ہیں، اُن کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ اُن کے اندر آنے کی ایک شرطِ لازم یہ ہے کہ آدمی حرام سے اجتناب کی کوشش کرنے والا ہو۔ اسی طرح بے شمار پیر خانے ہیں۔ اگر مشائخ یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ کسی ایسے مرید کو اپنے حلقۂ بیعت میں شامل نہیں کریں گے، جو کسبِ حلال کی پابندی قبول نہ کرے اور اگر کوئی حرام ذریعۂ آمدنی (یا جائیداد) اس کے پاس ہو تو اسے ترک نہ کردے۔

میں تو یہ کہوں گا کہ ایک اسلامی معاشرے کے اندر جو سیاسی جماعتیں بنتی ہیں، وہ خواہ سیاسی لحاظ سے اپنے آپ کو سیکولر رکھنے پر اصرار کرتی ہوں، اپنے دستور میں ایک لازم دفعہ یہ رکھیں کہ حرام آمدنی یا اموال رکھنے والا شخص ہمارے دائرے میں داخل نہیں ہوسکتا تو پھر رزقِ حرام کی یہ گرم بازاری باقی نہیں رہ سکتی۔

مشکل تو یہی ہے کہ حرام آمدنیاں رکھنے والوں کو (خواہ وہ سود کی ہوں یا اسمگلنگ کی یا رشوت کی) ہر جگہ خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ سیاسی جماعتیں تو ذرا بعد میں آتی ہیں۔ مذہبی جماعتوں کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی مال دار آدمی ساتھ آجائے، خواہ اس کی آمدنی کیسی ہی ہو تو ان کے ہاں بہار آجاتی ہے۔ انھیں اگر بری سے بری کمائی والا آدمی اچھا چندہ دے دے تو اسے اپنی مجالس و تقاریب کا صدر تک بنانے میں مسرت محسوس کرتے ہیں۔

حرام خوری کے خلاف ہمارے معاشرے میں ایک زور دار مہم چلنی چاہیے جس میں

سربراہی تو مذہبی بزرگ اور مشائخ کریں، مگران کے پیچھے سیاسی لوگوں کے علاوہ ادیب اور صحافی اور ریڈیو ٹیلی ویژن کے کارکن سبھی محاذ آراء ہوں۔

ترقی پسند خواتین کا پارٹ

مالِ حرام کی وبائے عام کو بڑھانے میں جدت مآب ترقی پسند خواتین کا بھی حصہ ہے۔ یہ خواتین ایک طرف تو ٹھاٹ باٹ کا گھر چاہتی ہیں، اونچے معیارِ زندگی کی طرف اُڑان کرتی ہیں، دوسرے اپنے فیشن اور زیب وزینت پر خرچ کرنے میں ہم سطح خواتین کا مقابلہ کرتی ہیں۔ پھر کھیل تماشوں، سیر سپاٹے اور طرح طرح کی سوشل مجلسوں اور ثقافتی تقریبوں اور مینا بازاروں میں حصہ لیتی ہیں۔ اپنے گھروں پر اپنی اور ایک ایک بچے کی سالگرہ اوران کے امتحانات میں کامیابیوں کی تقریبیں خوب نمود ونمائش سے مناتی ہیں۔ یہ سارے سلسلے معاشرتی مرتبے (Status) کے بُت کی پرستش کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

نمود ونمائش کے اس طوفان کو زور پر رکھنے کے لیے وافر پیسے کی ضرورت ہوتی ہے اور وافر پیسہ متوسط درجے کی ملازمت یا کاروبار سے نہیں مل سکتا۔ اس کے لیے بیگم صاحبہ ایک تو خود اپنی ملازمت کی راہ نکالتی ہیں اور چھوٹے بچوں کو ''کے جی'' کے سپرد کر دیتی ہیں۔ پھر بھی کام نہیں چلتا تو وہ شوہروں پر دباؤ ڈالتی ہیں کہ دیکھو فلاں تو ایسی ایسی کوٹھی میں رہتا ہے اور فلاں کی کار بھی ہے اور فلاں کی بیوی یوں پیش پیش ہے۔ ایک تم ہو کہ چھوٹی سی تنخواہ کے کولھو کے بیل بنے ہوئے ہو۔ اور نہ رہنے کو ڈھنگ کا کوئی مکان، نہ مناسب فرنیچر اور کراکری، تمھاری بیگم کا یہ حال کہ کسی اچھی محفل میں جائے تو جمعدارنی معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح خاوندوں کو نالائق اور بے وقوف ہونے کا احساس دِلا دلا کر یہ انھیں تیار کرتی ہیں کہ وہ عوام کا خون نچوڑیں اور اس کی سرخی اُن کی آبرو بنے۔ بعض شعلۂ جوالہ قسم کی بیگمات تو تیز تیز آگے بڑھنے کے جوش میں اِس بری طرح پھسلتی ہیں کہ ساری عمر روح کے زخم چاٹتی رہتی ہیں۔ بصورتِ دیگر تمام احساساتِ شرافت وحیا کو اپنے آپ سے اس طرح الگ کر دیتی ہیں جیسے آنچل سر سے اُتار پھینکا جائے۔

اُٹھیے! خیانت کے خلاف

ایسے حالات میں پولیس کے اُس سابق ملازم کا کردار کتنا منفرد، کتنا گراں بہا اور روشن

نظر آتا ہے جس کا ذکر ابتداء میں کیا گیا ہے۔

خدا ہم کو اور ہر مسلمان کو ایسا ہی کردار عطا کرے۔ ہر طرف ایسے لوگ اُٹھ کھڑے ہوں جو دوسروں سے چھینے ہوئے حقوق اُن کو ادا کرنے کے لیے بے تاب ہوں۔ نیز جو لوگ اس وقت ناجائز کمائی کے لیے ظلم و خیانت سے کام لے رہے ہیں ان کو خدا کے سامنے جواب دہی کا خوف دلائیں۔ خدا کے ایسے شاہد و مجاہد درکار ہیں جو ظلم، رشوت، خیانت کے خلاف ذہنی اور اخلاقی فضا تیار کریں۔

کام کیا کریں؟

وہ میرا ایک عزیز ساتھی تھا۔ اُس نے دُکھے ہوئے دل کے ساتھ کچھ باتیں مجھ سے کہیں۔ اس کا سوالیہ سا دُکھڑا سن کر میں نے اس سے کہا:

عزیزِ من! آپ میں یہ احساس کیوں پیدا ہوا کہ آپ کے پاس کوئی کام نہیں؟ حق و انصاف کی گواہی دینے والے خدا کے سپاہیوں پر کبھی کوئی لمحہ ایسا نہیں آتا کہ اُن کے پاس کوئی کام نہ رہے، وہ فارغ ہوں اور پریشان ہونے لگیں۔

حالانکہ آپ نے خدا کے ہاں مزدوری کرنے والے محنت کاروں میں نام لکھوایا اور خدا کی فوج میں آپ سپاہی بھرتی ہوئے ہیں۔ ایک مزدور خوب جانتا ہے کہ اسے مالک کے کارخانے یا باغ یا کھیت میں کیا کام کرنا ہے، اسی طرح ایک سپاہی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ کن طاقتوں سے جنگ ہے اور وہ کہاں کہاں ہیں، کدھر کدھر سے کیا حملہ کر رہی ہیں اور ان کا مقابلہ کس کس محاذ سے کیسے کیسے کرنا ہے۔ آپ دوسروں کی طرف سے تجویزوں کا انتظار کرتے ہیں، آپ خود کیوں نت نئی مفید تجویزیں نہیں سوچتے؟ آپ اپنے بنے بنائے منصوبے مانگتے ہیں۔ آخر خود کیوں منصوبے تیار نہیں کرتے۔

مؤسّس تحریک کے بعد

عزیز بھائی! مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی جیسا صاحبِ علم وفکر اور مالک خلق و کردار قائد آپ سے جدا ہو گیا ہے[۱] اور یقیناً اس کا صدمہ ہونا چاہیے۔ لیکن آپ کی باتوں سے ایسا تاثر جھلکتا

[۱] اب کئی سال گزرنے کے بعد خود مجھے اندازہ ہونے لگا ہے کہ یہ تبدیلی کتنے گہرے اثرات رکھتی ہے۔ تحریک کا مؤسّس تحریک کی روح اور مزاج کا جس درجہ راز داں تھا اور اس کے تحفظ اور نشو ونما اور اسے خطرات سے بچانے کے لیے جیسی کاوشیں اس نے کی تھیں، ان کا سلسلہ آہستہ آہستہ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔

ہے، گویا کہ بات ختم ہوگئی۔ اب ویسا کوئی نہیں آئے گا اور ویسا نہیں ہوگا تو پھر کام کیسے ہوسکتا ہے۔

مولانا مودودیؒ پر ایسی موت وارد نہیں ہوئی ہے کہ اُن کی فکر اور اُن کی تحریک اُن کے نظر سے اوجھل ہوتے ہی ہوا میں اُڑ جائیں۔ وہ نہیں رہے تو بھی اُن کا قائدانہ فیض ہم میں جاری ہے۔ اور پھر شریعت کے جس تصوّرِ قیادت سے انھوں نے ہمیں آشنا کیا ہے اس کے لحاظ سے اگر کوئی شخص نیت کا مخلص، دین کے مقاصد کو جاننے والا، تحریک کی خاص روایات، قدروں اور شعائر کا رمز شناس اور ہم سفروں کی مرضی اور ہم سفروں کے مشورے کے ساتھ قافلے کو لے چلنے والا ایسا مل سکے جسے ہم اپنے اندر بہتر پاتے ہوں تو پھر اس کا احترام کیا جائے گا، اس کی اطاعت کی جائے گی اور اس کو اس کمزور کن احساس میں پڑنے نہیں دیا جائے گا کہ وہ چونکہ مولانا مودودیؒ نہیں ہے اس وجہ سے وہ کام نہیں چلا سکتا۔ ہمیں اسے یہ احساس دلانا ہے کہ اپنے معزز منصب کی وجہ سے تم بھی ہمیں ویسے ہی عزیز ہو، تم بھی ہماری بزم میں ویسے ہی فانوس روشن ہو اور تمھارے ایک ایک اشارے پر اسی طرح چلیں گے جس طرح مولانا مودودیؒ کے دور میں ہوتا رہا ہے۔ چاہے اس کی علمی سطح کم تر ہو، چاہے اس کی بعض آراء (نہ کہ بنیادی اصول، قدریں اور روایات) مختلف بھی ہوں۔ چاہے اس کا اسلوبِ کار کسی قدر جداگانہ انداز رکھتا ہو، چاہے اس کا مزاج مختلف ہو۔ ہم صرف یہ چاہیں گے کہ ہمیں معروف کا حکم دیا جائے اور منکر سے روکا جائے اور تمام معاملات مشوروں سے انجام پائیں۔ تمام لوگوں کو مقررہ دستوری اسالیب سے بات کرنے کا، اختلاف کرنے اور تنقید و محاسبہ کرنے کا حق حاصل رہے۔ یہ سب کچھ اگر حاصل رہے تو سمجھو کہ مولانا مودودیؒ کی قیادت جاری ہے۔

جب اجتماعیت کا ڈھانچہ ٹوٹ جائے

اجتماعیت کی ایک شرط اسلام میں یہ ہے کہ اگر دینی مقاصد کے لیے نظامِ مشاورت کے ساتھ کام چلایا جا رہا ہو تو آپ اجتماعیت کے فیصلوں پر منفی یا تنقیدی رائیں نہیں دے سکتے۔ ورنہ نجویٰ کا دروازہ کھول دینے کے بعد کوئی اجتماعیت صحت مندانہ خطوط پر نہیں چل سکتی۔ براہِ کرم کبھی بھی نجویٰ کے طرز پر غلط جگہوں پر باتیں نہ کریں۔ ورنہ آپ کا جذبۂ اخلاص تباہ ہو جائے گا۔

لیکن آج بڑی مشکل یہ ہے کہ سرے سے اجتماعیت کا ڈھانچہ توڑ دیا گیا[۱] ہے اور فرد فرد

[۱] مصنف کا اشارہ مارشل لا کی طرف تھا۔

بکھر گیا ہے۔ اس تبدیلی کا ایک تجربہ ہمیں پہلے ہو چکا ہے کہ ہم نے تنہارہ کر اپنے جذبۂ ایمانی کے چراغوں کو روشن رکھنے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں نفوذ کر کے لوگوں تک دعوتِ حق کو پہنچانے کے نت نئے راستے نکالے ہیں۔ آج کوئی انوکھی آزمائش درپیش نہیں ہے۔ اس وقت ہر فرد کو ایک امت بن کر کام کرنا ہے۔

ایسے مرحلۂ آزمائش میں سب سے زیادہ خطرہ یہ ہوتا ہے کہ افراد اگر پہلے سے باشعور اور تربیت یافتہ نہ ہوں تو الگ الگ بولیا بولنے لگتے ہیں اور طرح طرح کے اختلافات رونما ہوتے ہیں۔ اسی لیے حضورؐ نے انتباہ دیا تھا کہ اجتماعیت سے محروم آدمی تو ریوڑ سے کٹی ہوئی اکیلی بکری کی طرح ہے جسے گرگ طینت شیطان لقمہ بنا لیتا ہے۔ مگر دین تو اس لیے بھی ہے کہ بکری کو اتنی شیری سکھا دے کہ اگر کبھی ریوڑ رہے بھی نہیں تو تنہا بکری بھی اپنی حفاظت کر سکے۔

ایسے دورِ خلا میں ایک خطرہ اور بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ آدمی نے جن دل چسپیوں کو چھوڑ دیا تھا، جس سلسلۂ مفاد سے انقطاع کر لیا تھا، جن غیر ضروری تعلقات کو فراموش کر دیا تھا، وہ چاروں طرف سے اُمڈ آتے ہیں۔ دولت کمانے کا جنون، جائیدادیں بنانے کے پروگرام، بیوی بچوں کی دَبی ہوئی خواہشات اور قبیلے اور خاندان کے ناقابلِ قبول رواج سب اپنا اپنا دباؤ ڈالتے ہیں، یہاں تک کہ ایک مردِ حق اس میں پوری طرح منہمک ہو جاتا ہے۔ نہ اُس کے پاس وقت رہتا ہے، نہ حقیقی لگن باقی رہتی ہے ــــ اپنی اس زوال پذیر حالت پر ضمیر کو مطمئن رکھنے کے لیے وہ پکارتا ہے کہ کوئی بتائے کہ مجھے کیا کام کرنا چاہیے۔

عزیزِ من! اگر نماز روزہ کی ادائی کے لیے کسی سے پوچھنا نہیں پڑتا تو آخر دعوتِ حق کو خدا کے بندوں تک پہنچانے، خدمت کے کام کرنے، لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے، دینی و ملّی مقاصد کے طرف عوام کی توجہ دلانے کے کاموں میں کسی سے دریافت کرنا کیا ضروری ہے؟ نماز باجماعت ادا کرنے پر اگر پابندی ہے تو اپنی اپنی انفرادی نماز پر تو کوئی قدغن نہیں!

مایوسی خطرناک ہے

عزیزِ من! میں نے تمھیں اپنوں اور بیگانوں کے درمیان بیٹھ کر مایوسی پھیلاتے دیکھا ہے۔ میرے شعور کے مطابق یہ بہت بڑا جرم ہے کہ لوگوں کو دین، دعوتِ دین، اسلامی تحریک،

اسلامی شخصیتوں اور اسلامی اداروں کے متعلق مایوس کیا جائے، یا کسی بھی ایسی تنظیم (موجودہ یا سابق) کے متعلق بدظن کیا جائے جس نے انھیں توانائی بخشی ہو۔

مسلط شدہ باطل نظاموں اور غیر اسلامی حکومتوں کے خلاف اٹھنے والے کمزور اور قلیل التعداد اور بے سروسامان لوگوں کا سرمایہ کار ہی ایمان وامید ہوتا ہے۔ ایمان وامید ہی کی برکت سے ان کی تعداد بڑھتی ہے، ان میں قوت آتی ہے، وہ شدائد کا مقابلہ کرتے ہیں، وہ جدوجہد کی طویل ہوتی ہوئی راہوں پر سے مارچ کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ آخر وہ کامیابی تک پہنچتے ہیں۔ ایمان یا امید کی قوت کو اگر کمزور کر دیا جائے تو دین کا سارا کام خراب ہو کر رہ جائے گا۔ لوگوں کو دین کے متعلق یہ امید رہنی چاہیے کہ یہ غالب ہوسکتا ہے بلکہ ضرور ہوگا۔ پھر جس شخص یا جماعت نے دین کے متعلق ان کی امیدیں استوار کی ہیں، اس کے ساتھ بھی اُن کی امیدوں کو وابستہ رہنا چاہیے کہ یہ قوت ہمیں کامیابی کی طرف لے جاسکتی ہے اور لے جا رہی ہے۔ کسی جماعت کے ساتھ اُمیدیں اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہیں کہ اس کی قیادت کو مطعون ومعتوب نہ کیا جائے۔ (ماسوا اس کہ ٹھوس وجوہ موجود ہوں اور اپنی آواز مقررہ تنظیمی راستے سے اٹھائی جائے اور ضرورت ہو تو قیادت کو بدل دیا جائے)

لیکن آج جس جماعت کا نظم موجود ہی نہیں، اس کے بکھرے ہوئے ارکان میں تو مصیبت زدگی کا احساس ہونا چاہیے۔ جیسے کسی بستی میں زلزلہ آ گیا ہو، مکان گر گئے ہوں اور لوگ پراگندہ ہو گئے ہوں۔ ایسے نظم کے لیڈر، دانشور، ارکان، کارکن ہمدرد اور متفق سب کے سب مصیبت میں ہیں۔ ان میں باہم صرف ہمدردی و دل سوزی کا رشتہ ہوسکتا ہے۔ ایک دوسرے پر اعتراض اٹھانے اور ایک دوسرے کے متعلق مایوسی کا اظہار کرنے کا یہ کون سا موقع ہے، جو لوگ دوسروں سے مایوسی کا آغاز کرتے ہیں اُن کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے مایوس ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ سے مایوسی جدوجہد کی اس دنیا میں ایک طرح کی خودکشی ہے۔

وہ کرب جو ایک معطل شدہ دینی جماعت کا کارکن محسوس کرتا ہے کہ اب اُسے کہیں سے رہنمائی نہیں مل رہی ہے، اس کے مقابلے میں سابق اہلِ قیادت کا کرب دسیوں گنا زیادہ ہے جو یہ محسوس کرتے ہوں گے کہ جس بھاری بھرکم مشینری کو چلانے کے وہ ذمہ دار تھے۔ اُسے اُن کے سامنے سے غائب کر دیا گیا ہے اور اُس کے تمام پُرزے الگ الگ ہو چکے ہیں۔ اب خود ان

اکابر میں سے بھی ہر فرد کسی عام کارکن کی طرح ایک تنہا فرد بن کر رہ گیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ کارکنان کو ذاتی کرب سے بڑھ کر اپنے سابق اہلِ قیادت کے بھاری اور وسیع کرب کو محسوس کرنا چاہیے اور ان کے لیے انتہائی دل سوزی ان میں کارفرما ہونی چاہیے۔

اس حالت میں تو صورت تلافی ایک یہی ہے کہ ہر فرد تنہا ہو کر بھی پہلے سے زیادہ ایمان، پہلے سے زیادہ اُمید کے ساتھ اور پہلے سے زیادہ سرگرمی سے کام کرے تاکہ جب کبھی حالات اپنی جگہ پر واپس ہوں تو ہر ایک یہ محسوس کرے کہ اس غیر تنظیمی دور میں ہم نے ذہن اور کردار اور ماحول پر اثر اندازی کے لحاظ سے بہت اچھی نشو ونما پالی ہے اور ہم پہلے سے زیادہ بڑی قوت بن چکے ہیں۔

تنہا کارکن کے لیے کام کا راستہ

عزیزِ من! تم اگر خدا سے باندھے ہوئے میثاق پر قائم ہو تو چاہیے تھا کہ وقت نکال کر گھر سے دعوتِ حق کا علَم اٹھا کر نکل کھڑے ہوتے، محلے کے ایک ایک دروازے پر دستک دیتے، خاندان کے ایک ایک فرد سے ملتے، خاص خاص تعلقات کے دائروں میں پہنچتے، دیہات کو روانہ ہو جاتے، ہسپتالوں اور جیلوں کے مصیبت زدگان تک پہنچتے، مسجدوں کے حلقہ ہائے درس اور دائرہ ہائے ذکر و فکر میں شامل ہوتے، ادب کی محفلوں میں بیٹھتے، چوپالوں میں جا کر قلوبِ زندہ کی تلاش کرتے، درس گاہوں میں پہنچ کر طلبہ کی نوخیز روحوں تک خدا و رسولؐ کی تعلیم پہنچاتے۔ مہاجرین افغانستان کے لیے چندہ جمع کرنے پر ہر روز کچھ وقت صرف کرتے، لوگوں کو افغانستان میں روسی جارحیت کا حال بتاتے اور انھیں اشتراکیت کے انسانیت کُش فلسفے اور اُس کی خونم خون تاریخ کے اوراق دکھاتے، روس والوں نے وسطِ ایشیا کی جن ریاستوں کو پہلے کئی کئی سال تک مسلمانوں کی مزاحمت کو کچلنے کے بعد نخچیر بنایا ہے، ان کا دکھڑا بیان کرتے، جبری الحاد کی بھاری چٹان کے نیچے جس طرح اسلامی عقیدوں اور روایتوں کی رائے بیل کو دبا دیا گیا۔ اس کی داستان عام کرتے، تم لوگوں میں اسلامی جذبۂ جہاد کو بیدار کرنے کے لیے مارے مارے پھرتے۔ اور نہیں تو گھر پر درسِ قرآن کا مختصر سا حلقہ شروع کر دیتے، بچوں کو قرآنِ ناظرہ پڑھانے اور نماز سکھانے کا انتظام کرتے۔ عورتوں کے لیے سلائی کڑھائی کی تربیت کا معیاری نہیں تو غیر رسمی مرکز

اہل خانہ کے تعاون سے کھلوا لیتے۔ اپنی بیٹھک پر ان پڑھ عوام کے لیے دفتری کاموں سے متعلق درخواستیں لکھ کر دینے کا انتظام کرتے، محلے والوں سے رابطہ بڑھا کر ایک فلاح کمیٹی قائم کر لیتے اور اس کے زیرِ انتظام نوجوانوں کو کم سے کم ہفتے میں ایک بار جمع کر کے محلے میں اور خصوصاً محلے کی مسجدوں میں صفائی کی مہم چلاتے، مریضوں کو ہسپتالوں میں اور طلبہ کو درس گاہوں میں داخلہ دلوانے کے لیے سعی کرتے۔ ان کاموں کے ساتھ ساتھ دینی دعوت کا سلسلہ از خود جاری رہتا۔ ان راستوں پر چلتے ہوئے نئے نئے ساتھی اُٹھ کھڑے ہوتے اور ایک محدود سی اجتماعیت کا حلقہ بن جاتا ہے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے ہزاروں حلقے ملک کے شہروں اور دیہات میں اُبھر آتے اور اُن کی دعوتی سرگرمی کی زد سے کوئی شہر محفوظ نہ رہ سکتا۔

اندرونی سرچشمۂ کار

مگر عزیزم! تم اس بات کے عادی ہو گئے ہو کہ لکھے لکھائے پمفلٹ آ جائیں تو ادھر ادھر چند لوگوں کو تھما دو، یا پوسٹر تیار ہو کر از خود سامنے آ جائیں تو انھیں دیواروں پر چسپاں کرا دو، یا ماحول کے جائزے اور کارکردگی کی کوئی رپورٹ دفتر یا گھر میں بیٹھ کر خوش اسلوبی سے مرتب کر دکھاؤ، کوئی مامور شدہ ذمہ دار آ جائے تو اس کے ساتھ باتیں ہو جائیں اور کسی محفل آرائی کی ضرورت ہو تو اس کا بندوبست کر لیا جائے۔

ایمان و مقصد کی آبیاری

میرے سامنے اس وقت اشد ضروری بات یہ ہے کہ آیا خادمانِ دین اور داعیانِ نظام حق موجودہ[۱] ہنگامی دور سے گزرتے ہوئے اپنے بنیادی عقیدے، جذبے، شعور اور نصب العین کو اسی طرح تروتازہ اور جان دار رکھنے میں کامیاب ہیں، جیسا کہ وہ ان میں کبھی پہلے تھا۔

ایمان و مقصد کی آبیاری تو مطالعۂ قرآن و حدیث، اساسی عبادات کی پابندی اور ان سے صحیح ایمانی و شعوری استفادہ اور نظامِ سمع و طاعت کے احترام سے ہوتی ہے۔ دینی کردار کے لیے مزید توانائی کا حصول متعدد دوسری تدبیروں سے ممکن ہے، مثلاً مخلوقِ خدا کی مختلف امکانی طریقوں سے خدمت، خاندان، پڑوس اور اس سے وسیع حلقے کے مستحقین کی مدد، نادار طلبہ، محنت کش غرباء، محتاج، بیماروں، نیز، بیواؤں، یتیموں اور معذوروں کو اپنے مال اور قوتِ بازو اور اپنے وسائل سے سہارا دینے کی بے تابانہ سرگرمی اور پھر سب سے بڑھ کر خواص و عوام کے زیادہ سے زیادہ حلقوں کے اندر، زیادہ سے زیادہ افراد تک خدا اور رسول کی پکار کو پہنچانے کی مجاہدانہ تگ و دو۔ جتنی زوردار یہ کوششیں رہی ہوں گی، ان کی شادابی آپ کے ایمان میں اور ویسی ہی تروتازگی آپ کی محبت نصب العین میں موجود ہوگی۔ یہ اگر نہیں ہے تو بلاشبہ اس میں کچھ دوسروں کی کوتاہیوں کا حصہ بھی ہوسکتا ہے اور کچھ آپ کے ماحول اور مسائل کا اثر بھی پڑسکتا ہے، مگر بہرصورت عنداللہ سب سے پہلی اور بڑی ذمہ داری آپ کی ہے، خصوصاً جس دن سے خدا کے کسی بندے نے آپ کو تحریکِ اقامتِ دین کا شعور دلایا، اُس دن سے ذمہ داری کے بوجھ کا زیادہ بڑا حصہ آپ کے کندھوں پر لد گیا۔

اب جو باز پُرس آپ اور مجھ سے آخرت میں ہوگی، ہوسکتا ہے کہ تھوڑی بہت رعایت ہمیں دوسروں کی کوتاہیوں اور ماحول کی مشکلات کی وجہ سے مل جائے، مگر ہم پوری طرح یہ ثابت

---

[۱] مراد مارشل لا ۱۹۷۸ء

نہ کرسکیں گے کہ ہمارا اپنا پارٹ زیادہ تر ٹھیک رہا۔بس غیر اختیاری وجوہ سے کہیں کوئی کسر رہ گئی۔ دوسروں کی واقعی اگر کوئی کوتاہی ثابت ہوگی تو اس کا حساب انھیں دینا ہوگا۔لیکن اُن کو اگر بڑی سے بڑی سزا بھی مل جائے تو وہ سزا مجھے اور آپ کو بخشوا نہیں سکے گی۔

ٹھنڈی یخ دلدل میں

ملک کے دینی لوگ جو آپس میں مل بیٹھنے پر ''کارِدین'' کی کمی کا رونا روتے ہیں، میرا مشاہدہ ہے کہ وہ سارا الزام دوسروں پر دھرتے ہیں (چاہے وہ اُن کے اپنے ساتھی یا پیش رَو ہوں، چاہے حکومت اور اس کے کارکن ہوں، چاہے مخالفین اور معاندین) اور گفتگو جب اس رخ پر چل نکلتی ہے تو اصل مبحث فراموش ہی ہو جاتا ہے۔ ہر دو دو چار چار ملنے والے بات کرتے کرتے ایک عدالت کا روپ دھار لیتے ہیں۔اور کسی بھی غیر حاضر ملزم کو کٹہرے میں کھڑا کر کے اس پر فردِ جرم لگا دیتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ خرابیٔ احوال اور کوتاہی کار کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہیں۔کم سے کم میرا تجربہ ومشاہدہ یہی ہے کہ اس قسم کی پرائیویٹ مجالس اور گفتگوؤں میں خود شرکاء یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کا فرض کیا ہے اور ان کے امکان میں کیا کچھ ہے۔ اور انھیں کن کمزوریوں یا مشکلات کو دور کر کے سعی و جہد کرنی ہے اور انھیں یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ خود ایک کمزور پرزہ بن جانے کے بعد نیکی پھیلانے والی ساری مشینری پر کیسا برا اثر ڈالتے ہیں۔اور اگر ایسے ہی چند پرزے اور موجود ہوں جن میں سے کوئی ناکارہ ہو جائے، کوئی اَڑ اَڑ کر چلے، کوئی بار بار ساتھ کے پرزوں کو خراب کرے تو مجموعی نتیجے پر کیا اثرِ بد پڑے گا۔

میں ایسی گفتگوؤں کو ترس گیا کہ دینِ برحق کی دعوت پھیلانے والے دو چار دوست مل کر یہ سوال اٹھائیں کہ آؤ بھائیو! یہ سوچیں کہ ہمارے اندر ایک عرصے سے برف کیوں گرنے لگ گئی ہے، ہمارے جذبات آئس کریم کیوں بنتے جارہے ہیں؟ ہم ایک ٹھنڈی یخ دلدل میں آہستہ آہستہ نیچے جارہے ہیں، آخر کیوں؟ اور پھر اس پر غور کریں کہ ہمارے اندر کس چیز کی کمی ہے؟ پہلے ہم کیا کرتے تھے جواب نہیں کرتے، یا پہلے کیا نہیں کرتے تھے جواب کرنے لگے ہیں؟ پھر وہ یہ مثبت قدم اٹھائیں کہ ہم بحالاتِ موجودہ (In some given conditions) اپنی قوتوں کو دین کی سربلندی کے لیے کس کس طرح استعمال کرسکتے ہیں اور جو کمی رہ گئی ہے اس کی تلافی کیسے کرسکتے ہیں۔

خود احتسابی

میں تو کہتا ہوں کہ سچے مومن کا کام یہ ہے کہ وہ تنہائی میں خود ہی اپنے متعلق سوچے کہ وہ کہاں کہاں کوتاہی کر رہا ہے اور اُسے کس کس سرگرمی کا آغاز کر دینا چاہیے۔ نماز اسی لیے پڑھی جاتی ہے کہ قیام وقعود اور رکوع وسجود میں اپنا اپنا احتساب کرے، بستر پر جاتے ہوئے دن بھر کا چٹھا کھول کر نگاہوں کے سامنے رکھے، صبح جب "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَآاَمَا تَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْر" پڑھتا ہوا اُٹھے اور دروازے سے جب "بِسْمِ اللّٰهِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰهِ" پکار کر قدم باہر نکالے تو نئے دن کا نیا پروگرام (Order of the day) اُس کے سامنے ہونا چاہیے۔

اس تجربے کی ابتدا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ ہم اپنی گھریلو نشستوں اور پرائیویٹ گفتگوؤں کے متعلق طے کرلیں کہ دوسروں پر الزام لگانے اور اُن کے خلاف شکایات بیان کرنے کے بجائے ہم پہلے اپنے خلاف الزام لگائیں گے اور اپنے بارے میں شکایات کو زیرِ بحث لائیں گے۔ اور کوتاہی یا غلطی کی تلافی کریں گے۔ کسی دوسرے سے کوئی شکایت ہوگی تو پھر اس سے جا کر خلوص اور خیر خواہی اور اپنے ضمیر کی صفائی کے ساتھ بات کریں گے۔

بدقسمتی سے ہماری اکثر وبیش تر گفتگوئیں غیبت ونجویٰ کے دائرے میں چلی جاتی ہیں اور ہم اپنے گرد آلود ایمان اور جذبات پر کئی غلاظتیں ڈال کر اُٹھتے ہیں۔

یہ دین کا کام کرنے والے حلقوں کے لیے بڑی دور مار تباہی کے اسباب ہیں۔

ہمارا بنیادی سرمایۂ کار

دینی کام کے لیے بہت بڑا سرمایہ محبت واخوت کا ہے۔ خدا کی راہ میں گامزن ہونے والے قلیل التعداد گروہ اس محبت واخوت کے ذریعے ''دو اور دو چار'' کے بجائے ''دو اور دو مساوی ۲۲'' ثابت ہوتے ہیں۔

خادمانِ حق میں محبت واخوّت کا تعلق اوّلاً اس ایمان پر قائم ہوتا ہے کہ ہم ایک خدا کے بندے ہیں، ایک رسولؐ کے مشن کے خادم ہیں اور ایک ہی نصب العین کے حصول کے لیے منظّم فوج بن کر کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح مشترک مخالفتوں کا احساس اتحاد و محبت کا باعث بنتا ہے اور ہم ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر سیلاب کی موجوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور جس کے قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں اُسے دسیوں ساتھی سہارا دینے کو موجود ہوتے ہیں۔

از دیادِ محبت کے اصول اور طریقے قرآن وحدیث میں بیان کیے گئے ہیں۔ حسن ظن اور سلام و ہدیہ سے لے کر ہمدردی و ایثار تک کے سارے راستے بتائے گئے ہیں۔ اور خاص طور سے ذاتی رابطوں اور ذاتی احوال میں دل چسپی لینے کا احساس دلایا گیا ہے۔

دوسری طرف اہلِ دین کے رشتۂ محبت واخوت کو تباہ کرنے والی چیزیں بہت سی ہیں جن کا قرآن وحدیث میں بیان ملتا ہے۔ ان میں تحقیر آمیز استہزا، بدکلامی، غیبت، بہتان اور نجویٰ جیسی چیزیں اوّل درجے پر آتی ہیں۔

یہ خرابی بھی کچھ کم ضرر رناک نہیں ہے کہ کسی فرد یا کسی گروہ پر تنقید واختلاف کو خود اس کے سامنے لانے کے بجائے اِدھر اُدھر پھیلایا جائے اور مشورت کے راستے سے جہاں معاملات ہو رہے ہوں، وہاں تو رائے دہی یا اختلاف کے حق کا صحیح طریق سے استعمال نہ کیا جائے، بعد میں

فیصلوں اور پالیسیوں کے خلاف رائے زنی کی جائے۔ علاوہ ازیں جب رائے دہی، اظہارِ اختلاف اور تنقید واحتساب میں حقِ نُصح کی ادائیگی کا اہتمام نہ کیا جائے، یعنی اُس میں روحِ خیر خواہی موجود نہ ہو اور اُن اُمور کے لیے متوازن ذہن کے ساتھ مناسب الفاظ اور لہجہ اختیار نہ کیا جائے اور بہت سے دوسرے لوگوں کے کسی رائے پر جمع ہو جانے کے بعد اپنی ذاتی رائے کو باقی رکھ کر اُسی کے مطابق اپنی روش بنائی جائے تو اس طرح دین کا کام نہ کبھی چلا ہے، نہ آئندہ چل سکے گا۔

اقامتِ دین کی سعی بڑے اونچے حوصلے اور اوالعزمی کا کام ہے۔ اس کے لیے ذہنی توازن، دوسروں کے ساتھ جذبۂ ہم آہنگی اور ذاتی رایوں کے خلاف ہونے والے فیصلوں کی پیروی لازم ہے۔ ماسوا اس کے کہ آپ کے سر کتاب وسنت کے نصوص کے صریحاً خلاف کوئی چیز ٹھونسی جارہی ہو۔

روزمرہ کام کے لیے طریق کار دعوت کے بنیادی اصولوں کے تحت سوچے اور اختیار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً فرض کیجیے کہ فیصلہ یہ ہے کہ تعلیم بالغاں کے ذریعے کام کرنا ہے تو پھر ایک دیانت دار داعیٔ حق کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی ساری سوچ، اپنے دوستوں کے سارے مشوروں اور قابلِ عمل ساری تدبیروں کے ساتھ تعلیمِ بالغاں کو ذریعۂ دعوت بنائے اور کوئی اختلافِ رائے اس کی سرگرمیٔ عمل کو کم نہ کر سکے۔ اگر اُس کا دائرۂ کار پہلے سے الگ متعین ہو تو اور بات ہے۔

ایسے ہوتے ہیں سچے داعیانِ اقامتِ دین!

محبت واخوّت ونزاعات

محبت واخوت کی فضا کو تباہ کرنے کا باعث افراد کی باہمی نزاعات بھی ہوتی ہیں۔ کچھ نزاعات کا تعلق زبان کے غلط استعمال سے ہوتا ہے اور کچھ کا تعلق نامناسب رویے سے، کبھی کسی کی معمولی سی حق ماری (جیسے اس کی نشست پر اس کی اجازت کے بغیر قبضہ جمالیا، یا کسی کے راز کو افشا کیا، یا کسی کی کوئی چیز ضائع کر دی) سے تعلقات میں تکدّر پیدا ہو جاتا ہے۔

ایسے معاملات میں نہایت ہی سہل طریقہ جذبۂ صادق کے ساتھ معافی طلب کر لینا ہے۔ طلبِ عفو رسمی اور نمائشی بن جاتی ہے، اگر اس کے ساتھ قلبی ندامت شامل نہ ہو۔ بطورِ خود معافی کا حصول اور تعلقات کی بحالی کی مہم سر نہ کی جاسکتی ہو تو کسی تیسرے آدمی سے مدد لی جاسکتی

ہے۔ بہر حال دو مسلمانوں کو جلد سے جلد تعلقات کو بحال کر لینا چاہیے۔ صرف ظاہری تعلقات ہی نہیں، قلبی تعلقات بھی۔[۱]

محبت و اخوت کی تباہی کا ایک باعث باہمی معاملات کی خرابی ہوتا ہے۔ مثلاً مل کر کاروبار کرنے والے ساتھی اگر ایک دوسرے کے حقوق کا نقصان کریں، یا اپنے حصے سے زیادہ مال اڑا لیں۔ یا طے شدہ معاہدے کی خلاف ورزی کریں، یا واجبات کی حسبِ وعدہ واپسی نہ کریں، یا حسابات کو چھپائیں تو ایسی تمام امکانی صورتوں میں سے کوئی بھی برادرانہ تعلقات کو خراب کر سکتی ہے۔

اس کا علاج سوائے اس کے کیا ہے کہ معاملات اور تقسیمِ حقوق و فرائض کو تحریری شکل میں لایا جائے۔ مفاد کی دنیا میں امورِ معروف کی پابندی میں کوتاہی ہو جائے تو از سرِ نو پابندی اختیار کی جائے۔ پہلے جو غلطی کی جا چکی ہو اس کی تلافی اور معافی کی کوشش کی جائے۔ کاروبار اور دولت سے زیادہ عزیز اپنے بھائی کو رکھا جائے۔ کوئی الجھن واقع ہو تو ٹھنڈے طریق سے تبادلۂ خیال کیا جائے۔ معاملات کا تجزیہ کیا جائے، حسابات دیکھے جائیں، شہادتیں حاصل کی جائیں، وضاحت کی ضرورت ہو تو وضاحت کی جائے، ثالثی کی ضرورت پڑے تو کسی معتمد علیہ بزرگ یا مشترک دوست کو ذریعہ بنایا جائے۔ کسی مرحلے پر نوبت تو تکار، گالم گلوچ اور دھینگا مشتی تک نہیں پہنچنی چاہیے، کیونکہ یہ نفاق کی ایک علامت ہے، کہ جب نزاع پیدا ہو تو کوئی شخص فجور کا راستہ اختیار کرے۔

لیکن جو فریق سچّا خدا پرست ہے وہ مال کا نقصان گوارا کر لے، لیکن یہ گوارا نہ کرے کہ (غلطی خواہ دوسرے کی ہو) اس کی اخلاقی ساکھ خراب ہو، یا تھوڑے سے مال کی وجہ سے ایک مسلمان بھائی سے ہمیشہ کے لیے مقاطعہ ہو جائے۔ چھوٹے موٹے مفاد اور تھوڑے بہت مال سے دست بردار ہو کر بھی حلقۂ تعارف کو یہ تاثر نہ لینے دیا جائے کہ اسلام کا کام کرنے والا فلاں شخص جھگڑالو یا مفاد پرست ہے۔

مزید یہ کہ اگر قرض دیں تو اتنا دیں کہ اگر وہ واپس نہ ہو سکے تو آپ شروع ہی سے اسے

---

[۱] حدیث کے مطابق قلبی تعلقات کی صحت کا معیار یہ ہے کہ آدمی اپنے بھائی کے لیے وہی پسند یا ناپسند کرے جو اُسے خود اپنے لیے پسند یا ناپسند ہو۔

معاف کرنے کی نیت رکھتے ہوں۔ کسی کی مالی ضمانت دینے سے بہتر یہ ہے کہ زرِ ضمانت اپنی طرف سے ہدیہ کردیں۔ قرض لینے کے بارے میں حد سے زیادہ اجتناب کرنا چاہیے۔ جائیدادیں اور مکان بنانے یا کاروبار چلانے یا نیچے کے معاشی دائرے سے نکل کر اوپر کے دائرے تک پہنچنے کے لیے دوسروں سے بڑی بڑی رقمیں اپنے مالی حالات کے حقیقت پسندانہ جائزے کے بغیر لے لینے کا نتیجہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ ایسی ادائیگیاں ناممکن ہوجاتی ہیں اور اس طرح کی بعض مثالیں میرے نوٹس میں ہیں کہ ایک پارٹی نے دوسری سے قرض لے کر اپنے آپ کو اونچا ضرور اٹھالیا مگر پھر وہ قرض کبھی واپس نہ ہوسکا۔ ہوا بھی تو کوئی جزوی اور بقیہ ملیا میٹ ہوگیا۔ جانتے بوجھتے دوسروں کے پیسے پر کسی جھونپڑے والے کا اپنی امارت کا محل کھڑا کرنا عجیب قسم کا رومانوی (Romantic) معاملہ ہے جو کبھی کبھی عیاری و چالاکی کی حدوں کو چھو لیتا ہے۔ ایسا طرزِ عمل اسلام کے کسی سچے خادم کو کبھی اختیار نہیں کرنا چاہیے اور کسی وجہ سے ایسے واقعات میں وہ پھنس جائے تو راہِ نجات یہ ہے کہ جو قصرِ دولت کھڑا کیا ہے وہ پورا یا اُس کا کوئی حصہ (حساب کے مطابق) خوش دلی سے قرض خواہ کے حوالے کردیا جائے۔ متوسط الحال بلکہ غریب طبقوں اور اس کی بالائی سطح سے تعلق رکھنے والوں کو چھوٹے موٹے قرض صرف اس صورت میں لینے چاہئیں جب کہ کسی بیماری، مقدمے یا دیگر مصائب کی وجہ سے براوقت پیش آجائے اور ایسی ہر رقم کی واپسی کی اول روز سے پختہ نیت ہونی چاہیے۔ اور اس کی ادائیگی کے لیے دعائیں (بعض مسنون دعائیں بھی ہیں) کرنی چاہئیں۔ اور پھر اگر ساری کوشش کے باوجود بروقت پوری رقم یا مقررہ قسط کی ادائی نہ ہوسکے تو تہ دل سے معذرت کرکے مزید مہلت حاصل کی جاسکتی ہے اور اگر ایک لمبے عرصے کی کوشش کے باوجود نہ تو زائد آمدنی حاصل کرکے یا بچت کرکے رقم واپس کی جاسکی ہو اور نہ اپنی کوئی چیز بیچ کر حساب چکانا ممکن ہو تو پھر لجاجت سے کوشش کرنی چاہیے کہ خواہ اپنی رقم معاف کردے۔ ایسا بھی نہ ہوسکے تو پھر کسی ایک یا چند دوستوں کے سامنے صورتِ حال رکھ کر درخواست کی جائے کہ کچھ لوگ آپ کے قرض کا بوجھ فی سبیل اللہ اتروادیں۔

تین باتیں

اوپر کی ساری گزارشات میں اہم ترین باتیں تین ہیں:

ایک یہ کہ کاروباری اشتراک میں کوئی بات ایسی نہ ہونی چاہیے کہ آپ کی آمدنی میں رزقِ حرام کا کوئی جزو شامل ہو جائے، خصوصاً اس حالت میں کہ آپ جانتے سمجھتے ہوں۔ زبردستی کی حاصل کردہ رقم ہو یا ہیر پھیر سے اخذ کردہ مال ہو، یا حسابات سے بالا بالا کوئی آمدنی ہو، یہ چیز آپ کے سارے رزق کو ناپاک کردے گی۔ اور جہاں رزقِ حرام پہنچ جاتا ہے، وہاں پھر نہ ایمان کی خیر ہے، نہ عبادات اوراذکار ودعوات کی۔ حدیثِ نبویؐ سے ظاہر ہے کہ غل وغش کا معاملہ اگر سوئی دھاگے جتنا بھی ہو تو شہید کی شہادت کی جزاء پر پانی پھر جاتا ہے۔

دوسرا یہ کہ قرض ایسی چیز ہے جو اگر مرتے دم آدمی کے ذمہ رہ جائے اور اس کی طرف سے ورثاء کو نہ تو وصیت کی گئی ہو اور نہ وہ ادا ہی کریں، تو خدا بچائے۔ ایک پیسہ بھی پہاڑ جیسی نیکیوں کے سامنے حائل ہو جائے گا۔

آخرت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو چھوٹے چھوٹے مالی اور معاملاتی امور میں ہم جو زیادتیاں ایک دوسرے پر کرتے ہیں وہ حد درجہ تباہ کن ہوتی ہیں۔

تیسری یہ کہ جیسے ہم اوپر بات کر چکے ہیں، کاروباری معاملات یا قرض کے بارے میں لاپروائی یا دیدہ ودانستہ غلط منفعت اندوزی تحریک اسلامی کے سپاہیوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے کدورت کا زہر بھی بھر دیتی ہے۔

یہاں داغ دار ضمیروں کی جگہ نہیں

کاروباری اور معاملاتی ذمہ داریوں میں جو لوگ کوتاہ ثابت ہوتے ہیں یا دانستہ گڑ بڑ کرنا جن کا وتیرہ ہوتا ہے، جو ایسی کسی بدمعاملگی کی وجہ سے بدنام ہوں، میرا علم وضمیر یہ کہتا ہے کہ اگر وہ جلد سے جلد اپنی اصلاح اور خرابیوں کی تلافی نہ کرسکیں تو انھیں تحریکِ اسلامی کے داعیوں کی صف میں کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔ میرے بس میں ہو تو میں کسی ایسے شخص کو یہ اجازت نہ دوں کہ وہ کسی اسٹیج سے دین کی سربلندی کے وعظ کہے، وہ نظامِ حیات یا اخلاق کو سنوارنے کے لیے عوام کا معلم بنے، یا وہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے عائد کردہ فریضۂ دعوت کا علم بردار بن کر کام کرے۔

اس قسم کے لوگ جب دین کا کام کرنے والوں میں گھس کر اپنے لیے پناہ گاہ تلاش کر لیتے ہیں تو وہ بہت سے نیک دل لوگوں کو شکار بناتے ہیں۔ اور فی الحقیقت اقامتِ دین کی مہم

کی سست رفتاری اور دوسروں کی سرگرمیٔ کار میں کمی کا باعث بنتے ہیں۔ ان کی وجہ سے مایوسی، بددلی، افسردگی اور ناکارہ پن کو فروغ ہوجاتا ہے کیونکہ داغ دار ضمیروں کے ساتھ خدا کی راہ میں بڑھتے چلے جانا ممکن نہیں۔ داغ دار ضمیر رکھنے والے عناصر دعوتِ حق اور غلبۂ حق کی جدوجہد کے لیے غیر محسوس طریق پر دیمک کا کام کرتے ہیں۔

کوئی فرد جو خدا کے دین کا خادم بن کے اُٹھے، جہاں وہ خود اپنے دامن کو مالی اور معاملاتی آلائشوں سے پاک رکھنے کی اُس طرح بے تابانہ فکر کرے، جیسے کسی نیک اور شریف گھرانے کی کنواری لڑکی اپنی عصمت کا تحفظ کرتی ہے۔ وہاں اس کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ ایسے افراد کو ہرگز پناہ نہ دے جو ایک طرف دین کے کام میں حصہ دار بنیں اور دوسری طرف لوگوں کی حق ماری اور دل آزاری کرنے والے ہوں۔ فرد کی طرح کوئی ایسا ادارہ یا ایسا گروہ جو اخلاص سے خدا اور رسولؐ کی دعوت پھیلانے کی ذمہ داری اپنے سر لے، اس کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ بدمعاملہ لوگوں کو بغیر اصلاح وتلافی کے اپنے اندر جگہ نہ دے اور کوئی ایسا آدمی اندر موجود ہو تو اس سے درخواست کرے کہ آپ تشریف لے جائیں تو آپ کا احسان ہوگا۔

اندھا دھند ووٹروں کا ریوڑ بڑھانے کا کام عام سیاست بازوں کا ہے۔ تحریکِ اسلامی کا طریقِ کار یہ نہیں۔ یہاں تو کھری دھات کی مانگ ہے۔ ادھر کھوٹے اور ملاوٹی مال کی مارکیٹ نہیں ہے۔

نجی سطح پر گہرے روابط

خادمانِ دین میں اخوت ومحبت کا رشتہ مضبوط رکھنے کے لیے ایک ضروری بات یہ ہے کہ کسی لائبریری یا جلسے یا خدمتِ خلق کی کسی مصروفیت میں جو میل جول ہوتا ہے وہ حصولِ مدعا کے لیے کافی نہیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ بات نہایت لازم ہے کہ جتنے لوگ بھی آپس میں ربط رکھ سکتے ہوں وہ ایک دوسرے کی ذاتی زندگی سے بھی دل چسپی لیں۔ اخباری اور قومی حالات پر گفتگوئیں، فلسفیانہ بحثیں یا دینی وفقہی نکات پر تبادلۂ خیالات سے ہٹ کر کبھی کبھار دو تین افراد کو نجی سطح پر مل بیٹھنا چاہیے تاکہ آنے والے کہہ سکیں کہ ہم صرف ایک بھائی کی ملاقات کے لیے آئے ہیں۔ پھر بات چیت میں معلوم کریں کہ اس کی معاش کیا ہے؟ مالی مسائل کیا ہیں؟ اس کے کتنے

بچے ہیں؟ اس کے چھوٹے بچوں کی تعلیم کیسے ہورہی ہے؟ اور بڑے بچے کس روزگار میں ہیں؟ ان سب کے دینی شعور کا کیا حال ہے؟ گھر میں کسی بیماری سے سابقہ تو نہیں؟ لڑکوں، لڑکیوں کے مستقبل کیا پیشِ نظر ہیں؟

یہ ضروری نہیں کہ سارے سوال و جواب ایک وقت میں ہو جائیں اور آدمی دوسرے کا انٹرویو لینے بیٹھ جائے۔ نجی اور گھریلو معاملات کسی قدر حجاب میں رہتے ہیں۔ اور ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے پردہ بالکل الٹ نہ دینا چاہیے۔

پھر یہ حقیقت تمام دوستوں کو جاننی چاہیے کہ کسی آدمی کے اندر اتر کر اس کے دل کی دھڑکنوں میں شامل ہونے والے احوال و مسائل کو جاننا آسان نہیں ہے، کوئی شخص دل کا دروازہ اس طرح نہیں کھول دیتا جیسے آپ شیروانی کے بٹن کھولتے ہیں۔ اپنے کسی بھائی کو پوری طرح جاننا، پوری طرح سمجھنا اور پوری طرح اُس کی دوستی کا حق ادا کرنا خلوص و اعتماد کے بغیر ممکن نہیں۔ خلوص و اعتماد کارفرما بھی ہو اور خلوص و اعتماد کو مخاطب محسوس بھی کرلے۔ ایک ملاقات میں نہ سہی، چار چھ دس ملاقاتوں میں سہی۔ دین کی سچی خدمت کرنے والے بھائیوں کے اندر چھپے ہوئے اس آدمی کا مطالعہ کیجیے جو دوسرے کئی لوگوں کی طرح مسائل کے دلدل میں لت پت ہے۔ ہو سکے تو کسی مشکل کو جاننے کے بعد احسان دھرے بغیر اسے اپنی ٹھوس عملی تائید سے بہرہ مند کیجیے۔ یہ ممکن نہ ہو تو کسی دوسرے دوست کو مدد کے لیے اٹھایے، یہ بھی نہیں تو کم از کم اچھے الفاظ سے اسے سہارا دیجیے، مگر بناوٹی الفاظ سے نہیں حقیقی دردمندانہ الفاظ سے۔

مثلاً بیمار پُرسی کے حکم کا مدعا اتنے سے پورا نہیں ہو جاتا کہ آپ گئے اور ہاتھ پیشانی پر رکھا اور مسنون طریق سے کہا کہ ”لاباس طھور ان شآء اللّٰہ“ بلکہ آپ کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ جانیں کہ علاج کافی اور معیاری ہو رہا ہے یا نہیں؟ علاج کے مصارف کا انتظام ہے یا نہیں؟ تیمارداری کے لیے گھر کے افراد کافی ہیں یا نہیں؟ مریض ہسپتال میں ہے تو وہاں کی بھاری آزمائشیں کیا کیا ہیں اور کس پیچیدگی کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح جنازوں کی مشایعت اور غم زدگان کے ساتھ تعزیت کے لیے چند کلمات افسوس کہہ کر دعا کر دینا ہی سب کچھ نہیں ہے، یہ بھی تو معلوم کیجیے کہ مرحوم کے سر کیا بوجھ باقی رہ گئے اور مرحوم کے پسماندگان کو کیا مشکلات درپیش ہیں۔ پھر کسی کا کاروبار تباہ ہو جاتا ہے، کسی کی ملازمت چھوٹ جاتی ہے، کسی کے ہاں چوری

ہوجاتی ہے،کوئی غنڈہ کی ماردھاڑ کا نشانہ بنتا ہے،کسی کو پولیس کے ہاتھوں پریشانی پیش آتی ہے، کوئی دفتری دنیا میں دھکے کھا رہا ہے،کوئی کچہریوں کی انسانیت کش فضاؤں میں انصاف ڈھونڈتا پھرتا ہے،غرضیکہ انسانی زندگی کے ہزار چکر ہیں۔ان چکروں میں پڑنے والے کسی بھائی کو یہ محسوس نہ ہونے دیجیے کہ وہ تنہا ہے اور اس کو تھامنے اور سہارا دینے کے لیے خدا کے سوا اس محسوس دنیا کا کوئی ہم نفس اور ہمدرد فرد موجود نہیں ہے۔

اپنے دل میں حالات کا جائزہ لے کر خود ہی فیصلہ کیجیے کہ آپ پر اس سلسلے میں جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں، کیا اُن کو آپ اپنی بساط کے مطابق کسی چھوٹے یا بڑے دائرے میں نبھاتے آرہے ہیں؟

اگر نہیں، تو دین کے محاذ کو کمزور کرنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔اگر اس سبب کو آپ بھی تسلیم کرلیں تو پھر اسے ختم کرنے کے لیے اور زیادہ بہتر رویے سے محبت و اخوت کے رشتوں کو مضبوط کرنے کے لیے کام کیجیے۔

خدا کرے کہ آپ اپنی برادری کو محبت و اخوت کی دولت سے مالا مال کرکے دعوت کے کام کو مضبوط بنا سکیں۔

گھر میں دعوتِ حق

وَاْمُرْ اَھْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْھَا ؕ (طٰہٰ:۱۳۲)

''اپنے اہل وعیال کونماز کی تاکید کرواور اُس کام کومستقلاً جاری رکھو۔''

حضورصلی اللہ علیہ وسلم کومکّہ ہی کے دور میں یہ حکم دیا گیااور اللہ تعالیٰ کا خاص روئے سخن حضورؐ کی طرف ہونے کے باوجود یہ حکم آپؐ کے لیے خاص نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے بہت سے احکام کی طرح آپ کے واسطے سے تمام اہلِ ایمان کوایک اہم ہدایت دی گئی ہے۔ ہدایت یہ ہے کہ گھر والوں (بیوی بچوں) کونماز کی ادائیگی کی تاکید کرواور اس رویّے پر مضبوطی سے جمے رہو، یعنی ایک آدھ بار ذراسی بات کہہ کر یاڈانٹ ڈپٹ کر یاتعمیل حکم کراکے معاملہ ڈھیلانہ چھوڑ دو کہ بس کبھی سال دوسال بعد یاد آئے تو پھر آواز اٹھادی جائے۔ اہل وعیال کی تربیت ایک مستقل پروگرام ہے۔

''صلٰوۃ'' کی حد تک یہ حکم محدود نہیں ہے بلکہ پورے دین کی تعلیم وتربیت دینے کی تلقین اس میں شامل ہے۔ یہ ایک بڑی عبادت ایسی لے لی گئی جوروزمرہ زندگی میں بہت اہمیت رکھتی ہےاور جس پر عمل کرنے والے کارویہ محسوس طور پر سامنے ہوتا ہے۔

دین کا یہی وہ تقاضا تھا جس کے تحت حضرت لقمانؑ اپنے فرزند کواہم ذمہ داریوں کی تلقین کرتے دکھائے گئے ہیں۔ ضروری نہیں کہ انھوں نے عمر میں ایک ہی مرتبہ نصیحت کی ہو، یہ تو ایک موقع کی گفتگو ہے جسے قرآن کریم میں ایک اچھی مثال کی حیثیت سے شامل کیا گیا ہے۔

انبیاءؑ کا اُسوہ

اسی تقاضے کے تحت حضرت سیّدنا ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام نے اپنے اپنے

بیٹوں کو نصیحت و تاکید کی کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے دین متعین کر دیا ہے۔ پس جب تم کو موت آئے تو اس حال میں آئے کہ تم مسلم ہو۔ (بقرہ: ۱۳۲) پھر حضرت یعقوبؑ آخری لمحات میں اپنی اولاد سے استفہام تعلیمی کے پیرائے میں پوچھتے ہیں کہ: مَاتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ؟ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے اور کسے رب و الٰہ قرار دو گے؟ سعادت مند اولاد کا جواب بڑا مبارک ہے کہ:

نَعۡبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ
اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ○ (البقرہ: ۱۳۳)

یعنی ہم اسی اِلٰہ واحد کی عبادت میں زندگی گزار دیں گے جو آپ کا، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ کا الٰہ ہے اور ہم اسی کے مطیع و منقاد ہیں۔

قرآن کی تلقینات

پھر قرآن کریم میں دوسرے رُخ سے یوں بھی بات کی گئی ہے کہ: قُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ وَ اَهۡلِيۡكُمۡ نَارًا......الخ (التحریم: ٦) یعنی اپنے آپ اور اپنے ساتھ اپنی اولادوں کو بھی آخرت کے عذابِ نار سے بچانے کی فکر کرو۔[۱] یہ تعلیم دیتے ہوئے اُخروی سزا کا اجمالی تصوّر دلا کر گویا جذبات و احساسات کو چونکا دیا گیا ہے کہ وہاں دوزخ کی آگ ایسی ہے کہ ''انسان اور پتھر اس کا ایندھن ہوں گے، اُس پر تند خُو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کریں گے'' الخ۔

اسی طرح قرآن کریم میں یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جن اہل و عیال کی خوشیوں کے لیے نہ جانے تم کیا کیا جتن کرتے ہو اور جن کے لباس، خوراک اور ناز برداریوں کے لیے مال خرچ کرتے ہو، اگر تم انھیں دین کا پابند نہ بناؤ گے تو یہ سمجھ لو کہ تم جہنم کا ایندھن تیار کر رہے ہو اور

---

[۱] دل چسپ بات یہ ہے کہ ہماری سابق انگریزی حکومت کے ضابطۂ ملازمت میں بھی اسی مطالبۂ دین کے متوازی یہ مطالبہ شامل تھا کہ ہر سرکاری ملازم اپنے زیرِ کفالت اہل و عیال کو حکومت کا وفادار بنائے گا، اور اس کی مخالفت سے روکے گا اور یہ اصولی بات ہر حکومت چاہتی ہے، سو خدا کی گورنمنٹ کا یہ مطالبہ کوئی عجیب ناقابلِ فہم چیز نہیں۔ جو اس کا وفادار ہو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ بیوی بچوں اور دیگر زیرِ کفالت لواحقین کو بھی اس کی وفاداری پر استوار کرے۔

اپنے پیاروں کو تم سخت گیر فرشتوں کی نگرانی میں حوالۂ عذاب کرنے کے لیے اُن کی پرورش کر رہے ہو اور کیا تمھیں جنت میں بھی اپنا پورا سکھ چین مل سکے گا جبکہ تمھارے جگر کے ٹکڑے شعلوں میں لپٹے ہوں گے۔

قرآن کریم کے طالب علم کی توجہ اس امر پر بھی جانی چاہیے کہ یہ سورۂ تحریم کی آیت تھی جس کے شروع میں ازواجِ مطہرات کی طرف سے ایک طرح کی محاذ آرائی کر کے دباؤ ڈالنے کی کوشش کا ذکر ہے۔ اسی واقعہ کو پسِ منظر میں رکھ کر مسلم سوسائٹی کو خصوصی توجہ دلائی گئی کہ اگر تم اپنے گھروں کی فضا کو دین کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ نہ کر لو گے تو تمھارے نظامِ معاشرت میں خلل آئے گا اور تمھارے گھروں میں ہی مخالفانہ محاذ قائم ہو جائیں گے جو تمھاری قوتوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے تمھیں اعداء واشرار کی سرکوبی کے قابل نہیں چھوڑیں گے۔

جو لوگ گھر والوں کو راہِ حق پر ساتھ لے کے چلیں، اُن کو قرآن میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ:

هُمْ وَ اَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِئُوْنَ۝ (یٰسین:۵۶)

یعنی وہ اور ان کی بیویاں سائے میں شہ نشینوں پر تکیے لگائے ہوئے ہم مجلس ہوں گے۔

یہاں اَزْوَاجُهُمْ سے مراد دنیا کی ازواج بھی ہیں اور نگارانِ جنت (حوروں) کو بھی لیا جا سکتا ہے۔

سورۂ المومن میں حاملینِ عرش کے منصب پر فائز جلیل القدر فرشتوں کی جو دعا اہلِ ایمان کے لیے مذکور ہے، اس کا ایک جزو یہ ہے:

رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ
اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ؕ (المومن:۸)

”اے رب، اہلِ ایمان کو اور اُن کے ساتھ صالح باپ دادا، صالح بیویوں اور صالح اولاد کو بھی جنتِ عدن میں داخلہ دے جس کا تو نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے۔“

سورۂ الانشقاق میں ”حسابِ یسیر“ کا شرف پانے والے اور دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ وصول کرنے والے شخص کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَيَنْقَلِبُ اِلٰى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا[1] کہ وہ اپنے گھر والوں کے پاس خوش خوش پہنچے گا تاکہ انھیں اُخروی نتیجے کی مسرت سے آگاہ کرے اور انھیں

[۱] انشقاق:۹، نیز ملاحظہ ہو آیت: ۱۳

بھی اس میں شریک کرے۔ دین سے انحراف کرنے والے اہل وعیال سے تو کسی کی ملاقات کا آخرت میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ان آیات سے یہ واضح ہوا کہ جس شخص نے اہل وعیال اور رشتے داروں کو دینی تعلیم و تربیت دی وہ خود بھی رحمتِ حق سے بہرہ مند ہوگا اور اس کے ساتھ اس کے اہل وعیال اور والدین اور دیگر اقرباء واعزہ بھی فلاح وسعادت میں شریک اور یکجا ہوں گے۔ بخلاف اس کے جس شخص نے اہل وعیال اور اہلِ خاندان[۱] میں نہ دعوتِ حق کو پھیلایا ہوگا، نہ دین کی تعلیم وتلقین کا کام کیا ہوگا، نہ ذہن واخلاق کی تربیت کی فکر کی ہوگی۔ اس پر ایک تو اس بڑی کوتاہی کی گرفت بھی ہوگی اور پھر اگر وہ مجموعی خدمات کے بل پر بچ بھی نکلا تو وہ ان بیوی بچوں کو نہ پاسکے گا جن کی محبت میں اُس نے عمر گزاری اور جن کو کھلانے پلانے اور آرام پہنچانے کے لیے اس نے مشقتیں کی اور خود اپنے مفاد اور آرام کو قربان کیا۔ اسی طرح وہ اپنے والدین اور بزرگان اور اعزہ واقرباء کے اُس گروہ سے بھی بچھڑ جائے گا جنھوں نے زندگی کی صحیح راہ اختیار نہیں کی۔

خاندان اور اولاد

اہل وعیال کے مختصر حلقے سے آگے، خاندان کے وسیع دائرے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ: وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ ۙ[۲] یعنی ہم سب پر ذمہ داری اپنی ذات ہی کی نہیں، ازواج واولاد کی بھی ہے اور بزرگوں اور اقرباء کی بھی، سیدھی سی بات ہے کہ دنیا میں انسان جس سے محبت کرتا ہے یا جس کا احسان مند ہوتا ہے، اس کی بھلائی چاہتا ہے، اس سے نیک سلوک کرنا چاہتا ہے، تو ایک مومن ومسلم کے لیے اپنے بزرگوں، عزیزوں اور محسنوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا سب سے اہم اور اچھا راستہ یہ ہے کہ وہ انھیں خدا پرستی اور اقامتِ دین کی تلقین کرے۔

اولاد کے متعلق قرآن کریم میں ایک زبردست انتباہ بھی ہے۔ مغفّلین کی تو خیر ان چیزوں پر توجہ ہی نہ جائے گی، لیکن شعوری ایمان رکھنے والے لوگوں کے لیے یہ بہت بڑی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

[۱] وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ ۙ (الشعراء: ۲۱۴)

[۲] اور ڈراؤ اپنے قریبی رشتے داروں کو۔ (الشعراء: ۲۱۴)

وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (الانفال:۲۸)

''اچھی طرح جان لو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولادیں وجہِ آزمائش ہیں۔''

اس مختصر جملے کی توضیح میں آیت ماسبق مدد دیتی ہے۔ فرمایا:

لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴿۲۷﴾ (الانفال:۲۷)

''جانتے بوجھتے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ خیانت نہ کرو، اپنی امانتوں میں غداری کے مرتکب نہ ہو۔''

خطاب ہے اہلِ ایمان سے کہ جانتے بوجھتے اللہ اور اس کے رسولؐ سے خیانت نہ کرو، اپنی امانتوں (یعنی اسلامی تحریک اور جماعت اور حکومت اور اداروں اور افراد کی سپرد کردہ ذمے داریوں اور مالی یا دیگر امانات) میں غداری کے مرتکب نہ ہو۔ یہاں آگے اموال و اولاد کے فتنہ ہونے کا انتباہ دیا گیا ہے۔ دونوں باتوں کو ملائیں تو مفہوم یہ نکلے گا کہ آدمی دانستہ خدا اور رسولؐ سے خیانت کا ارتکاب کرتے ہوئے یا امانت اور ذمے داریوں میں گڑبڑ کرتے ہوئے بالعموم مال و اولاد کی کشش اور تحریک کی زد میں ہوتا ہے۔ گویا مال و اولاد اس کش مکش میں خاصا بڑا دخل رکھتے ہیں جو ایک صاحبِ ایمان کو زندگی میں ہر آن درپیش رہتی ہے۔ مال تو بے جان شے ہے، اس کے متعلق اپنے ہی نفس کی تربیت کرنی پڑتی ہے، لیکن اولاد کا معاملہ ایسا ہے کہ اگر بچوں کی تربیت خدا کے دین کے منشا اور تحریک اسلامی کے مزاج کے مطابق کر دی جائے تو وہ کش مکش خیر و شر میں مومن کے ساتھ ہو کر معرکہ آراء ہوتے ہیں۔ اور اگر ان کی تربیت میں کوتاہی رہ جائے تو وہ مخالف محاذ پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی نظریاتی محاذ نہ بھی ہو تو خود مال و دولت، ساز و سامان، نمود و نمائش کی ہوس میں پڑ کر آدمی کو تھوڑا بہت بندۂ دنیا بنا دیتے ہیں۔ جو اہلِ ایمان اولاد کو بندۂ خدا نہ بنا سکیں، اُن کو نتیجہ یہی دیکھنا پڑتا ہے کہ اُن کی آنکھوں کے سامنے ان کا سارا کنبہ (یا بیش تر) بندۂ دنیا بن کے رہ جاتا ہے، اور خود اُن کی اپنی ذات بھی گھر میں اُمڈنے والے سیلابِ غلاظت کی موجوں سے محفوظ نہیں رہتی۔

اِن گزارشات سے یہ اصولی حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ خاندانوں، خصوصاً بیویوں اور اولادوں کے متعلق اہلِ ایمان کی ذمے داریاں کیا ہیں! اور ہم لوگ ان ذمے داریوں کو پورا نہ کر کے کون سے عذرات آخرت میں پیش کر سکیں گے۔

بچّوں کی تعلیم وتربیت

تربیتِ اہل وعیال کا مبحث بڑا وسیع ہے۔ یہ تو گویا ایک چھوٹی سی ریاست کا نظامِ کار ہے۔اس نقطۂ نظر سے اہلِ دین کو کام کرنا چاہیے۔

دین کا اوّلین تقاضا تو اس فرد سے اطاعت، تعاون اور قربانی کا ہے جو اسے دل وجان سے سوچ سمجھ کر قبول کرے۔ جس شخص نے دینِ حق کو سچائی سے قبول کیا ہو اس کی نشانی یہ ہے کہ کم سے کم اس کی اپنی زندگی کے تمام اختیاری گوشے اسلامی رنگ میں رنگ جائیں گے۔اس کا ہمہ وقتی مقصد، اس کے لین دین، اس کی دوستیاں، اس کی گفتگوئیں، اس کا ذوق وشوق، اس کی عادات واطوار، اس کا رہن سہن، اس کا گھر والوں اور گھر کے باہر کے لوگوں سے طرزِ معاملہ پوری طرح بدل جائے گا، خواہ تدریجاً! مگر ہوگا یہ کہ وہ اپنی زندگی کی ہر خلافِ اسلام چیز کو اپنے لیے وجۂ اذیت سمجھ کر اپنے آپ سے الگ کرے گا اور ایمان وکردار کو نقصان پہنچانے والی یا آخرت کے خسارے کا باعث بننے والی ہر ادنیٰ چیز سے وہ اس طرح بھاگے گا جیسے سانپ اور بچھو سے بھاگا جاتا ہے۔غلط اساس کی عمارات اس کے لیے زنداں بن جائیں گی۔ غلط معاش کا روپیہ پیسہ اس کے لیے آگ کا انگارا بن جائے گا، غلط رویے اور تعلقات اور بناوٹی دوستیاں دشمنیاں اور مفاد پرستانہ قرابتیں اسے دہتی زنجیریں محسوس ہوں گی۔

ایک سچا مسلمان اس دن مسلمان بنتا ہے جس دن وہ یہ سوچتا ہے کہ میں اپنے خدا کی عبادت کے ساتھ اس کی مخلوق کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ میں اپنے رفقائے سفر سے کس طرح ہم دلی اختیار کر سکتا ہوں۔میری طرف سے کسی کو اذیت تو نہیں پہنچ رہی ہے۔میرا گھر باعثِ آزار تو نہیں۔ وہ سوچتا ہے، وہ کریدتا ہے، وہ تجزیہ کرتا ہے، وہ ضرورت ہو تو پوچھتا ہے، شرعی مسئلہ

دریافت کرتا ہے اور زندگی کو کانٹے کے تول ٹھیک کر لیتا ہے۔ اگر پلڑا رشتہ دار دوست، رفیق کی طرف جھک جائے تو وہ اسے نیکی سمجھتا ہے، ورنہ برابر رکھنے کو تو وہ فرض قطعی مانتا ہے۔

ایسا آدمی گھر کی عمارت پر، ساز وسامان پر، مکینوں پر، ان کی عادات پر، اپنی تقاریب پر، ملازموں پر، دیواروں پر آویزاں تصاویر پر، ڈیکوریشن کے سامانوں پر، اپنی تقاریب اور دوسروں کی تقاریب میں شرکت پر، لباس اور میک اپ پر، پردے اور حجاب پر، کھیلوں اور تفریحات پر، غرضیکہ ہر چیز پر گہری نظر ڈال کر خدا کے دین کی کسوٹی کے ذریعے فیصلہ لیتا ہے کہ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے اور کیا کس طرح ہونا چاہیے۔

ایک اسلامی گھر (اور اسلامیت کا خانگی مرکز) وہ ہے جس میں داخل ہوتے ہی آنے والے کو احساس ہو کہ وہ ایک نئی دنیا میں داخل ہو گیا ہے۔ جس کے طور طریق بڑے شائستہ و مہذب اور پاکیزہ وسنجیدہ ہیں۔

ناشتے کے ساتھ یا بعد عصر، درس یا اجتماعی مطالعہ ہوتا ہے۔ راتوں کو حالاتِ حاضرہ کے حوالے سے اسلامی اصول و احکام پر گفتگو ہوتی ہے۔ دیواروں پر اچھی اچھی مختصر تعلیماتِ کتاب وسنت آویزاں ہیں۔ قسم قسم کے ٹیپ کیے ہوئے مشاعروں نعتوں، قرآنی سورتوں، افسانوں اور ڈراموں اور شعر وشاعری کے ریکارڈ حاضر ہیں۔ جا بجا شیلف لگے ہیں۔ کہیں بچوں کے لیے دینی لٹریچر ہے، کہیں خواتین کے لیے، کہیں مردوں کے لیے اور کہیں وسیع جنرل نالج، عالمی احوال، فلاسفی، جغرافیے، تاریخ اور فنون کے علاوہ شعر وسخن، افسانوں اور ناولوں کے مجموعے، مکاتیب اور سفر نامے اور کتبِ لغت موجود ہیں۔ دیواروں اور سیڑھیوں کے کناروں اور کارنروں پر دلکش ایمان افروز طغرے جلوہ گر ہیں۔ اچھے مناظر کی تصاویر آیاتِ الٰہی کے جلوے دکھا رہی ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے اللہ کا نام سنائی دیتا ہے۔ استغفر اللہ، الحمد للہ، انا للہ وغیرہ۔ اذانیں ہوتی ہیں۔ نمازوں کی تیاری ہوتی ہے۔ سارا گھر نماز پڑھتا ہے۔ ننھی سی بچی بھی ماں کے ساتھ کھڑی ہو جاتی ہے۔ پانچ، چھ سال کا بچہ ابو سے تقاضا کرتا ہے کہ مجھے بھی مسجد تک لے چلیے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگلے ہفتے تمھیں لے کر گیا تھا۔ تم نے شور کیا، نماز میں بچوں کے ساتھ مل کر گڑ بڑ کی، نمازیوں کے آگے سے گزرے، ان باتوں کی اصلاح کا سرٹیفکیٹ جب تمھاری امی دے دیں اور سفارش کر دیں تو میں ضرور لے جاؤں گا۔ پھر دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ خاندان، محلے والوں، تعلق داروں اور خادمان

تحریک کے فوت شدگان، بیماروں اور پریشان حالوں یا بے روزگاروں کے متعلق۔ چھوٹے بچے اماں کے ساتھ ساتھ آمین کہتے ہیں۔

ملازمین خوش وخرم ہیں۔ مائی کام کرتی ہے۔ اسے تنخواہ بھی مناسب ملتی ہے، کپڑے وغیرہ بھی، کچھ کھانا بھی، خاص خاص حالات مثلاً بیماری وغیرہ کے لیے خصوصی امداد بھی۔ کوئی اسے گالی نہیں دیتا، کوئی جھڑکتا نہیں، کوئی کام کا بار زیادہ نہیں ڈالتا۔ بے جا حکم نہیں دیے جاتے۔ وہ ایسے ہے جیسے کوئی گھر کا آدمی ہو۔ اسی طرح باہر کے کاموں کے لیے ایک بوڑھا سا مرد ہے۔ سودا یا دوائی لاتا ہے یا پیغام وغیرہ کہیں پہنچاتا ہے۔ کسی بچے کے ساتھ اسکول جاتا ہے یا اسکول سے لاتا ہے۔ سکھ چین ہے، کوئی زیادہ تنخواہ پر بھی لے جانا چاہے تو وہ اس گھر کو نہیں چھوڑ سکتا۔

اصلاح کے لیے پہلی توجہ

گھر کو اسلامی گھر بنانے کے لیے پہلی توجہ کسی بھی شادی شدہ مرد کو اپنی بیوی پر دینی چاہیے۔ زبانی دعوت، مطالعہ کے لیے کتب کی فراہمی یا پڑھ کر سنانا، قرآن کے مطالب کا شعور دلانا، گھر کا دینی واخلاقی لحاظ سے آئیڈیل خاکہ متفقہ طور پر تیار کرنا، اسراف وتبذیر سے بچ کر نظامِ مصارف کا نقشہ تیار کرنا۔ سادگی کے ساتھ گھر میں ہر پہلو سے صفائی کا ہونا۔ جدید آسائشات و آرائشات کی فراوانی سے پرہیز۔ لباس کو خود بھی سادہ رکھنا اور بچوں کو بھی اس کی تربیت دینا۔ مہمان داری کے اصول، بیماری اور تیمارداری اور غذائیات کی رہنمائی اور پھر ایک ایسی مجموعی فضا جس میں اہمیت خدا کی عبادت، توسیعِ علم، حسنِ اخلاق، حسن گفتار اور صدقہ وانفاق کو حاصل ہو۔

گھر کو اسلام کے رنگ میں رنگنے اور مہذب وشائستہ فضا سے آراستہ کرنے کے لیے اہم ترین مسئلہ بچوں کی ذہنی واخلاقی تیاری کرانے کا ہے۔ لہٰذا چاہیے کہ ماں اور باپ دونوں نہایت اہتمام سے مل جل کر گھریلو زندگی کا فریضہ ''نمبر ایک'' ادا کریں، جس کے لیے محنت و قربانی کی ضرورت ہے اور یہ ایک طرح کی مسلسل نگہداشت اور عرق ریزی اور جانفشانی ہے۔ اس فریضہ کی کٹھنائیوں میں والدین اگر خود انضباطی سے کام لے کر مستقلاً خوئے علم سے کام لیں اور چہروں پر غصہ کی حالت میں بھی مسکراہٹوں کے پھول کھلائے رکھیں تو وہ اپنا فرض پوری کامیابی سے ادا کر سکیں گے۔

معروف حقائق

والدین خصوصاً ماں کے اعصاب میں اگر تناؤ زیادہ رہے، غصہ زیادہ آئے، فحش فلموں اور ناولوں سے دل چسپی رہے اور زبان پر گھٹیا باتیں آتی رہیں، دوسروں سے ردّ وکد ہوتی رہے، شور سے بولنے کی عادت ہو، مسکراہٹ سے چہرہ خالی رہے، نماز روزہ اور ذکرِ خدا اور رسولؐ سے اور قصص الانبیاء اور تاریخِ اسلام کے زرّیں واقعات اور درخشاں شخصیتوں سے کوئی رابطہ نہ رہے تو بچے کے نظامِ سیرت و اخلاق کی بنیاد غلط پڑ جائے گی۔ بعد کی ابتدائی عمر میں بھی اسے آوازوں سے، ہاتھ لگائے جانے سے، بے توجہی اور توجہ دہی سے، ضروریات کی تکمیل سے، صفائی کا بار بار اہتمام کرنے سے، کچھ لوریاں اور اشعار پڑھنے سے، کچھ آیات اور دعائیں گنگنانے سے بچے پر بڑے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ اونچی آوازیں، درشت لہجے، سختی سے مس کرنے والے ہاتھ، ضروریات اور ان کے اوقات سے لاپرواہی برتنے والی مائیں یا دوسرے لوگ، ان کے رونے کے الارم پر بے توجہی کا رویہ، لغو قسم کے کلمات بالعموم کہنا، گالی کسی کو بھی دینا، کوئی چپت وغیرہ لگا دینا، یہ سب گویا ایک اچھے خاصے ابھرتے ہوئے انسان کو برباد کر دینے کا آغاز ہے۔

بچوں کی تربیت کا اصل سانچہ چونکہ خود آپ کے انداز و اطوار ہیں، اس لیے جس دن یہ احساس ہو جائے کہ اس گھر میں خدا اپنی کسی امانت کو بھیجنے والا[۱] ہے۔ اسی دن سے آپ میاں بیوی

---

[۱] یہ معلومات تو ہماری قدیم طب میں بھی مذکور ہیں کہ حالتِ جنینی میں نشو ونما پانے والا وجود ماحول سے عموماً اور ماں کے ذہنی اور جسمانی حالات اور عادات سے بہ شدت متاثر ہوتا ہے، اس دور میں اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنا، عبادت، دعا، ذکر، قرآن پڑھنا، نیک لوگوں کو تصور ذہن میں راسخ کرنا، اپنے آپ کو صحت مند اور خوش رکھنا اور دوسری طرف برے لوگوں، بری باتوں، بری غذاؤں، برے مطالعے اور برے خیالات و جذبات سے پرہیز کرنا اس دور میں اشد ضروری ہے۔ آج کل صوتی لہروں کے ذریعے جو حقائق سامنے آئے ہیں ان میں سے کچھ باتیں یہ ہیں۔ جان پڑنے کے بعد وجودِ نو تین آوازیں سنتا ہے اور ان سے اثر لیتا ہے۔ ماں کے دل کی دھڑکن کی آواز، پھیپھڑوں سے سانس لینے کی آواز، نظامِ ہضم سے پیدا ہونے والی آوازیں۔ علاوہ ازیں اس کے بولنے کی آواز۔ سخت یا نرم، کھری یا مترنم۔ یاد رہے کہ تلاوتِ قرآن یا حمدیہ، نعتیہ اور دیگر پاکیزہ نظمیں ترنم سے پڑھنا بھی اس پر اثر ڈالتا ہے۔ زور کا دھما کہ ہو تو چونک کر کان اس طرف لگا دیتا ہے۔ روشنی جدھر سے تیز تیز آئے اُدھر بھی متوجہ ہو جاتا ہے۔ کبھی مضطرب ہو کر چیختا ہے، مگر ہوا نہ ہونے کی وجہ سے آواز نہیں سنائی دیتی۔ بعض احوال میں سخت بے قرار ہو کر زور سے ہاتھ یا پیر مارتا ہے۔ اب تو قلعۂ رحم میں رہتے ہوئے ہی اس کے بعض ٹسٹ لیے جا سکتے ہیں، کسی حصے کی تصویر لی جا سکتی ہے، ٹیکہ لگایا جا سکتا ہے۔ وغیرہ اس سے اندازہ کریں کہ انسانی زندگی بالکل ابتدائی حالت میں بھی کس قدر اثر لیتی ہے۔

یہ طے کرلیں کہ ہم آپس میں لڑیں گے نہیں، اونچا بولیں گے نہیں، تلخ لہجہ اختیار نہیں کریں گے، کوئی گالی زبان پر نہ آنے دیں گے۔ کبھی کوئی ادنیٰ جھوٹ بھی نہ بولیں گے، کسی درجے کی وعدہ خلافی نہیں کریں گے۔ جہاں بسم اللہ کہنا ہے وہاں لازماً بسم اللہ کہیں گے، جہاں الحمدللہ کہنا ہے وہاں لازماً الحمدللہ کہیں گے، کسی نماز کو قضا نہ ہونے دیں گے، کوئی نماز فٹافٹ طریقے سے نہیں پڑھیں گے۔ گھر، کمرے، صحن، بستروں، کپڑوں، بالوں، ناخنوں، جوتوں سب کی صفائی کا انتہائی خیال رکھیں گے۔ یہ مرحلہ اگر ٹھیک سے طے ہوگیا تو بس آدھا کام ہوگیا۔

برطانیہ میں روایتی ماں اپنے بچے کو سال ڈیڑھ سال کی عمر ہی سے کھانے کی گھریلو مجلس میں شریک کرکے اس کی تربیت کرنے لگتی ہے۔ بچے کو معلوم ہوتا ہے کہ کھانے کی میز (خاص اونچی کرسی) پر بیٹھنے سے پہلے بب باندھنا ہے۔ پھر ماں بتاتی ہے کہ چھری اور کانٹے کو کس طرح رکھنا ہے۔ کھانا جاری رکھتے ہوئے کیسے؟ اور کھانا ختم کرتے وقت کیسے؟ پھر وہ کسی نپ ۔کن یا ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتا ہے یہ تربیت بڑی باریکی سے کی جاتی ہے۔

پھر بچّے کی تربیت صفائی کے متعلق بہت ہی خاص ہوتی ہے اور گندگی اور میل کے خلاف اس کے دل میں نفرت بیٹھ جاتی ہے۔ وہ کبھی کوئی تنکا یا کاغذ راستے میں نہ پھینکے گا، بلکہ چند فٹ کے فاصلے پر رکھے ہوئے ڈرم میں ڈالے گا۔ وہ چلتے ہوئے مونگ پھلی کھاتے چھلکے نہ پھینکے گا، گنڈیریاں چوس کر ان کا کچرا نہ بکھیرے گا۔

پھر اس کی تربیت ایسی ہوتی ہے کہ جب وہ پانچ، سات یا دس سال کی عمر میں گھر سے نکلتا ہے تو وہ قطعاً ایسا نہیں ہوتا کہ وہ آس پاس لگی کیاریوں یا پارکوں میں پھول توڑ کر ان کی پتیاں بکھیرتا ہو— اس پر اس کی ماں اور اس کا باپ پولیس کی طرح نگہبان ہیں، مگر وہ غلط بات سے روکتے ہوئے بڑے پیار سے روکیں گے بلکہ دراصل گھر سے باہر نکلنے کے دور سے پہلے بچے کو یہ سکھایا جاچکا ہوگا کہ جو چیز تمھاری یا ہماری اپنی نہیں اسے تم نہ ہاتھ لگاؤ گے نہ اس سے کوئی فائدہ اٹھاؤ گے۔ یہ تعلیم اس کے ضمیر کو بیدار کردیتی ہے۔ اور آج آپ کو کافروں کی دنیا میں ایک مثال بھی نہ ملے گی کہ بچے اندھا دھند پھول توڑ رہے ہوں یا سڑک پر روڑے اچھال رہے ہوں یا گندگی بکھیر رہے ہوں یا دوسروں کی کھڑی گاڑیوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہے ہوں۔ اس کے مقابلے میں ہمارے اسلامی اداروں کے اکثر طلبہ کا حال کتنا شرم ناک ہے۔

میں اسلام کی گود میں پلے ہوئے والدین سے کہتا ہوں کہ تمھارے پاس تو خود رسولِ کریمؐ کی تفصیلی تعلیم صفائی کے متعلق احادیث میں موجود ہے، آنگنوں کی صفائی، راستوں کی صفائی، کپڑوں کی، بالوں کی، دانتوں کی، برتنوں کی، پانی کی، لیکن یہ تمھارا کیا حال ہے کہ دنیا میں تمھارا ملک گندگی کے لحاظ سے نمبر ایک پر ہے۔ جس بدتمیزی سے فلش سسٹم اور بدرووٗں اور مین ہولوں کا استعمال ہماری قوم کرتی ہے، شاید دنیا بھر میں وہ مقابلے میں تمغہ حاصل کر جائے یا نوبل پرائز، نالیاں بچوں کے، کموڈ بنی ہوئی ہیں۔ مین ہولوں کے ڈھکنے اٹھا کر سبزی فروش اپنی بچی ہوئی گندی سڑی سبزی اس میں ڈال دیتا ہے۔ گھروں سے نکل کر مائیاں کوڑا کرکٹ گلی کی نالی میں بہا دیتی ہیں۔

کیا ہمیں کبھی شرم نہ آئے گی کہ ہم مسلمان ہیں اور دنیا کے لیے شائستگی وتہذیب کے معلم! آپ کا بچہ گھر سے نکلتا ہے، اسے تین باتوں کی تاکید کیجیے، ایک یہ کہ اگر کسی کی گاڑی باہر کھڑی ہوئی ہو تو اسے چھیڑنا تو کجا اس کی طرف خاص نگاہ بھی نہ ڈالے، دوسرے کیاریوں میں باہر جو پھول لگے ہیں وہ چونکہ تمام آبادی کی مشترک ملکیت ہیں اور آنے والوں کی تواضع بھی ان کا ایک مقصد ہے، لہٰذا کسی پھول پتے کو نہ چھیڑیں، گھر کے باہر کی گلی ہو، یا پڑوسی کے مکان کی بیرونی کیاری ہو یا کوئی پارک یا قومی تفریح گاہ ہو کسی بھی جگہ ایمان دار اور دیانت دار والدین کے بچے کو کسی پودے، پتے اور پھول یا پھل کو نہیں چھیڑنا چاہیے، کسی درخت پر نہیں چڑھنا چاہیے، کسی درخت کی ٹہنیاں نہیں توڑنی چاہئیں۔ ان کے پتے نہیں بکھیرنے چاہئیں۔ کئی جگہوں پر اعلیٰ پھل دار درختوں کے کچے اور اصل سائز سے بہت چھوٹے پھلوں کو توڑ کر ضائع کر دیا جاتا ہے۔ ان کا کھانا بھی مضر صحت اور ان کا ضائع کرنا بھی قدرت کی ایک نعمت کا ضائع کرنا ہے اور رزق اور آمدنی سے محرومی حاصل کرنا ہے۔ یہ ساری باتیں گناہ کی باتیں ہیں۔ دوسروں کے مال واملاک میں بلا اجازت تصرف کرنا گناہ ہے، چاہے کوئی چیز فرد کی ہو یا ایک محلے کی یا پوری بستی کی، یا قوم اور حکومت کی۔ جس چیز کا مالک آدمی خود نہیں ہے یا کسی بچے کے والدین نہیں ہیں اسے چھیڑنا یا نقصان پہنچانا یا اس سے زائد اجازت فائدہ اٹھانا گناہ کا کام ہے۔ سڑک آپ کی ذاتی ملکیت نہیں مگر آپ اس پر چل سکتے ہیں، لیکن سڑک کے بیچوں بیچ ہاکی گراؤنڈ بنا لینا ظلم وزیادتی ہے۔ درخت کے سائے میں آپ بیٹھ سکتے ہیں مگر اس کے ٹہنے کاٹنے یا اس کا پھل توڑنے یا پودوں کے پھول نوچنے کا کسی کو حق نہیں۔ بچے اگر اپنی نادانی کی عمر میں ایسی غلطیاں کریں تو انھیں اللہ

میاں معاف کر سکتے ہیں مگر ان کے والدین یا گھر والے یا اساتذہ یا امام وخطیب حضرات یا کسی آبادی کے سمجھ دار لوگ جوان کی تربیت نہیں کرتے اور غلط حرکات سے ان کی روک ٹوک نہیں کرتے تو وہ اپنی کوتاہیوں کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ اور ذمے دار ہیں۔ اولاد کے بارے میں ذمے داری یہی نہیں کہ ان کو اچھا کھلا دیا، اچھا پہنا دیا، اچھے اسکول[۱] میں داخل کرادیا، اسکول پہنچانے کے لیے سواری کا انتظام کر دیا۔ بلکہ ذمے داری یہ بھی ہے کہ آپ کا بچہ کسی کے لیے باعثِ تکلیف، کسی معاملے میں وجہ تخریب اور کسی خواہش کے لیے تہذیبی حد سے گزر جانے والا نہ ہو۔ اگر کوئی بچہ گھر میں پھول یا پھل لاتا ہے، ٹہنیاں اور پتے لاتا ہے، سکے لاتا ہے، کوئی کتاب یا مشین کا پرزہ لاتا ہے، تو گھر والوں کا کام ہے کہ وہ اس سے معلوم کریں کہ فلاں چیز کیسی ہے؟ کہاں سے لائے ہو، پھر اگر معلوم ہو جائے کہ کوئی ٹہنی، پھول، پیسہ، پھل بچہ ناجائز طور پر گھر میں لایا ہے تو اسے سمجھایا جائے کہ بیٹی یا بیٹے! ایسی چیزیں جائز نہیں ہوتیں اور ان کو لینا یا گھر میں لانا برائی کی بات ہے۔ پھر اس وقت پیار سے اسے ساتھ لے کر اس موقع پر لے جائیں جہاں سے وہ کوئی چیز لایا ہوا اور پھر وہ اس جگہ ڈلوائیں یا پھنکوائیں جہاں سے وہ لی گئی ہے۔ اور آخر میں کہیں کہ یہ چیز تمھاری بھی نہیں، ہماری بھی نہیں۔ لہٰذا نہ تم لے سکتے ہو، نہ ہم گھر میں رکھ سکتے ہیں۔ یہ ہمارے خدا اور رسولؐ کی تعلیم کا ایک نکتہ ہے۔ اس کی خلاف ورزی کا نام چوری ہے۔

بعد کے دو بڑے سبق

ایک بڑا سبق یہ ہے کہ ہمارے نبی پاکؐ کی تعلیم و تاکید یہ ہے کہ ہم صفائی کی زندگی بسر کریں۔ ہمارے جسم صاف ہوں، غسل کی عادت ہو۔ بار بار وضو سے اعضائے ظاہر کی صفائی کرتے رہیں۔ دانتوں کو مسواک، برش یا پاؤڈروں وغیرہ سے صاف کریں، بالوں کو دھو کر کنگھی کر کے پراگندگی سے بچائیں۔ حجامت مناسب وقت پر ہو، کپڑے دھلے ہوئے اور بے داغ ہوں، بٹن درست ہوں، ناخن کٹے ہوں، آنکھوں کو چیپڑے سے صاف کیا جاتا رہے، کانوں کے باہر میل کے داغ ہوں تو صاف کر دیے جائیں۔ جوتوں اور جرابوں کو صاف رکھنے کے لیے یہ

---

[۱] ''اچھے اسکول'' کا اطلاق بھی بگڑے ہوئے ماحول کے لوگ ایسی تعلیم گاہوں پر کرنے لگے ہیں جو ایمان اور اخلاق کے لیے غارت گر ہوں اور آدمی میں مسلمان ہونے بلکہ دوسرے انسانوں کا خادمِ انسان ہونے کا شعور باقی نہ رہے۔

ضروری ہے کہ پاؤں دھونے کے بعد خشک کر کے ڈالے جائیں اور جوتوں میں کبھی مٹی جمع نہ ہونے دی جائے، جوتوں کی پالش باقاعدگی سے ہو اور ذرا بھی کہیں سے جوتا ٹوٹنے لگے، فوراً اسے درست کرالیا جائے۔ بستر صاف ہو، کمرہ صاف ہو، کھڑکیوں کے شیشے صاف ہوں، کمرے کا فرنیچر اور فرش صاف ہو، آنگن اور گلی کی صفائی کا انتظام ہو، کوڑے اور گندگی کو یوں ہی برسرِ عام نہ پھینکا جائے، بلکہ ڈرموں وغیرہ میں ڈالنے کا انتظام ہو۔ جن پھلوں کے کوڑے سے سڑاند اور بدبو اُٹھ کر پھیلتی ہو ان کو سیلوفین یا پولیتھین کے لفافوں میں بند کر کے کوڑے کے ڈرم میں ڈالنا چاہیے یا پاس رکھ دینا چاہیے۔ اگر بدبو پھیل کر دوسروں کو اذیت دیتی ہے تو اذیت رسانی گناہ ہے۔

اس صفائی کے ساتھ شائستگی کے چند ضروری امور شامل ہیں۔ ہر بچے کے پاس رومال ہونا چاہیے تاکہ کھانسی یا چھینک آنے پر اسے استعمال کیا جائے۔ کھانا راستوں میں چلتے پھرتے نہیں کھانا چاہیے۔ ہر چیز گھر میں لاکر یا کم سے کم کسی معقول ہوٹل میں بیٹھ کر کھانی چاہیے۔ ڈکار آئے تو منہ بند کر کے ناک سے اس کی ہلکی سی آواز نکلنے دینی چاہیے اور پھر بھی رومال ناک، منہ پر رکھ لینا چاہیے کہ آواز زیادہ نہ پھیلے۔ کھانسی آنے پر ہر حال میں منہ پر رومال رکھنا چاہیے، شدید مجبوری ہو تو ہاتھ رکھا جاسکتا ہے جسے بعد میں دھولیا جاسکتا ہے۔ آدمی جب کھانستا ہے تو اس کی کھانسی کی مار سامنے کی جانب چار، پانچ فٹ تک ہوتی ہے لہٰذا ایک تو کسی دوسرے کی طرف منہ کر کے نہیں کھانسنا چاہیے اور دوسرے منہ پر رومال رکھ لینا چاہیے۔ چھینک تو اور بھی وحشیانہ بلا ہے جو نظامِ جسمانی نے ہمارے لیے ناگزیر بنادی ہے۔ مگر اس کے لیے جہاں یہ آداب ہیں کہ جسے چھینک آئے وہ الحمد للہ کہے اور جو پاس سننے والا ہو وہ یَرحَمُکَ اللّٰہ کہے، وہاں یہ تعلیم بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے کہ فوری طور پر الٹا ہاتھ منہ پر رکھ لیا جائے۔ آج کل اسی ضرورت کو رومال سے بھی پورا کیا جاتا ہے، بعض صورتوں کے لیے حضورؐ نے چھینک کو روکنے کے صبر آزما عمل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

دسترخوان اور پلیٹ کے بھی شائستگی کے اصول کے تحت کچھ تقاضے ہیں۔ کھانے کی مجلس کے بھی آداب ہیں۔ ہاتھ دھونے اور پانی پینے اور کھانے کے آغاز اور خاتمے کے لیے بسم اللہ اور الحمد للہ پڑھنے کے احکام ہیں۔

دوسرا بڑا سبق یہ ہے کہ بچے میں یہ اسپرٹ پیدا کر دیجیے کہ اسے دوسروں کی بھلائی کے

لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہے اور یہ زندگی کی بہت بڑی نیکی اور خوبی ہے۔

اس سلسلے کا پہلا اصول حسنِ کلام ہے، چاہے زبان توتلی ہو۔ کوئی گندا لفظ بچہ نہ سیکھ لے۔ اس کے لیے گھر، مدرسے اور بستی، شہر کے مجموعی ماحول کو پاکیزہ ہونا چاہیے۔ باہر کا ماحول قبضے میں نہیں ہے، اس لیے بہت سی باتوں میں بچوں کو سمجھانا ہوگا کہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد خدا کے احکام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوب صورت ہدایات اور نمونۂ زندگی سے بے تعلق ہو چکی ہے، کیونکہ غلامی نے اور بُرے لوگوں نے اور شیطانی طاقتوں نے ان کو ورغلا لیا ہے۔ اب تم کو ان لوگوں کے سانچے میں نہیں ڈھلنا ہے بلکہ قرآن اور رسولِ پاکؐ کے سانچے میں ڈھلنا ہے اور بہت پاکیزہ آدمی بننا ہے تاکہ خدا تم کو پسند کرے اور اپنی بہت بڑی جنت میں تم کو جگہ عطا کرے۔ نیز تمھاری روح اس زندگی میں بھی خدا کے نور، خدا کی محبت اور روح سکینت سے بھری ہوئی رہے۔

اسے آہستہ آہستہ بتائیے کہ کس موقع پر کیسے لفظ کہنے چاہئیں، کیسے لفظوں سے پرہیز کرنا چاہیے، لہجہ کیسا ہونا چاہیے، بڑوں کے ساتھ اور چھوٹوں کے ساتھ اور دوستوں، ہم جولیوں کے ساتھ کس طرح کے تعلقات اور کیسی گفتگو ہونی چاہیے۔ علاوہ ازیں اجنبیوں کے بارے میں خدمت اور ادب کا اصول بھی قائم رہے گا۔ مگر احتیاط کا اصول بھی ضروری ہے۔ پانچ، سات سال کے بچے کو سکھا دینا چاہیے کہ وہ آدمی کو اس کی شکل، حلیے اور طریقِ گفتگو سے سمجھنے کی کوشش کرے۔ گھر سے باہر زیادہ دور تنہا نہ جائے، کسی غیر سے کوئی چیز نہ لے، کسی کے کہنے پر اس کے ساتھ نہ چل پڑے۔ دکانوں اور خوانچوں سے گھٹیا قسم کے سودے نہ خریدتا پھرے۔ ہمیشہ بڑوں کی رہنمائی میں صاف ستھری مفید اشیاء لے۔ کسی دینی مجلس میں، عالموں کی کسی محفل میں، مدرسے کی کسی سوسائٹی میں کس طرح بیٹھے اور کس طرح حصہ لے۔ مسجد میں جائے تو کن باتوں کا خیال رکھے۔ کوئی راستہ پوچھے تو بتائے، کسی معذور کی طرف کسی دوسرے آدمی کو توجہ دلوا کر مدد دے دے۔ کوئی شریف آدمی اپنی بستی میں آکر کسی کے گھر کا پتہ پوچھے تو بتادے، کسی پڑوسی کا کوئی سودا لادے، کسی گھر سے کوئی پیغام دوسرے گھر کو پہنچادے، راستے میں کہیں کانٹے یا روڑے پتھر پڑے ہوں یا کہیں گندگی ہو تو اسے ہٹادے۔

اوپر ہم یہ بتانا چھوڑ گئے کہ وہ اپنے رشتہ داروں، پڑوسیوں اور اسکول کے ساتھیوں سے ملے جلے تو خندہ پیشانی کو لازم رکھے، کیونکہ حضور پاکؐ کا طریقہ یہی تھا اور اس کی انھوں نے

تاکید کی اور اس کو صدقہ (نیکی کا عمل) قرار دیا۔

ایک ضروری بات یہ کہ جو لوگ دینِ پاک پر پوری طرح نہیں چل رہے ہیں، ان سے نفرت کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ جب موقع ملے تو کوئی نہ کوئی اچھی بات ان تک پہنچا دینی چاہیے۔ دین کی اچھی باتیں پھیلاتے رہنا ہر مسلمان کے لیے لازم ہے۔ بچوں کو شروع ہی سے اس کی مشق کرنی چاہیے۔ اس فریضۂ دعوت کو ادا کرنے کا مظاہرہ بڑوں کو اولادوں کے سامنے کرتے ہوئے یہ خواہش اور امید رکھنی چاہیے کہ وہ اس سے کچھ مفید اثر لیں گے۔

دوسروں کے ساتھ رابطوں کے سلسلے میں عمر کے مختلف مدارج میں ان کو یہ سمجھانا چاہیے کہ وہ راستہ کس طرح چلیں۔ عام اچھل کود اور شور شرابے کی مشق تو وہ کھیل کی مقررہ جگہوں پر کریں۔ لیکن راستوں میں آتے جاتے ہوئے ترتیب اور سکون اور سلیقے سے چلیں، چلنے میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ایسی چوڑی قطار چند بچے مل کر نہ بنالیں کہ سارے راستے کو روکنے کا باعث ہوں۔ نیز ہر فرد یہ دیکھے کہ سامنے سے کون آرہا ہے اور وہ کدھر سے گزرے گا، اس کے لیے راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو جائیں۔ خصوصاً بڑوں کے معاملے میں یہ اہتمام کریں کہ ان کے آگے سے ہو کر نہ گزریں، یا جوتے پہنتے وقت ان کو پیچھے نہ کھڑا رہنے دیں، اسی طرح کسی بھی جگہ، مثلاً دکان پر سودا لیتے ہوئے، ویگن پر سوار ہوتے یا سیٹ لیتے ہوئے یا بیسن میں ہاتھ دھوتے ہوئے یا کھانا نکالتے یا شروع کرتے ہوئے بزرگوں کا خیال رکھیں اور ساتھ ہی خواتین کو سہولت پہنچائیں۔ وہ کسی جگہ ہوں، کسی مجلس میں، کسی عمارت میں یا راستہ چلتے ہوئے، بے جا شور نہ مچائیں، آپس میں ہاتھا پائی نہ کریں۔

تعلیمی کام

پڑھائی کا خاص خیال رکھیں، مقررہ وقت پر ساری دلچسپیاں چھوڑ کر اپنا کام مکمل کریں۔ کتابوں اور کاپیوں کو صاف رکھیں۔ روشنائی بیگ یا کتابوں پر یا کپڑوں پر نہ گرنے دیں، کاپیوں پر زیادہ کاٹ چھانٹ نہ کریں، قلم دوات کو صاف ستھرا رکھیں۔ سیاہی بھرنے کے بعد دوات کا ڈھکن بند کر دیں۔ پنسل کو بنا کے رکھیں۔ پنسلیں اور بال پوائنٹ قلم دو چار ہونے چاہئیں۔ رف کاغذ یا رف کاپی الگ رکھنی چاہیے۔ لکھنے کا کام کپڑوں پر، جسم پر، دیواروں پر،

دروازوں پر اور الماریوں پر ہرگز نہ کیا جائے۔ کرسیوں پر بیٹھ کران کا جھولا نہ جھلایا جائے۔

ہر اسلامی گھرانے میں بچوں کو بہت ابتداء سے ہی مختلف دینی کلمات یاد کرائے جائیں۔ پھر جب وہ کچھ سمجھ میں آئیں تو قرآن ناظرہ کا آغاز کر دینا چاہیے۔

یسرنا القرآن کے ذریعے یا خود چھوٹے چھوٹے سبق تیار کر کے۔ پھر جب وہ سیپارہ پڑھنے کے قابل ہوں تو شروع میں چاہے ایک لفظ ہی روزانہ ان کو پڑھایا جائے، مگر یہ سفر شروع ہو جانا چاہیے، کچھ عرصے بعد دو دو یا تین تین لفظ، پھر پوری ایک آیت پھر دو دو تین تین آیتیں اور آگے چل کر روزانہ کئی سطریں، پھر رکوع، غرضیکہ یہ سلسلہ تدریجاً بڑھتا جائے۔ مگر اس کا اہتمام رہے کہ ایک لفظ کے دور سے لے کر رکوع یا پاؤ سیپارہ کے دور تک کا بچہ پہلے ماں باپ یا مسجد کے صاحبِ مکتب سے جو سبق سیکھے گا، پھر بیٹھ کر اس کے ہر جز جو پانچ، پانچ دفعہ دہرائے گا پھر پورے سبق کو ایک ہی سانس میں پڑھ جائے گا۔ اس طرح اس کی تلاوت میں روانی آئے گی، وہ ایک ایک لفظ اٹک اٹک کر نہیں پڑھے گا۔ استاد بھی یہ خیال رکھے کہ جہاں دو چار لفظوں کا جوڑ نا ملانا ذرا مشکل ہو، وہاں دو دو تین تین بار خود کہلائے۔ آخر میں بچہ اپنا پورا سبق سنا کر رخصت ہوگا۔ اگلے دن اس سبق کو وہ پھر دہرائے گا اور نئے سبق پر غور سے نظر ڈالے گا تا کہ استاد کے سامنے جانے سے پہلے زیادہ سے زیادہ تیاری کر لے۔

ناظرہ قرآن کے ساتھ اسے کلمہ طیبہ و کلمۂ شہادت دیگر اچھے اچھے کلماتِ ذکر، آیت الکرسی، صفتِ ایمان مجمل، صفتِ ایمان مفصل، ایمانیات کی تشریح، پڑوسیوں، غریبوں کے حقوق، پوری ملت محمدیہ کے حقوق، انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت، نماز میں پڑھے جانے والے کلمات، نماز پڑھنے کی ترکیب و ترتیب، وضو، اذان، جماعت، پانچوں نمازوں کی رکعتیں، فرض، سنت، نفل کا شعور، نماز جمعہ، نماز جنازہ، نمازِ تراویح، نماز عیدین، واضح حرام چیزیں، کبیرہ اور صغیرہ گناہ، سنت اور بدعت کا فرق وغیرہ امورِ ضروریہ کی تعلیم تدریجاً دی جائے جس کو ۲ سال میں سمیٹنا چاہیے۔

پنجابی میں پکی روٹی نے بڑا کام کیا ہے اور اردو میں مفتی کفایت اللہ مرحوم کے رسائل نے۔ آج کل کے لحاظ سے مفتی صاحب کے رسائل سے مدد لینی چاہیے۔

یقین سے میں کہہ سکتا ہوں کہ پانچ، سات سال کی عمر تک جس بچے کے دل میں قرآن اور حقائقِ دینیہ اور انوارِ ایمانیہ کا متذکرہ مختصر سا حصہ اتر گیا، وہ سیکڑوں نظریاتِ فاسدہ کے درمیان

سے گزرتے ہوئے اور ہزاروں منکرات وفواحش سے دوچار ہونے کے باوجود بالآخر مسلم قوت سے مالا مال ہوکر ابھرے گا۔ اس کے باطن کے ایمانی، روحانی اور اخلاقی نور کو سوطرح کی بیرونی آندھیاں اور ظلمتیں گل نہیں کرسکتیں۔

باقی اونچی تعلیم وہ بعد کی عمر میں حاصل کرتا رہے گا یا مطالعہ کے ذریعے علمی سرچشموں سے استفادہ کرے گا۔

ایک بڑی ذمے داری کا شعور

بچوں کی تربیت کرنے والے ماں باپ کے پاس اتنا وقت ہونا چاہیے اور نہ ہو تو کمانے کی یا تفریح کی مصروفیات یا دوسروں کے ہاں بہت آمدورفت کے مشاغل میں کمی کرکے بچوں کو کافی وقت دینا چاہیے۔ ان کے ساتھ کھیل بھی کھیلیں، ان کے سامنے حالاتِ حاضرہ پر باتیں بھی کریں۔ ان کو قصصِ انبیاء اور تاریخ اسلام کے ابواب بھی سنائیں۔ اور ان ساری کوششوں کی مدد سے انھیں آہستہ آہستہ یہ احساس دلائیں کہ ہم لوگ (یعنی آپ والدین) خدا کے ساتھ ایک وعدہ کرچکے ہیں کہ دنیا میں توحید اور نیکی کو پھیلائیں گے اور شرک اور کفر اور بدی کی طاقتوں کا زور توڑنے کی کوشش کریں گے۔ یہی وعدہ ہمارا نبیِ آخری حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جنھوں نے ہمیں اس کام پر مقرر کیا ہے کہ جو دین انھوں نے سکھایا ہے اسے پھیلائیں اور اس کے حامیوں کی اتنی قوت پیدا کریں کہ دینِ برحق زندگیوں پر چھا جائے۔ گویا ہم لوگ خدا و رسولؐ کے سپاہی ہیں۔ اپنا فرض ادا کرنے کے لیے ہمیں وقت نکالنا پڑتا ہے، دوڑ دھوپ کرنی ہوتی ہے، لوگوں سے ملنا ہوتا ہے اور کئی کام کرنے ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ہم بہت کمائی نہیں کرسکتے، ناجائز آمدنیاں لینے سے بھی ہمیں اللہ اور اس کے رسولؐ نے منع کیا ہے، پس ہماری زندگیاں سادہ اور درویشانہ ہیں۔ ہم دوسروں کی عمارتوں کی طرف نہیں دیکھتے، دوسروں کی گاڑیوں کی حسرت نہیں کرتے، دوسروں کی آمدنیوں جیسی آمدنیاں نہیں ڈھونڈتے۔ اور اس کمی کا بدلہ دینے کے لیے خدا نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ آخرت میں حساب سے زیادہ دے گا۔ عزیز بچو! اس وجہ سے ہم تمھارے لیے اچھے اچھے مکانوں اور اچھے اچھے کپڑوں یا رنگ برنگے کھلونوں کا بندوبست نہیں کرسکتے۔ تم بھی ہمارے ساتھ خدا اور رسولؐ کے دین کے سپاہی بنو، تم

بھی شوق سے ہر تکلیف اٹھاؤ، مگر دین میں کمی نہ آنے دو۔

ہم سے پہلے جو لوگ دین کے سچے فدائی گزرے ہیں، انھوں نے اور ان کے بچوں نے تکلیفیں اٹھا کر دین کے لیے اتنا کام کیا کہ آج تک خدا پرستی، نیکی، سچائی، رحم دلی اور خوش اخلاقی کے اثرات باقی ہیں۔ اب اگر ہم موجودہ بگاڑ کے زمانے میں اور زیادہ کام کریں تو اس کے نتیجے میں سچائی اور نیکی کے چراغ ہر طرف پھر جل اٹھیں گے۔

اس طرح بچوں میں شروع ہی سے قناعت اور توکل اور درویشی کا رجحان پیدا کر دیا جائے اور انھیں ضروری حد تک حلال کمائی حاصل کرنے سے زیادہ کی ریس یا ریس (Race) کا خیال بھی کبھی نہ آئے۔ ایسے بچے بڑے ہو کر بڑی طاقت ثابت ہو سکتے ہیں۔

ان کو والدین سمجھائیں کہ جو کچھ ہمیں مل سکتا ہے اس پر ہمیں گزارہ کرنا ہے اور جو نہیں مل سکتا اسے دوسروں کے پاس دیکھ دیکھ کر کُڑھنا نہیں ہے۔ اگر اللہ چاہے گا تو ہمیں مزید کچھ عنایت کر دے گا، وہ جتنا اور جو کچھ چاہے اس دنیا میں دے اور باقی اس کی عطاؤں کا آخرت میں تو کوئی شمار ہی نہیں ہوگا۔

ایک انتباہ

وہ والدین بڑی غلطی کرتے ہیں جو ہر ادنیٰ غلطی پر بچے کو غصہ میں آ کر جھڑک دیتے یا کوئی چیز اُن کے ہاتھ سے ٹوٹ جائے تو مارنے لگتے ہیں۔ بلکہ ایسے تمام موقعوں پر جب کہ اس کا کوئی دانستہ قصور نہ ہو، بلکہ اتفاقاً کوئی بات ہوگئی ہو تو ان کو سہارا دینا چاہیے، چمکارنا چاہیے، کہنا چاہیے کہ بیٹا کیا ہوا جو کوئی چیز گر گئی یا ٹھوکر لگ گئی۔ واضح رہے کہ کئی سال تک ہر بچہ اپنے اعضاء اور اعصاب پر قابو پانے کی مشق میں لگا رہتا ہے اور اس میں کئی بار لغزشیں کھاتا ہے۔ ایسے وقت میں اگر اس کی ڈھارس بندھائی جائے اور ہمدردی دکھائی جائے تو اس میں نئی ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ ویسے یاد رکھیے کہ گرنے کا یا ٹھوکر لگنے کا، کسی چیز کے ٹوٹنے کا احساسِ ندامت اس کے اندر موجود ہوتا ہے۔ اس احساس کے زخم پر مرہم لگانا چاہیے، نہ کہ اور چوٹ لگائی جائے۔

بچے اس گھر میں سنورتے ہیں جہاں محبت و ہمدردی کی فضا چھائی رہے۔ ہر فرد دوسرے سے حسنِ سلوک کرنے والا ہو۔ مار کٹائی کے طریقے سے جو اصلاح کی جاتی ہے وہ اوپر

اوپر کا خول ہوتا ہے۔ بچے کے اندر بغاوت کے جراثیم پرورش پانے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کٹّر دین داری والے گھرانوں میں کمیونسٹ اور معزز خاندانوں میں الحاد پسند ایکٹر اور آوارہ مزاج فنکار پیدا ہوتے ہیں۔

مار کی بھی کبھی کوئی ضرورت ہوسکتی ہے۔ اوّل تو سزا کے ایسے طریقے (بس کبھی کبھار) اختیار کیے جاسکتے ہیں کہ فلاں کام جب تک نہیں کرلو گے یا فلاں روِش چھوڑ نہیں دو گے تو تمھارے لیے کپڑے یا پھل یا مٹھائی گھر میں نہیں آئیں گے۔ یا صبح شام کی سیر کے وقت تمھیں ساتھ نہیں لے جایا جائے گا۔ یا جب تک تم امی سے غلطی کی معافی نہ مانگ لو گے، دستر خوان یا میز پر ساتھ نہیں بٹھائیں گے۔ ایسی ہزار شکلیں ممکن ہیں۔

البتہ اگر باہر سے شکایت آئے کہ کسی بچے کو مارا ہے یا کسی بڑے سے گستاخی کی ہے یا کسی کے سامان یا پودوں یا اسکوٹر کا کوئی نقصان کیا ہے تو بچے کو ایک موقع تو یہ دینا چاہیے کہ تم جا کر متعلقہ آدمی سے معافی مانگ کے آؤ، یا اپنے آپ کو سزا کے لیے پیش کردو، یا جو نقصان ہوا اس کا تاوان ادا کردو، جسے بعد میں تم اپنے جیب خرچ سے ہمیں پورا کردو گے۔ اور ایسے موقع پر ایک آخری حد پر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چھوٹی موٹی جسمانی سزا دی جائے، مگر حضوؐر نے غلط کار عورتوں تک کو منہ پر مارنے اور نشان چھوڑنے والی سزا دینے سے منع کیا ہے تو بچوں کا تو اور بھی خیال رکھنا چاہیے۔ بارشادِ نبیؐ برحق ''یہ تو جنت کے باغوں کے پھول ہیں۔''

یہ طریقہ بہت غلط ہے کہ والدین کو گھر میں جو تربیت دو چار سال میں کرنے کی تھی وہ تو نہ کرسکے ہوں، لیکن بچہ جب کسی محفل میں جا کر کوئی غلط حرکت کرے تو پھر اس کو ڈانٹیں اور گھرکیں۔ جو قصور پہلے ہو چکا ہے اس کی تلافی اس طرح تو نہیں ہوسکتی۔ بعد میں از سرِ نو گھر جا کر نقشۂ تربیت بنانا چاہیے۔

اس چیز کا دوسرا پہلو یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ماں باپ دوسرے گھر میں مہمان آ کر اپنے بگڑے ہوئے بچے کے متعلق ہر ذمہ داری سے بری ہو کر بیٹھ رہتے ہیں اور دوسرے گھر کے سامانوں اور بچوں کے لیے مصیبت آجاتی ہے۔ بچے ایسے ہوں تو انھیں کسی دوسری جگہ ساتھ لے جانا ہی نہیں چاہیے۔ لے جائیں تو ان کو کنٹرول میں بھی رکھیں۔ بچہ باہر جا کر اچھے شائستہ انداز میں رہے، بچوں سے پیار بھی کرے، کھیلے بھی، مگر شور اور توڑ پھوڑ کی حرکات سے الگ رہے۔ بچے

کو دوسروں کیے ہاں جا کر یا اپنے گھر میں، محفلوں میں یا مہمانوں کے سامنے ''تماشہ'' نہ بنایئے کہ جیسے اس کی تعلیم وتربیت ساری دوسروں کی تفریح (Entertainment) کرنے کے لیے ہو۔ اس طرح بچے میں پستی پیدا ہوتی ہے۔ ہاں اگر کوئی مقابلے کی محفل ہو یا بڑے رشتہ دار سنجیدگی اور خوشی سے یہ جاننا چاہیں کہ بچے کی قابلیت کیا ہے تو کچھ مناسب چیزیں وہ سنایا بتا سکتا ہے۔

یاد رکھیے کہ بڑا بگاڑ اور ناکامی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ماں باپ اور دوسرے افرادِ خانہ اپنی زندگی کے ٹیڑھ درست نہیں کر سکتے۔ کسی نے صاف جھوٹ بول دیا، کسی نے وعدہ خلافی کی، کسی نے باہر کہیں سے کوئی چیز بلا استحقاق اٹھا کر ساتھ رکھ لی، کسی نے فخریہ بیان کیا کہ ہم نے تو بس یا گاڑی کا ٹکٹ ہی نہیں لیا، کسی کی زبان پر گالی یا کوئی گھٹیا لفظ چڑھا ہوا ہے، کسی کو ڈینگیں مارنے کی عادت ہے، کوئی نماز سے محروم ہے، کسی کا سلوک ملازموں یا دروازے پر آنے والے لوگوں سے بُرا ہوتا ہے۔ اب ایسے بگڑے ہوئے گھر میں سے اگر کوئی اچھا بچہ اتفاقاً نکل آئے تو یہ قدرت کے خاص کرشمے ہیں۔

پہلے اصلاح بڑوں کی!

اگر کوئی حل نہ ہو تو ماں باپ کو بچے کی زندگی سنوارنے کی خاطر علیٰحدہ رہائش اختیار کر لینی چاہیے۔

دلیل سے ذہنی تربیت

عام طور پر بچوں کو والدین یا استاد حکم دے دیتے ہیں اور ان کے سوالات و اعتراضات کو نہیں سنتے۔ حالاں کہ جو حکم دیا جائے اس کی وجہ بتائی جائے اور ان کا کوئی سوال سامنے آئے تو دلیل سے اس کا جواب دیا جائے۔ مثلاً بچے کو بتایئے کہ ہم گھر میں گندی تصویریں کیوں نہیں لگاتے؟ ہم لاٹری کے ٹکٹ کیوں نہیں خریدتے؟ ہم غریبوں کو اپنے پیسے اور چیزیں کیوں دیتے ہیں؟ ہم نماز کیوں پڑھتے ہیں؟

تمھیں ویڈیو کیسٹوں والی دکان پر کیوں نہیں جانا چاہیے؟ دوسروں کے سامنے ننگے ہو کر کیوں نہیں نہانا چاہیے؟ صفائی کا اہتمام کیوں کرنا چاہیے؟ بیماری کے علاج کے ساتھ پرہیز کیوں ضروری ہے؟ کڑوی دوا کیوں کھائی جائے؟ وغیرہ۔

اس طرح کے کچھ اوامر ونواہی اس کے ذہن میں ٹھونسنے کے بجائے اسے سوچنا سکھایا جائے، دلائل سے کام لینے کی عادت ڈالیے۔ پھر وہ جو کچھ ترک یا اختیار کرے گا، دل سے کرے گا۔

کچھ اور باتیں

بہت سی باتیں لکھنے سے رہ گئی ہیں اور اب یہ سطور لکھنے کے بعد بھی رہ جائیں گی، کیوں کہ بچوں کی تربیت کا موضوع کتاب چاہتا ہے۔ چند صفحوں کا مضمون آپ کو سوچنے کے خطوط بتا سکتا ہے۔

یہ بات بھی تضاد کا ایک نمونہ ہے کہ آدمی خود تو جدید ترین تعلیم حاصل کرے اور بچے کو محض کسی مذہبی مدرسے میں داخل کرادے۔ مذہبی تعلیم کے ساتھ اُسے اپنے سے زیادہ جدید علوم کا ماہر بنانا چاہیے۔ اسی طرح خود تو کوٹ پتلون پہننا اور بچے کو قمیض پاجامے کا پابند رکھنا اس میں بغاوت پیدا کرے گا اور وہ چوری چھپے اپنی خواہش پوری کرے گا اور کسی مرحلے پر آزادی حاصل کرتے ہی مغربی لباس بلکہ ساری تہذیب پر ٹوٹ پڑے گا۔

بچوں کو کبھی نوکروں کی تحویل میں نہ دیجیے۔ اس وجہ سے کہ ان کے طور طریق (Manners) گھٹیا ہوتے ہیں، ان کی زبانوں پر چڑھے ہوئے الفاظ میں سے بعض فحش، بعض غیر شائستہ، بعض گالی کے طرز کے ہوتے ہیں۔ پھر کئی نوکر بچوں کو چومنے چاٹنے سے جنسی آسودگی حاصل کرتے ہیں۔ بعض وہ بھی ہوتے ہیں جو اُن کو پاس بٹھا کر چوسر، شطرنج وغیرہ کھیلتے ہیں اور ان پر بازیاں بھی لگاتے ہیں۔ بعض سگریٹ کا دھواں بچے کے منہ پر چھوڑتے ہیں جو بدتمیزی کے علاوہ صحت کے لیے سخت مضر ہے۔ بلکہ بچے کی صحت کے لیے تو فضا میں زیادہ دھویں کا موجود ہونا بھی مضر ہے۔ نوکر کسی دوسرے کی چیز بغیر پوچھے لے گا، کسی کے پیسے اٹھالے گا، کسی جگہ پھول یا پھل توڑ لے گا، کہیں بچے کو ٹافیاں یا کوئی اور ایسی چیز لے دے گا جس کا عادی ماں باپ اپنے بچے کو نہیں بنانا چاہتے، وہ کبھی وی سی آر جا دکھائے گا، کبھی کسی اور غلط کام سے متعارف کرادے گا۔

بچے کو اپنے جسم کے متعلق چند باتیں ضرور سکھانی چاہییں۔ ایک یہ کہ وہ جسم کے زیادہ حصے دوسروں کے سامنے نہ کھولے اور نہ کھلے رکھے۔ بازوؤں اور سینے اور ٹانگوں کو کھلا رکھنا بُری بات ہے۔ اس کے دور رس نتائج اچھے نہیں۔ ستر کے حدود تو اور بھی زیادہ سختی سے ملحوظ رہنے

چاہئیں۔ رفعِ ضروریات اور طہارت مخفی طور پر کرنی چاہیے۔ ناک کی صفائی دوسروں سے الگ ہوکر بیسن یا حوضی یا گھر کے کسی کونے میں واقع نالی یا کوڑے دان میں کرنی چاہیے۔ تھوکنے کی سخت پابندی بڑوں چھوٹوں پر ہو، یعنی بیسن یا پاٹ یا بدرو یا کوڑے دان یا اُگال دان کے علاوہ کہیں تھوکنا نہیں ہے، خواہ اس کے لیے چند قدم چل کر جانا پڑے۔ چنانچہ ہم نے کبھی کمروں یا صحن میں نہیں تھوکا۔ بچے کو یہ بھی سکھانا چاہیے کہ وہ اپنے جسم سے ہر کسی کو کھیلنے نہ دے۔

بچے کا نظام الاوقات از خود مقرر ہونا چاہیے اور اسے گھر سے باہر رہنے کے لیے خاص خاص وقت بتائیں۔ مثلاً کسی گیم کے لیے وقت، یا سیر کے لیے یا دوستوں کے ساتھ ڈھنگ سے کھیلنے کے لیے یا خدمتِ عام کے لیے۔ لیکن خیال رکھنا چاہیے کہ ان میں آوارگی پیدا نہ ہو، نیز کبھی کبھار ان سے ہنستے مسکراتے رپورٹ سن لینی چاہیے کہ کہاں گئے، کیا کرتے رہے، کون کون ملا؟ کوئی اچھی بات جو کسی میں دیکھی ہو؟ کوئی غلط بات جو تمہارے علم میں آئی ہو؟

پہلے بھی شاید کہا جا چکا ہے کہ مسجد میں جا کر کود پھاند نہ کریں، شور نہ کریں، صفوں پر بیٹھ جائیں۔ درود شریف یا کلمہ یا کوئی اور ذکر دھیمی آواز سے کریں۔ جماعت میں کھڑے ہوں تو صفوں میں بار بار آگے پیچھے ہو کر جگہیں نہ بدلیں، امام کے ولا الضّالین کہنے پر زور سے ''آمین'' کا نعرہ نہ ماریں جو آمین بالجہر کی حدود سے بھی آگے ہو۔

کسی گھر میں مہمان جائیں تو ادب تمیز سے بیٹھیں۔ کسی نئی چیز کو جاننا سمجھنا ہو تو بجائے اس سے چھیڑ چھاڑ کے خالہ جان یا ممانی جان یا بھائی جان وغیرہ سے پوچھیں کہ یہ کیا چیز ہے اور کس طرح کام کرتی ہے۔ دوسروں کے گھر میں رکھے فرنیچر یا بچھی دریوں اور چادروں کو خراب نہ کریں، بدتمیزی سے لڑیں جھگڑیں نہیں۔ گھر میں دریافت کریں کہ مجھے کوئی کام بتایئے، میں کر دوں وغیرہ۔ سارے بزرگوں اور عزیزوں اور مستورات سے بہترین طور پر ملیں اور بات کریں۔ ماں باپ کہیں تو مجلس میں سبق وغیرہ سنائیں۔

اڑوس پڑوس کے گھروں میں، ملنے والوں میں کبھی یہ بات چھیڑیں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ کبھی کوئی کام انجام دے دوں۔ اگر کوئی ضرورت پڑے تو مجھے ضرور بلوائیں۔ وغیرہ۔

ہر بچے کو والدین سے بھی، آنے والے رشتہ داروں سے بھی اور باہر مہمان جانے کی صورت میں کچھ نہ کچھ رقوم ملتی رہتی ہیں۔ چار آنے، دو روپے، پچاس روپے۔ بچوں کو بغیر تحکم

ترغیبی انداز سے یہ کہا جائے کہ بیٹے! اگلی دنیا میں اپنے لیے کچھ خزانہ جمع کرنا ضروری ہے اس آمدنی میں سے ہمیشہ دینِ حق کی خدمت اور غریب اور محتاج بندوں کی بھلائی کے لیے استعمال کرتے رہو۔

خاص خیال رکھیں کہ بچوں کے دل میں عجیب عجیب سوالات بڑی تیزی اور کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ان کی ذہانت کا مظہر ہوتے ہیں۔ آپ تیار رہیے کہ لازماً وقت نکال کر نہایت اطمینان سے اور تحقیقی طور پر ان کا جواب دیں گے۔ ان کے سوالوں کو دبا دینے کی اور ان پر ڈانٹ دینے کی صورت اختیار نہیں کریں گے۔ بلکہ اُلٹا بڑوں کے سامنے اپنے سوال بیان کرتے ہوئے بچے کو بڑی جھجک ہوتی ہے۔ وہ بہت ہی کم زور وجود رکھتا ہے، اسے اپنی بات کہنے کے لیے سہارا دیجیے۔ ہمت افزائی کیجیے پھر اس انداز سے جواب دیجیے کہ گویا آپ بہت ضروری کام کر رہے ہیں، ٹالنے کا اور جان چھڑانے کا انداز نہ ہو، بلکہ ایک طرح کا سبق پڑھا رہے ہیں۔ ان کے اچھے سوالوں پر خوش ہوں اور داد دیں۔ پتھریلا سا انداز نہ ہو۔

کھانے کی محفل میں بھی بچوں کو خاص اہمیت دینا، اہمیت سے بٹھانا، ان کی پسند کی بات چھیڑنا، لطیفہ گوئی کرنا، یہ سب چیزیں تربیت کا حصہ ہیں۔

آپ کوئی کتاب یا رسالہ یا مضمون پڑھ رہے ہوں تو بچوں کو چوکنا کرنے کے انداز میں کہیں کہ میں نے بڑی عجیب و غریب چیز پڑھی ہے، اس میں یہ ہے، وہ ہے۔ یعنی آپ ان کی توجہ اس خاص نقطے پر لگا دیں۔

اخبار میں کسی ظلم کا قصہ پڑھیں، کسی نااتفاقی کا، کسی علاقہ پرستی کا، تو اس کے دردناک حالات کا خلاصہ بیان کر کے بتائیں یہ سب نتائج ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی توحید اور خدا کی کتابِ ہدایت سے رُوگردانی کے۔

اس طرح ہر معاملے میں سے تعلیم و تربیت کا خوب صورت راستہ نکالیں کہ گھر مدرسہ بھی نہ بننے پائے اور تربیت کا کام بھی ہوتا رہے۔

ہم نے پہلے رومال کی اہمیت پر بات کی تھی، اب تولیہ کی ضرورت کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ بار ہا ہاتھ منہ دھونا، بار بار وضو کرنا، کبھی نہانا، ایسے تمام کاموں میں تولیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تربیت نہ دی جائے تو بچہ کبھی پلنگ کی چادر سے ہاتھ پوچھتا ہے، کبھی قمیض کے دامن

سے۔ پس ابتدا ہی میں تولیہ رکھنے اور اُسے استعمال کرنے کی تربیت دینی چاہیے۔

بچے کو دوا لینے کی تربیت مختلف طریقوں سے دیجیے۔ خصوصاً کڑوی دواؤں کے لیے، اسی طرح ٹیکوں کی تکلیف اٹھانے کی ہمت پیدا کیجیے۔ سب سے مشکل پرہیز ہوتا ہے۔ جب تک جس غذا کا استعمال ضروری اور جس کا ممنوع ہو اس کی پابندی کی جائے۔ اسی طرح جن حرکات اور کاموں کے لیے کہا جائے ان کو کیا جائے اور جن سے روکا جائے ان سے باز رہا جائے۔ میں نے دیکھا کہ جن بچوں کی تربیت اس معاملہ میں اچھی طرح کی گئی وہ دوا پرہیز سے بخوبی عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

بچوں کو بجلی اور اس کے تاروں اور کرنٹ کے متعلق، رسوئی گیس کے خطرات کے متعلق اور اسی طرح کی جدید ایجادات کے گھریلو استعمال کی صورت میں امکانی خطروں سے آگاہ کر دینا چاہیے کہ وہ کس طرح اپنا بچاؤ کریں۔

اس دور کے بچوں کو سڑکوں پر چلنے کے ڈھنگ سکھانے کے ساتھ ٹریفک کے خطرات سے بچنے کی تربیت دینی ضروری ہے۔ گھر کا دروازہ کھولتے ہی بچہ ایک دم دوڑتا ہوا سڑک یا گلی میں نہ نکلے، شاید کوئی سائیکل یا اسکوٹر والا آ رہا ہو۔ اسی لیے سڑکوں کے دونوں طرف فٹ پاتھ ہوں تو ان پر چلنا بہتر ہے۔ جہاں نہ ہوں وہاں سڑک کے عین کنارے دائیں جانب۔ تاکہ سامنے سے آتا ہوا ٹریفک دکھائی دے اور پیچھے سے کوئی آ کر ٹکر نہ مار دے، فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے خیال رہے کہ سامنے کسی کوٹھی سے گاڑی نہ نکل رہی ہو یا کسی گلی یا سڑک سے اسکوٹر وغیرہ نہ آ رہا ہو۔ سڑک پار کرنا ہو تو اوّل تو عام نظر ڈالنی چاہیے کہ اب ٹریفک زیادہ نہیں ہے۔ پھر پہلے اپنی داہنی جانب دیکھنا چاہیے کہ گاڑیاں قریب تو نہیں۔ اس کے بعد بائیں جانب۔ سڑک کے دو حصے ہوں تو پہلے ایک پار کر لینا چاہیے، پھر دوسرا دیکھ بھال کر۔ سڑک کو آنکھیں بند کر کے اندھا دھند پار نہیں کرنا چاہیے جیسے بعض دیہاتی دیکھے بغیر دوڑ لگا دیتے ہیں۔ اس طرح آدمی آسانی سے جھپیٹ میں آ سکتا ہے، ورنہ گاڑیوں کو یکایک روکنے سے نقصان ہوتا ہے۔ کسی گاڑی سے اترنا ہو تو بائیں جانب اترا جائے، پھر بھی یہ دیکھیں کہ آگے یا پیچھے سے کوئی سائیکل اسکوٹر تو نہیں آ رہا ہے۔ بسوں میں بیٹھ کر سر اور بازو کھڑکیوں سے باہر نہیں نکالنا چاہیے۔ بازو کٹ جانے کے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ بسوں کے پائیدان پر نہ کھڑے ہوں۔ بعض اوقات لوگوں کی

جائیں اس غلطی کی وجہ سے گئیں۔ گاڑی میں بھی دروازہ کھول کر اس میں کھڑا نہ ہونا چاہیے اور جھکنا تو بالکل نہ چاہیے۔ اسی طرح پائیدان پر ہرگز نہ کھڑا ہونا چاہیے۔ روانگی کا سگنل ہوجانے کے بعد پلیٹ فارم پر ٹہلتے رہنا اچھا نہیں۔ چلتی گاڑی پر چڑھنا بھی خطرناک اور اترنا اس سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس قسم کا ایک واقعہ میں نے بہ چشم خود دیکھا۔ ایک آدمی مجھ سے باتیں کرتے کرتے چھوٹا سا اسٹیشن آنے پر کہنے لگا، یہاں سے مجھے جانے میں آسانی ہوگی۔ گاڑی کی رفتار ذرا ہلکی ہوگی تو میں اتر جاؤں گا۔ چنانچہ جب وہ اترا تو نہایت بُری طرح روڑی پر گرا اور اس کا سارا سامان دور دور تک بکھر گیا۔

بسوں کے پاس اور اسٹیشنوں پر ناقص مال بیچنے والے بہت ہوتے ہیں۔ ان سے کھانے پینے کی رڈی چیزیں جلدی جلدی نہ لی جائیں بلکہ پہلے ہی گھر سے بنا کر یا اچھی دکانوں سے خرید کر چلیں۔ تھرمس میں اپنی چائے رکھیں۔ گرمیوں میں ٹھنڈے پانی کا سامان بھی اپنا کریں۔

بچے کو چھوئی موئی نہیں بنانا

اب تک جو باتیں ہم نے لکھی ہیں ان میں خاصا حصہ وہ ہے جہاں بچے کو احتیاط و اجتناب کا درس دیا جاتا ہے مگر جس بچے کو چاروں طرف سے ہر آن امتناعی احکام ملیں (چاہے وہ کتنے ہی درست ہوں) وہ سکڑ سہم جاتا ہے اور نہ اُس کی خودی نشو و نما پاتی ہے، نہ شعور پروان چڑھتا ہے اور نہ اس میں قوتِ تفکر، قوتِ تخلیق اور قوتِ ایجاد پیدا ہوتی ہے۔

اس خطرے کے سدباب کے لیے ایک ابتدائی ضروری طریقہ تو یہ ہے کہ پہلے کھیل کے پیرائے میں ورزش اور پھر باقاعدہ اجتماعی پریڈ (بہ ذریعہ اسکول) کے ذریعے اس میں اپنے جسم سے کام لینے اور اُسے بہتر اور مضبوط اور زیادہ کارآمد بنانے کا رجحان پیدا کیا جائے۔ دوسری چیز یہ کہ وہ آہستہ آہستہ چھوٹے موٹے مقابلے شروع کرے، مثلاً کسی کے ساتھ دوڑ لگانا، یا بڑے ہونے پر ہاکی، فٹ بال یا کرکٹ میچوں میں شامل ہونا۔ پہلے محلے یا اپنے مدرسے سے شروع کرکے، پھر آگے بڑھنا۔ اس کے ساتھ صبح کی سیر کی عادت آپ خود پیدا کیجیے۔ صبح اٹھیے، بچے کو اٹھائیے اور اسے گھر سے باہر کھلی ہوا میں لے جائیے، مسجد میں نماز بھی ہوجائے اور پھر ایک آدھ میل کی سیر بھی اور سیر کے دوران میں دوڑ بھی۔ بیچ بیچ میں مختلف چیزیں سامنے آنے پر ان پر سبق آموز

گفتگو کیجیے، پرندوں، پھولوں اور درختوں کی باتیں چھیڑیئے۔ فطرۃ اللہ کے کمالات اور مرقع ہائے حسن کی طرف توجہ دلایئے۔

بچے کو گھر میں کئی چیزوں کو چھیڑنے کا شوق ہوتا ہے۔ کسی دن اسے اس کی پسند کی چیز کا مشاہدہ کرایئے۔ مثلاً سلائی مشین، اس سے آہستہ آہستہ چلوایئے، پھر اسے مشین کے نیچے کی مشینری دکھایئے۔ کبھی ٹیلی فون کے آلے کی آزمائش کرایئے۔ کبھی پھلوں سے رس نکالنے والی مشین کی کارکردگی سمجھایئے۔ ریڈیو کے اصول، ٹیلی ویژن کا طریقِ کار، ٹائپ رائٹر کی خدمات سے آگاہ کیجیے۔ اس طرح کی معلومات دینے والی کتابیں پڑھایئے۔ بجلی کیا ہے اور کیسے پیدا کی جاتی ہے یا بیٹری کیسے بنتی ہے وغیرہ بجلی کیوں گرتی ہے۔ بادل کیسے بنتے ہیں۔ پھر کوئی موقع ہو کہ کوئی مستری وغیرہ آپ کی کسی مشینری یا وائرنگ یا کسی اور چیز کو ٹھیک کرنے کے لیے آئے اور بچہ یا بچی گھر پر موجود ہو تو اس کو وہ سب دکھائیں۔ کبھی بیٹے بیٹی کو پریس میں کام ہوتا دکھالائیں، کبھی اسکوٹر یا گاڑی کو آپ یا آپ کے پڑوسی دوست کھولیں تو اس کے اہم پُرزوں سے اور سسٹم سے بچے کو آگاہ کریں۔ اس طرح کی معلومات کے لیے بہت سے ادارے اور شعبے اور کارخانے ہو سکتے ہیں۔ راہ چلتے چلتے آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سامنے جو ریلوے سگنل ہے وہ کیا کام کرتا ہے۔ بجلی کا کھمبا لگا ہے۔ اس کا مقصد کیا ہے۔ یہ گفتگو بہت تفصیلی کرنے کے بجائے میں یہ کہوں گا کہ جدید مشینوں اور ایجادوں کو اوّل اوّل تو صرف متعارف کرایئے اور ان کی کارکردگی بتایئے، بعد میں بچے کو اس کے استعمال کا تھوڑا سا تجربہ اپنے ساتھ کرایئے اور پھر جب وہ مناسب عمر کو پہنچے تو خود اس سے کام لیجیے۔

ہو سکے تو بڑھئی، لوہار، بجلی اور سوئی گیس کے کاریگروں کے آوزار آہستہ آہستہ جمع کرلیں اور اپنے کام گھر میں خود کرنے کے سلسلے میں بچوں کو بھی تربیت دیں۔ خصوصاً آج کل لکڑی اور لوہے کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑ کر مختلف گاڑیاں یا میز کرسیاں یا مکان بنانے کا جو کھیل کھیلا جاتا ہے اس کا انتظام ضرور کریں۔

مسائل کو سوچنا، ان کے حل نکالنا، نئی باتیں ایجاد کرنا وغیرہ صلاحیتیں بچوں میں اتنی پیدا ہو جائیں کہ وہ چاق و چوبند رہیں اور آگے بڑھ کر کام کریں۔ نیز لکھنے پڑھنے کے کاموں میں بھی اتنی ترقی کریں کہ وہ اعلیٰ مرتبے حاصل کریں، انعام پا سکیں اور تحقیقی مہمات کے راستے نکال سکیں۔

بہت ضروری بات یہ ہے کہ معاشرے میں گھس کر کام کے آدمیوں سے جرأت سے مل کر خود اعتمادی کے ساتھ بچے بات کرسکیں اور ان سے کوئی مدد لینی ہو یا کام لینا ہو یا کسی زیادتی سے انہیں باز رکھنا ہو تو حسن کلام اور زورِ استدلال سے ہنستے مسکراتے بات کرسکیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دوست بناسکیں۔ اچھے دوست بنانے کے سلسلے میں ان کو رہنمائی اور مدد دیں اور بری دوستیوں سے بچائیں۔ خدمت کے ذریعے رام کریں اور ایک مقبول شخصیت حاصل کریں۔

ایک ضروری گزارش یہ کہ گھر میں والدین یا دوسرے بزرگ، بچے یا بچوں کے لیے ہر وقت قابلیت اور نیکی کی دعائیں کریں اور خود بچوں کو بھی اپنے بہتر مستقبل کے لیے دعا کرنا سکھائیں۔

احتیاطیں

اس مشینی دور میں جب کہ قدرت کی بھاری قوتوں سے کام لیا جا رہا ہے اور ہر طرف یہ قوتیں جنوں اور دیوؤں کی طرح کام کررہی ہیں، یہ انسان کو فائدہ دینے کے ساتھ ساتھ خطرناکیاں بھی رکھتی ہیں۔

مثلاً پتھر یا لکڑی کے کوئلے کی انگیٹھیاں (جواب کم استعمال میں آتی ہیں) پوری طرح انگاروں کے دہک کر سفید ہو جانے سے پہلے کمرے میں رکھنا یا اس کے بعد کمرہ بند کر دینا سخت خطرناک ہے۔ اس سلسلے میں راقم نے خود کئی حادثات دیکھے اور اُن کا علم ہے۔

بجلی کے تار گھر میں آتے ہیں، سوئچ لگے ہوتے ہیں، پلگ استعمال ہوتے ہیں، ان کے بارے میں سخت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ بجلی کا پوری طاقت سے ایک بار چھو جانا بسا اوقات جان لے لیتا ہے۔ جس شخص کو بجلی نے پکڑ لیا ہے اسے چھڑانے کے لیے لکڑی کے تختے یا کسی چوبی کرسی سے اسے دھکا دیں۔ خود ہاتھ لگائیں گے تو لپیٹ میں آ جائیں گے۔ بجلی کی فٹنگ قواعد کے مطابق ہونی چاہیے۔ تاروں کے جوڑ اچھے ہوں۔ سوئچ پلگ وغیرہ تمام چیزیں اچھی ہوں۔ گھروں میں لازماً اَرتھ کرنے کے لیے تیسرا تار لگوائیں۔

سوئی گیس کا معاملہ بھی بہت نازک ہے۔ چولہے یا ہیٹر اچھی قسم کے استعمال کریں اور ان کی استعمال شدہ گیس کے ناکارہ زہریلے اجزاء کے اخراج کا بندوبست کریں۔ رات کو سونے سے پہلے سوئی گیس کے مین سوئچ تک بند کر دیں۔ نالی میں جو جوڑ لگے ہوں ان کو دیکھ بھال

لیں۔ اگر گیس کی ذرا سی بھی بو آئے تو وہ سخت مضر ہے۔ گیس کے چولہوں، ہیٹروں یا پمپوں وغیرہ کو فٹ کرنے کے لیے اناڑی آدمیوں سے کام نہ لیں اور پوری طرح نظام کو سمجھے بغیر خود بھی ایسے کام کی ذمہ داری نہ لیں۔ گیس کے لیے جو قواعد مقرر ہیں (پائپوں اور جوڑوں اور نکاس کے متعلق) ان کی پوری پابندی کریں۔ یہی تربیت بچوں کو دینی ہے۔

چوٹ لگنے اور جل جانے یا چاقو چھری سے کوئی زخم آ جانے پر فرسٹ ایڈ کی تربیت بھی دینی چاہیے اور آگ یا بجلی کے قریب جانے اور بے توجہی اور لاپروائی برتنے سے اولاد کو روکنا چاہیے۔ چاقو چھری یا دوسرے آلات کا استعمال ایک خاص عمر تک تو بالکل نہ ہونا چاہیے۔ بعد ازاں محتاط استعمال کی تربیت دینی چاہیے۔ چاقو چھری قینچی کھلے نہ چھوڑ دینے چاہئیں۔ اسی طرح بلیڈ وغیرہ ان کی دسترس سے دور رکھنا چاہیے۔

کموڈ یا پاٹ کے استعمال کے لیے ماں ضروری تربیت دے۔ ایک اصولی بات یہ ضروری ہے کہ بڑے یا بچے پاٹ میں مٹی، ڈھیلے، پتھر، کاغذ، گتے، پھلوں کے چھلکے، عام کوڑا، بال وغیرہ جیسی چیزیں ہرگز نہ ڈالیں۔ جن جگہوں پر حفاظت کے لیے چھلنیاں لگائی گئی ہوں، ان چھلنیوں کو کبھی نہ اکھیڑیں۔ اُجڈ لوگ ان بے احتیاطیوں کی وجہ سے بڑی مشکلات پیدا کرتے ہیں۔

بچوں کو ایک خاص عمر مثلاً ۱۲ سال سے پہلے چھوٹے چھرّوں والی بندوق نہ لے کر دیں، جب لے کر دیں تو ان کو یہ سکھائیں کہ پرندوں کو بے کار زخمی نہ کرتے پھریں کہ اگر کسی چڑیا یا فاختہ یا کوّے کے پر یا ٹانگ یا پیٹ میں چھرّا لگ جائے گا تو وہ ہاتھ تو اکثر صورتوں میں نہیں آئے گا لیکن اسے چھرّے کی تکلیف بہت پریشان کرے گی، حتیٰ کہ اس کی جان لے لے گی۔ ایسے مشغلے سے بچہ بے رحمی میں مبتلا ہوسکتا ہے اور اس پر یہ خیال طاری ہوسکتا ہے کہ خدا کی کمزور مخلوق کے ساتھ وہ جو تفریح یا سلوک کرنا چاہے اور اس کے جو بھی نتائج ہوں، اس پر کوئی اخلاقی ذمہ داری نہیں۔ کھلونا بندوق جب لائی جائے تو کسی احاطے میں یا گھر سے باہر کھیتوں میں لے جا کر کسی دیوار یا پتھر یا لکڑی کو نشانہ بنانے کی مشق کرنی چاہیے۔ اگر کئی بچے ہوں تو کاغذ یا گتے پر مشق کرنے کے لیے نشان بنے ہوئے ملتے ہیں۔ انھیں سامنے رکھ کر مقابلہ کرانا چاہیے جس کا ایک وقت مقرر ہو۔ نہ یہ کہ ہر وقت ہر جگہ چھرّے چل رہے ہوں۔ ہمارے قریب اعوان ٹاؤن میں میرے ایک جاننے والے معزز دوست کا بچہ اسی خطرناک کھیل کا شکار ہوا، اسے کسی نے وہ چھوٹا سا

چھرّا مار دیا۔ وہ دماغ کی کسی ایسی رگ پر لگا کہ وہ فالج میں مبتلا ہوگیا۔

اسی طرح ہرگز ہرگز قانون کی مقررہ عمر سے پہلے بچے کو اسکوٹر یا کار چلانے کی اجازت نہ دیں۔ ورنہ اگر قانون شکنی کے راستے پر آپ نے اسے ڈال دیا اور اس نے یہ محسوس کرلیا کہ گھر والوں کے عہدے یا اثر و رسوخ یا دولت کے آگے کوئی قانون نہیں کھڑا رہ سکتا تو وہ ساری عمر قانون شکنیوں میں مبتلا رہے گا۔

کسی بچے کو رہن سہن، کھانے پینے اور موٹروں کے سیر سپاٹے کے لحاظ سے پُرتعیُّش زندگی میں ڈالنا خطرناک ہے۔ ایسے بچوں میں سے کام کے بچے کم نکلتے ہیں۔ زیادہ تر انسانیت کے لیے ضرر رساں ہوتے ہیں بلکہ ان کی اکثریت نالائقوں پر مشتمل ہوتی ہے جو علم کی راہ پر نہیں بڑھ سکتے، بس زیادہ سے زیادہ یہ کہ باپ نے اگر دولت پیدا کرنے کے لیے کوئی مشین لگائی ہو تو اس کو چلانے میں محو ہوجاتے ہیں۔ ایسے بچوں میں سے دین کی خدمت اور انسانیت کی بھلائی چاہنے والے لوگ کم ہی برآمد ہوتے ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ چاہے بہترین ذرائع آمدنی حاصل ہوں۔ بہت سی زمین ہو، یا کارخانہ ہو، یا تجارت ہو یا کوئی بڑا عہدہ ہو، ہاتھ آنے والی دولت کو والدین یا اہل خانہ سارے کا سارا اپنے اوپر خرچ نہ کر ڈالیں اور شان و شوکت کے سامان نہ جمع کریں بلکہ جتنی زیادہ آمدنی ہو، اتنا ہی زیادہ انفاق کریں۔ اچھی معتدل گزر بسر کے ساتھ دین، سماجی اداروں اور اقرباء یا پڑوسیوں میں سے مستحقین کی خدمت کرتے رہنے کا ایک مستقل اصول گھر میں کارفرما رہے تو بچوں میں یہی چیز پروان چڑھے گی۔ ان کو بتایئے کہ جو دولت ہم تک پہنچی ہے وہ ساری ہماری نہیں بلکہ گزر بسر سے زیادہ اس کا بڑا حصہ مجبور و معذور لوگوں اور دین و ایمان اور راستی و نیکی کی خدمت کے لیے ہے۔

اپنے بچوں کو ایسے حالات سے بھی بچایئے کہ وہ اپنے آپ کو محروم اور بدحال محسوس کریں، دوسری طرف، ایسے حال سے بھی بچایئے کہ وہ کھانے، کپڑوں یا کھلونوں اور سامانوں اور سہولتوں کے مہیا ہونے کی وجہ سے عام بچوں کے لیے کبر و فخر سے پیش آئیں اور غریبوں سے حقارت کا برتاؤ کرنے لگیں۔

ایک بات جو اوئل میں لکھنے کی تھی یہ بھی ضروری ہے کہ گود کے بچے کو بوتل کا دودھ ہرگز نہ پلایا جائے کیوں کہ ماں بچے دونوں کے لیے اس کی شدید مضرتیں شائع ہوچکی ہیں اور مغربی

ریڈیو اسٹیشنوں اور ٹیلی ویژنوں تک سے اس بارے میں میڈیکل تجربات سامنے لائے گئے ہیں اور بار بار لائے جارہے ہیں۔ بیرونی دودھ میں جو کیمیکلز شامل ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی وقت جلدی کے سبب بوتل کی صفائی میں ذرا سی کسر بھی اگر رہ جاتی ہے تو جراثیم داخل ہوکر بچے کے لیے مصیبت کا باعث بنتے ہیں۔ ماں کا دودھ ایسی سربہ مہر بوتلوں میں قدرت فراہم کرتی ہے کہ نہ مضر کیمیکلز کا کوئی تعلق نہ جراثیم اور وائرس کا دخل۔ صرف تھوڑی سی بیرونی صفائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سوچیے کہ بچوں کی پرورش کا وہی کام جو صدیوں سے مفت ہورہا تھا، صرف ماں کے غذائی معیار کو ذرا بہتر رکھنا ہوتا تھا اسی کے لیے اب درآمدی دودھ پر کروڑوں روپیہ صرف ہوتا ہے اور بیرونی کمپنیوں کو ایک بڑی مارکیٹ مل گئی ہے۔ پھر ستم یہ کہ سائنسی تحقیق اور نفسیاتی تجزیے سے یہ حقائق سامنے آئے ہیں کہ جس بچے کو ماں کے جسم سے دور رکھا جائے اور ابتدائی دورِ غذا کا سرچشمہ مادریت نہ ہو، ماں اسے سینے سے لگائے نہیں، اس کے سر پر اور اس کی پشت پر آہستہ آہستہ ہاتھ نہ پھیرے اور اللہ اللہ یا کوئی لوری نہ پڑھے، بچے کا نہ صرف نظامِ ہضم اچھا کام نہیں کرتا بلکہ اس کی نفسیاتی و اخلاقی ساخت میں اتنی بڑی کمی رہ جاتی ہے کہ وہ چاہے کتنا ہی قابل اور توانا بن جائے، وہ خداپرستی اور انسان نوازی کے لحاظ سے صفر رہتا ہے۔ ماں کو جو میڈیکل معنوں میں نقصان ہوتا ہے وہ الگ۔ یوں سمجھیے کہ یہ دودھ پلانے کا عمل آغوشِ مادری کے مکتب کے پروگرام کا ایک ضروری حصہ ہے۔ اس کے نقصان کی تلافی کوئی استاد اور لٹریچر نہیں کرسکتا۔

خیال رہے کہ بوتل تھما کر بچے کو لٹا دینے والی ماں جب اِدھر اُدھر چلی جاتی ہے تو اُچھو آنے کی آواز پر وہ متوجہ نہیں ہوسکتی، لہٰذا بچوں کی بہت سی موتیں اس وجہ سے ہوتی ہیں کہ دودھ پیتے ہوئے، یا اس دوران میں غنودگی یا نیند آجانے کی وجہ سے دودھ سانس کی نالیوں میں جاکر ان کو بند کردیتا ہے۔

جب تک کوئی ماں بچے کو دودھ نہ پلائے، اسے گود میں بار بار نہ لے، اس سے باتیں نہ کرے، اسے لوریاں نہ سنائے، اسے اپنی آواز سے مانوس نہ کرے اور اسے زبان سیکھنے کے راستے پر نہ ڈالے تو مکتبِ آغوشِ مادر اپنے فرض میں ناکام رہا۔

ہاں! بچوں کو (اپنے یا مہمان بھی ساتھ ہوں) تو گھر میں تھوڑا بہت شور مچانے دیں۔ اس پر پریشان نہ ہوں، زجر و توبیخ نہ کریں۔ لیکن جب ان کی آوازیں یا کھیل دوسرے گھروں

کے لیے تکلیف کا باعث ہونے لگیں تو ان کو احتیاط کی تلقین پیار اور نرمی سے کریں۔

ایسا کبھی نہ ہو کہ ایک بچے کو آپ دوسروں پر زبان سے یا رویے سے ترجیح دیں، یا لڑکیوں پر لڑکوں کو۔ اگر کوئی چیز لائیں تو سب کے لیے لائیں۔ ان کے ہاتھوں سے (باری باری) تقسیم کرائیں۔ ایک بچے کو جو ہدایت آپ ایک دفعہ دیتے ہیں، پھر اس کے متضاد دوسری ہدایت نہ دیجیے۔ یا ایک بچے کو جو اخلاق سکھائیں، دوسرے کو اس کے خلاف نہ سکھائیں۔

آخری خلاصہ یہی کہ تربیت بچگان کا سارا دار و مدار اس پر ہے کہ والدین اور بھائی سب خود کس ذہن کے ہیں، کیا کردار رکھتے ہیں، کیا واقعی وہ بچوں کو اعلیٰ اور شائستہ و شریف انسان بنانا چاہتے ہیں، اپنے آپ کو دینی و اخلاقی اور مجلسی و تہذیبی طور طریقوں پر کہاں تک استوار رکھتے ہیں۔ اگر وہ خود درست ہوں گے تو ان کے سائے میں اولاد بہترین طریق سے پروان چڑھے گی۔ اگر بڑوں میں کوئی کمی ہو تو بچے کی ولادت سے پہلے آپس میں مشورہ کر کے اپنی اصلاح کر لیں۔

اولاد کا مستقبل

آج کل ہر کسی کو پہلے اپنے دائرہ کار میں معاش اور ترقی کی دوڑ کا جنون لاحق رہتا ہے، پھر اولاد کے متعلق یہی فکر لاحق ہوتی ہے کہ وہ دولت کی گھوڑ دوڑ میں آگے بڑھ جائیں۔ یہ درست کہ معاش بھی ضروری ہے، دین میں اس کی اہمیت ہے اور ترقی بھی ضروری ہے کہ رزم گاہِ حیات میں دوسری قوموں اور اپنے ملک کے مفاد یافتہ طبقوں اور غالب برادریوں کے پہاڑ کاٹے بغیر کوئی بھی شخص اپنی جگہ نہیں بنا سکتا۔ کمزور آدمی کو بالعموم دوسرے لوگ اور کمزور قوموں کو سامراجی قوتیں سواری بنا لیتی ہیں۔

معاش ہو یا ترقی، تعلیم کے دروازے سے داخل ہوئے بغیر کچھ نہیں ملتا۔ پس آپ اپنے بچوں ــــ لڑکوں اور لڑکیوں ــــ سب کے لیے دل و دماغ کو روشن کر دینے والی تعلیم کا انتظام کریں۔ عام روش یہ ہے کہ والدین نوکریاں کرتے ہیں، بچوں کو نوکروں یا بچہ گھروں کے حوالے کر جاتے ہیں اور وہ پدریت اور مادریت دونوں سے محروم رہ کر پروان چڑھتے ہیں۔ یہ بالکل غیر فطری طریقہ ہے اور اس کے روحانی و اخلاقی اور نفسیاتی نتائج خطرناک نکلتے ہیں۔ جدید معاشروں میں پاگل پن، وحشیانہ پن، نشہ بازی، جرائم اور نوعمری کی قانون شکنیاں اور ۸، ۹

سال سے اوپر تک نو دمیدہ غنچوں اور کلیوں کی بدکاریاں اتنی عام ہیں کہ ان معاملات میں ماہرین نے کتابیں لکھی ہیں اور دانشوروں میں سوچ بچار جاری ہے کہ اس صورتِ حال کا کیا علاج ہو۔

پھر ستم یہ کہ ہمارے ہاں کے ماڈرن والدین اور ان کی تقلید میں کچھ شریف لوگ بھی اپنے روتے چیختے بچوں کو گویا نرسریوں میں پھینک جاتے ہیں کہ جان ''چھٹی'' اور لاکھوں پائے۔ تعلیم و ترقی کے لیے صرف یہ بات ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ بچے کو کسی اعلیٰ عہدے تک پہنچنے میں اس کی سندات مضبوط سیڑھیوں کا کام دے جائیں۔ اور پھر بچے یا تو عیسائی اسکولوں کے حوالے ہو جاتے ہیں یا مغرب پرست اور نقّالانِ فرنگ ملحدین کی درس گاہوں میں پہنچتے ہیں۔ بہترین تعلیم گاہ کا معیار یہ ہے کہ ماہانہ فیس بہت بھاری ہو۔ مثلاً کم سے کم درجہ سو روپے تک کی فیس کی درسگاہوں کا ہے۔ پھر دو سو تا پانچ سو والی درس گاہیں آتی ہیں، بہترین وہ ہیں جو کم سے کم ہزار روپے لیں۔ بلکہ شاید اس سے زیادہ کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ دوسری لازمی صفت اعلیٰ تعلیم گاہ کی یہ ہے کہ اس میں پہلے درجے سے انگریزی پڑھائی جاتی ہو اور انگریزی معاشرت کے آداب سکھائے جاتے ہوں۔ بچوں کو بالعموم دو ایک انگریزی نظمیں یا کہانیاں یاد کروادی جاتی ہیں اور ماں باپ اس زندہ ٹیپ ریکارڈ کو سن کر خیال کرتے ہیں کہ بڑی قابلیت حاصل ہو رہی ہے۔ حالاں کہ انگریزی میں تعلیم پانے والوں کی پوری نسل میں کوئی تخلیقی یا تحقیقی مرتبے کا آدمی پیدا نہیں ہوا۔

لہٰذا آپ محض عام ڈگر پر نہ چلیں۔ بلکہ چند باتیں سامنے رکھیں۔

آپ کے بچے میں ایمان ہونا چاہیے، اپنے دین کا شعور، اپنے اخلاقیات کی پابندی، اپنی تہذیب کا احترام، اپنی تاریخ سے دلچسپی، اپنے دینی، سیاسی، سائنسی اور عسکری اکابر کا احترام!

اس کے لیے پہلا کام تو ابتدائی دو سال میں گھریلو اور مکتبی دینی تعلیم و تربیت ہے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ آپ کسی اچھے اسکول میں اپنے بچے کو داخل کرائیں جہاں دینی رجحانات کی آبیاری بھی ہوتی ہو[1] اور علوم کی بہم کردہ معلومات بھی مہیا کی جاتی ہوں۔ کچھ کمی ہو تو گھر پر

---

(۱) دونوں قسم کے علوم کو بہت سی درس گاہوں میں جمع کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ مگر یہ سب اس طرح ہیں کہ قدیم طرز کے ایک دینی کورس پر انگریزی زبان اور معاشیات یا تاریخ و جغرافیہ کی دو ایک کتابوں کا پیوند لگا دیا جاتا ہے اور یوں جدید تعلیم کا عنصر بڑا سرسری سا ہوتا ہے۔

روزانہ ایک گھنٹے کے لیے یا چھٹی کے دن دو تین گھنٹوں کے لیے ٹیوٹر مقرر کرکے دینی تعلیم دلائیں۔غریب گھرانے تین تین چار چار مل کر ایک جگہ انتظام کرلیں۔اس تعلیم کا مختصر سا مگر انتہائی لازمی نصاب ۵ سال میں پڑھا دینا چاہیے۔اور ۵ تا ۸ سال میں عربی زبان کی تعلیم مکمل کرالینی چاہیے۔

(۲) آپ کی اولاد جوان ہوکر جب فارغ ہوتو وہ مسلم ڈاکٹر، مسلم سائنٹسٹ مسلم اکانومسٹ، مسلم سوشیالوجسٹ اور مسلم فلاسفر یا انجینئر بن کر نکلے اور یہ محسوس کرے کہ میں ایک عظیم مشن کا علم بردار ہوں اور اپنے کام کی روح مجھے اس مشن کو بنانا ہے۔

پھر آپ اولاد کے متعلق حسبِ ذیل پہلو سامنے رکھیں:

اگر آپ دین اور اسلامی قانون کی تعلیم میں فاصل بنوانا چاہیں تو اسلام آباد کی دعوۃ یونی ورسٹی میں داخل کرا کے مدینہ یونی ورسٹی تک پہنچائیں۔

یا آپ اسے ادبی ذوق کی راہ پر ڈالیں اور وہ ایک اچھا ادیب یا شاعر یا محقق یا انشاء پرداز یا تنقید نگار بنے۔

یا آپ اس میں فلسفے یا سائنس کی وسیع تحقیقات کا شوق پیدا کریں تاکہ وہ جدید مخالفِ اسلام نظریات فاسدہ کا نہ صرف ناقدانہ تجزیہ کرسکے بلکہ ماہرانہ طور پر اسلامی فکر کو غالب قوت کی حیثیت سے ابھارے۔خاص طور پر مستشرقین کے خلاف جوابی مؤثر اور مثبت کام کرنے کا ولولہ اس میں پیدا کریں۔

میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ زبردستی اسے کسی جانب دھکیلیں۔بلکہ مختلف میدانوں میں سے جس کے لیے اس کے اندر آپ کو رجحان محسوس ہو اور اس کے بعض سمجھ دار استادوں کی بھی رائے آپ لے لیں، اس کی مرضی کے رُخ پر آپ اسے لے جائیں۔

اگر آپ نے صحیح بنیادی تربیت اور مناسب تعلیم کے ساتھ جس میں ایمان اور عقل دونوں ہم آہنگی سے کام کریں۔ایسا ایک نوجوان بھی قوم یا انسانیت کو فراہم کردیا تو اس کی بڑی جزا ہے آپ کی اولاد کے لیے بھی اور آپ کے لیے بھی۔

بس کام کے نوجوان وہ ہوں گے جو غلامانہ اور مقلّد ذہن کے پنجرے کو توڑ کر فخر و شعور کے ساتھ اسلامی حقائق کو فلسفہ، سائنس اور سیاست کے دائروں میں غالب کردیں۔

اور یہ کام صرف وہ اہلِ عزم انقلابی مجاہد کریں گے جو معیشت کو دنیا پرستی کی شکل نہ دیں اور اپنے علمی، خدمتی، تحقیقی یا تخلیقی کام یا ایجادات کی مصروفیت کو خدا کی عبادت کے جذبے سے انجام دیں۔ روپے پیسے تو اس دنیا میں تیسرے درجے کی چیز ہیں۔

مدرسہ

اوپر جو ابتدائی دورِ تعلیم و تربیت کا ذکر ہے اس میں بچوں کو کسی ایسی جگہ داخل کریں جو اصولی قسم کے دینی اخلاقی اور سماجی و تہذیبی اقدار میں آپ سے ہم آہنگ ہوں، نیز مدرسہ جس اصلاحی قدم کو اٹھائے یا قاعدہ جاری کرے اس کی اطلاع والدین کو دے کر وہ گھر میں بھی اسی قاعدے کو قائم کریں۔ خاص طور پر یہ خیال رکھیں کہ کسی بھی صورت میں گالیاں دینے والے اور مرکھنے استادوں یا استانیوں کی تحویل میں بچوں کو نہ دیں۔

کلمۂ اختتام

بچوں کی تربیت کا یہ اہم مضمون ٹیلی گرافک انداز میں بہت مختصر جملوں میں لکھا گیا ہے۔ کاش کہ میں اسے اپنی وسعتِ فکر کے مطابق لکھ سکتا۔

اس کو سامنے رکھ کر غور کریں تو یہ حقیقت قطعی طور پر واضح ہو جائے گی کہ اچھے بچوں کی اٹھان والدین کی مکمل توجہ کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً دونوں میں سے ایک فرد (ماں) کو تو لازماً گھر میں بچے کے مستقل اتالیق اور تربیت کار اور نگراں کی حیثیت میں رہنا ضروری ہے۔ اسی غرض کے لیے قرآن نے عورت (گھر والی) کو گھر میں موجود رہنے کا حکم دیا ہے[1] جن معاشروں میں اس منشائے الٰہی کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، وہاں ہر نئی نسل بدتر اخلاقی معیار کے ساتھ اٹھ رہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ مجرم پیدا ہو رہے ہیں، پستول یا رائفل کا لقمہ بن جانا، عورتوں

---

(۱) میں نے چند ماہ پیش تر ایک مغربی تعلیم یافتہ خاتون کے متعلق پڑھا کہ اس نے اپنی ملازمت کو جاری رکھنے کے لیے اپنے بچے کے لیے آیا یا نرس بھی رکھی، پھر اسے بچہ گھر میں داخل کرایا، مگر آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اپنے بچے کی دیکھ بھال اور تربیت صرف میری قدرتی ڈیوٹی ہے، اس کام کو کوئی بھی کرائے پر نہیں کر سکتا۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ مجھے ملازمت، عہدے اور تنخواہ سے زیادہ اہم ذمہ داری اپنے بچے کو اعلیٰ درجے کا انسان بنانے کو سونپی گئی ہے، سو اس نے ملازمت ترک کر دی۔ (افسوس کہ میں ایسی چیزوں کا حوالہ نہیں رکھتا)

اور بچوں کا اغوا اور منشیات کے چور بازار کی گرم بازاریاں، اپنے ملک کے خلاف پیسوں کے لیے جاسوسی اور غداری کرنا، سیاست میں انتہائی مفسدانہ ہیر پھیر، بڑے بڑے جنسی اسکینڈلوں کے طوفان کا اٹھنا، جنگی کارروائیاں، سفاکانہ ہلاکت انگیزی کے وسائل نو کا استعمال، دوسرے ممالک میں ضمیروں کی خرید وفروخت اور سیاسی اقتدار کو گرفت میں لینے کے لیے دماغوں اور ایجنٹوں کا استعمال، ۔ کتنا غیر عقلی، غیر شائستہ اور غیر انسانی طرزِ عمل ہے کہ خود ہمارے معاشرے کے حالات بھی اسی نہج پر جا رہے ہیں، یہ ہیں نتائج اس عورت کی کوتاہیوں کے جسے انسانوں کو اچھے کردار کے ساتھ اٹھانے اور غلط اثرات سے بچانے کے لیے مامور کیا گیا تھا۔ مگر وہ ترقی اور ملازمت اور مساوات مرد وزن اور فیشن اور میک اپ اور تفریحی محفلوں اور ثقافتی کلبوں میں کھوگئی۔

پھر کیا ہم اس خطرے سے خواتین اور بچوں اور معاشرے کا بچاؤ کر سکتے ہیں۔

اسکاؤٹنگ نئے انداز سے

میں عرصہ سے سوچتا رہا ہوں کہ پاکستانی مزاج یا اسلامی اساس رکھنے والے تعلیمی اداروں میں ہمیں بچوں اور نوجوانوں کی سیرت بنانے کے لیے اس طرح کی ایک نئی تحریک اُٹھانی چاہیے جو اسکاؤٹنگ کے نام سے مشہور ہے۔ مگر مجھے کوئی اطمینان بخش نام نہ مل سکا جو مسلم پاکستانی ہونے کے تصور کے ساتھ خدمتِ ملت وانسانیت کے تصور کو جمع کر لیتا۔

حال ہی میں میرے ذہن میں آیا کہ جہاں تک نام کا تعلق ہے اس کا استعمال یوں ہو:

الخادِم	اسکاؤٹ فرد
الخُدّام	اسکاؤٹ جماعت
تنظیم یا تحریک یا نظام الخدمت	اسکاؤٹنگ

'الخادم' کا حلف

- میں خدا کی توحید پر ایمان رکھتے ہوئے اس کی ہدایت اور اس کے رسول پاک محمد مصطفیٰؐ کے اسوۂ حسنہ کے تحت زندگی گزاروں گا۔

- میں پاکستان سے محبت اور وفا کا رشتہ رکھوں گا، کیوں کہ یہ میری اُمیدوں اور امنگوں کی سرزمین ہے۔ اس کی وحدت اور استحکام کے لیے اور اس کے باشندوں کی بھلائی کے لیے بغیر نسلی و علاقائی یا کسی گروہ بندی کا لحاظ کیے ہر ممکن خدمت کروں گا۔ کسی ایسے کام میں شریک نہ ہوں گا جس کا مقصد اتحاد کو توڑنا اور امن کو تباہ کرنا ہو۔
- میں عہد کرتا ہوں کہ دنیا کے ہر محتاج، مظلوم اور مصیبت زدہ آدمی کی امکانی مدد کروں گا۔

کام اور کام کے میدان

کچھ اور دل کی باتیں!

کسی مجبورانہ صورتِ حالات میں جب اجتماعیت کے تحت کام کرنے والوں کا نظم معطل ہو جاتا ہے تو یہ بڑی سخت آزمائش کا مرحلہ ہوتا ہے یعنی آدمی کو اپنے موقف پر قائم اور محوِکار رکھنے اور ایمان واخلاق کا معیار برقرار رکھنے کے لیے خارج سے جو سہارے ملتے ہیں وہ زیادہ تر ختم ہو جاتے ہیں، تب اصل دارومدار اپنے ہی ایمان وشعور کی داخلی قوت پر ہوتا ہے۔ جو لوگ ہجوم میں چلنے اور دوسروں کے ریلوں کے بل پر حرکت کرنے کے عادی ہوتے ہیں، ان کی ساری گرما گرمی ختم ہو جاتی ہے، جو لوگ ہر اقدام کے لیے اوپر کے احکام کے منت کش ہوتے ہیں اُن کے قدم رُک جاتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ دعوتِ دین، تعمیرِ اخلاق اور خدمتِ معاشرہ کو سیاست کے تابع کر لیتے ہیں وہ کسی غیر سیاسی دور میں داخل ہونے کے بعد اپنے آپ کو خلا میں محسوس کرتے ہیں کہ بس اب کام کرنے کا کوئی راستہ باقی نہیں ہے۔

اگر آپ داعیٔ حق ہیں تو کسی کے جھنجھوڑنے کا انتظار کیے بغیر جاگ اٹھیے، دوسروں کی مشعلیں مدد نہیں کر رہی ہیں تو اپنے اندر کے دیے کو اُکسائیں، کوئی صدائے جرس نہیں آتی تو اپنے دل کی دھڑکنوں کی آواز کے زیر و بم پر گامزن ہو جائیں۔

کرنے کا اصل کام

نہ بھولیے کہ آپ شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (البقرہ:۱۴۳، الحج ۷۸) میں سے ہیں۔ جنھیں خدا نے چن لیا اور جو خدا کے رسولؐ کے سکھائے ہوئے پیغام کو پھیلانے پر مامور ہیں ھُوَاجْتَبٰکُمْ (الحج:۷۸)

اور وَیَتَّخِذَ مِنۡکُمۡ شُھَدَآءَ ؕ (آلِ عمران: ۱۴۰) کے کلمات سے اللہ نے جو منصب اور رتبہ آپ کو دیا ہے، اُسے سمجھنے اور اُس کی ذمہ داریاں پوری کرنے میں کسی لمحے بھی غافل نہ ہوں۔ اپنے آپ کو اس بدبختی سے بچایئے کہ جس طرح آپ کو چن لیا گیا ہے، اُسی طرح نالائقی کی وجہ سے ٹھکرا دیا جائے۔ عہدہ نہ ملنا کم خرابی کی بات ہے لیکن عہدے سے نااہلی کی بنا پر ڈسچارج کر دیا جانا بڑی تباہی ہے۔

جو لوگ ایمان سے محروم ہیں اُن کو حالتِ ایمان تک لانا اور جن کے ایمان خوابیدہ ہیں اُن کے ایمانوں کو بیدار کرنا اور جہاں کہیں ایمان اور عمل میں فاصلے اور تضادات ہوں اُن کو دور کرنا آپ کی اوّلین ذمہ داری ہے، بلکہ فی الحقیقت یہی ایک ذمہ داری ہے۔ کسی معاشرے کے جس قدر افراد میں بھی ایمان اپنا صحیح کام کرنے لگتا ہے اُن کو ایمانی سیاست کا راستہ بھی از خود مل جاتا ہے اور باقی تمام دائروں میں بھی ہدایت مل جاتی ہے۔ اگر کسی شخص میں توحید و رسالت کے صحیح شعور کے ساتھ ایمان کام کرنے لگے تو یوں سمجھیے کہ اسلامی سیاست اور تحریک اقامتِ دین کا مجاہد کارکن بھی پیدا ہو گیا۔

پس خادمانِ اسلام کا اوّلین اور اہم ترین کام خواص و عوام کو خدا پرستی اور پابندیٔ دین کی دعوت دینا ہے۔ یہ کام اتنا بنیادی اور اتنا اہم ہے کہ یہ ہر قسم کے حالات میں جاری رہتا ہے۔ آپ جیل میں ہوں تب بھی اور اقتدار کے تخت پر ہوں تب بھی، آپ بے بسی کے عالم میں ظالموں کے ہاتھوں اذیتیں بھگت رہے ہوں تب بھی اور تلوار کا مقابلہ تلوار سے کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں ہوں تب بھی، آپ خواہ ایک بے پایاں ہجوم کے درمیان گھرے ہوں، خواہ تنہا ہوں، وسائل رکھتے ہوں یا بے وسیلہ ہوں، خوش حال طبقوں تک رسائی رکھتے ہوں یا غریبوں سے میل جول ہو، آپ کی تعلیم اعلیٰ درجے کی ہو، یا کم درجے کی، آپ استاد ہوں یا طالب علم اور آپ اجیر ہوں یا مستاجر، ہر قسم کے حالات میں فریضۂ دعوت برقرار رہے گا۔ آپ تعلیم و تلقین کی حدود میں ہوں، یا خدمت کے دائرے میں، انتخابی کش مکش میں شریک ہوئے ہوں یا ابھی نہ ہوئے ہوں، شریک ہو کر جیتنے کے حالات رکھتے ہوں یا شکست کے امکانات، آپ اپوزیشن میں بیٹھے ہوں یا وزارت میں آئیں حالات کی کوئی بھی شکل ایسی نہیں کہ اساسی دعوتِ دین کا فریضہ معطل ہو جائے یا ثانوی و ضمنی درجہ پر چلا جائے۔

جس طرح جہاد نہ اِس صورت میں رکتا ہے کہ کوئی ظالم قوت غالب ہو اور نہ اس صورت میں کہ اقتدار ارباب عدل کے ہاتھ میں ہو، اسی طرح دعوتِ دین کا کام کسی بھی صورتِ حالات میں نہیں رکتا۔ وہ تعلیم کے دائرے میں، علوم وفنون کے دائرے میں، ادب وصحافت کے دائرے میں، قانون وانتظام کے دائرے میں اور معیشت ومعاشرت کے دائرے میں جاری رہے گا۔ اسے امراء اور غرباء میں، شہریوں اور دیہاتیوں میں، مردوں اور عورتوں میں، ایک زبان اور دوسری زبان میں۔ ایک قسم کے ذرائع سے اور دوسری قسم کے وسائل سے لے کے چلنا لازم ہے۔

یہ کام کسی خاص طرز کے حالات سے مشروط نہیں، کچھ امتیازی قسم کے وسائل پر موقوف نہیں، اس کا کوئی خاص دور یا موسم نہیں، اس میں کوئی تعطل یا تعطیل نہیں، یہ ڈیوٹی عمر بھر کی ڈیوٹی ہے۔ سال بھر کے بارہ مہینوں، ہفتے کے سات دنوں اور ہر دن کے چوبیس گھنٹوں میں اس کو جاری رہنا ہے۔

میدانِ کار نہیں ملتا

بعض حضرات اس لیے سکڑے بیٹھے رہتے ہیں کہ انھیں میدانِ کار نہیں ملتا۔ حالاں کہ اوّلین میدانِ کار تو آدمی کا خود اپنا نفس ہے، جو اپنی خواہشوں اور مفاد کی سلطنت کے بڑے حصے کو دعوتِ دین کی زد سے بچا کے رکھنے کے لیے ہر قسم کے حیلوں اور دلائل کے اسلحے سے لڑتا ہے اور ایک بار اگر مفتوح ہوتا بھی ہے تو ازسرِ نو کسی گوشے سے اپنی لڑائی شروع کر دیتا ہے۔ اس کے متعلق تو حضورؐ نے فرمایا کہ اصل پہلوان وہ ہے جس نے اپنے نفس کو پچھاڑ لیا، نیز تربیتِ نفس کی لمبی مہم کو ''جہادِ اکبر'' سے تعبیر کیا۔ نفس کی سرکش اور دوسیسہ کار قوتوں کی نقل وحرکت کا جائزہ لینے کے لیے گھات لگا کر بیٹھنا اور عمر بھر پہرہ دینا کوئی کھیل نہیں ہے۔ میرے سامنے روایتی تصوف کا فلسفہ نہیں، رسولِ خداؐ کا سکھایا ہوا حقیقی (تزکیہ) ہے، جس کے لیے آپ کو خدا نے مزکی بنایا۔ ع

یک دم منافقانہ نشیں درکمینِ خویش

دوسرا قریب ترین میدانِ کار کسی شاہدِ حق اور نقیبِ دین کا اپنا گھر ہے۔ معاشرے کی ایک تنظیمی اکائی جو اگر نیکی کا سرچشمہ بن جائے تو سینکڑوں کے لیے باعثِ فیض، برائی کا اڈہ بن جائے تو ہزاروں کے لیے وجہ وبال اور لامقصدیت کا آئینہ دار ہو تو بے شمار لوگوں کے لیے

ذریعۂ جمود و تضاد! ذرا غور سے جائزہ لیجیے کہ اس میں آپ نے دعوت اسلامی کا کام پچھلے کئی سالوں میں کہاں تک کیا ہے اور کیا اس کے ثمرات اطمینان بخش ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کی غفلتوں کی وجہ سے آپ کے گھر ہی میں اپوزیشن کا مضبوط محاذ کھل گیا ہو؟ دعوت کے لحاظ سے معیاری گھر صرف وہ گھر ہیں جن کے مرد مردوں میں، عورتیں عورتوں میں، لڑکے لڑکوں میں، لڑکیاں لڑکیوں میں کام کررہی ہوں۔ اور ہر فرد یہ محسوس کرے کہ دعوتِ حق کی مہم میں اسے پورے گھر کا تعاون حاصل ہے۔

پھر آگے چلیں تو آپ کا اڑوس پڑوس ہے، آپ کے اقرباء ہیں۔ آپ کے دفتری اور کاروباری ساتھی ہیں، آپ بازاروں میں، ہوٹلوں میں، بسوں میں جگہ جگہ لوگوں سے ملتے ہیں اور اُن سے باتیں کرتے ہیں۔ کوشش یہ کیجیے کہ جہاں بھی خوب صورتی سے ممکن ہو، اصل بات کے لیے راستہ نکالا جائے۔ کسی کو گھر پر مدعو کیجیے، کسی کے گھر خود جائیے، اضطراب کے مارے ہوئے انسانوں کو سمجھائیے کہ راہِ نجات صرف خدا پرستی میں ہے، مسائل سے پس کر مایوس ہونے والوں کو توجہ دلائیے کہ خدا کا دین سب سے بڑا سرمایۂ امید اور ذریعۂ حل مسائل ہے۔ خود پرستی کے مارے ہوئے ملول افراد کو اس نسخۂ شفا کا پتہ دیجیے کہ دوسروں کی خدمت کر کے ہی آدمی مسرت حاصل کرسکتا ہے اور دوسروں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انہیں سچائی کا راستہ دکھایا جائے۔

انقلاب کی ایک اہم شرط

کوئی تبدیلی، چاہے تعمیری انقلاب کے راستے سے آئے یا پابندِ حدود انتخاب کے راستے سے اس کی شرط لازم یہ ہے کہ اُس تبدیلی کے آرزومند اور اس کے ذریعے برپا ہونے والے نظام کے شیدائی کسی معاشرے میں مناسب تعداد میں ہوں، یعنی ایک طرف تبدیلی کی لہروں کو انضباط میں رکھنے کے لیے اور دوسری طرف نظامِ مطلوب کو چلانے کے لیے لازمی قوت ہر طرف سے سمٹ آئی ہو۔ ورنہ جس نظام یا تبدیلی کی دعوت ہی کماحقہٗ نہ پھیلائی جاسکی ہو اُس کے نعرے سے اتفاقی طور پر انقلاب برپا ہو جائے تو اس انقلاب کی باگ ڈور کوئی اور سنبھالے گا۔ اسی طرح اگر انتخاب واقع ہو تو ووٹروں ہی کی اتنی تعداد نہ ہوگی جو ایمان اور فکر وشعور کی روشنی میں صحیح اور موزوں افرادِ کار کو نمائندگی پر لاسکیں۔ انتخابی سیاست کا وقتی ریلا کچھ تھوڑے سے جذباتی

عناصر کو ساتھ بہا لیتا ہے، لیکن اصل دارو مدار مضبوط ذہن و کردار کے ٹھوس افراد کی قوت پر ہوتا ہے۔ پس سیاست کی جنگ جیتنے کے لیے بھی شدید ضرورت توسیعِ دعوت کی ہے۔ علاوہ ازیں اگر بیورو کریسی کی مشینری پر کم سے کم اہم افراد کی ایک مؤثر تعداد شامل نہ ہو تو گاڑی صحیح رُخ پر نہیں چل سکتی۔ کچھ لوگوں کو پہلے سے بھرتی ہونا چاہیے، کچھ سابق افسروں کے ذہن و کردار کو بدلنا چاہیے اور کچھ نئے لوگ ضروری مناصب پر مامور کرنے چاہئیں تاکہ وہ مزاحمتی عناصر کو سر نہ اٹھانے دیں۔

انتظار وجہ تضیعِ اوقات

اگر کچھ اچھے لوگ اس انتظار میں بیٹھے رہیں کہ جب سیاسی پابندیاں ختم ہوں گی تو اُس وقت جلسوں اور تقریروں سے کام کریں گے، تو یہ انتظار وقت کو ضائع کرنے کے ہم معنی ہے۔ موجودہ غیر سیاسی دور کوئی پسندیدہ حالت نہیں ہے،(۱) مگر جلسے جلوس کے سہارے قائم رہنے والے گروہوں کے مقابلے میں شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کے لیے ایک وجہ سے یہ ایک قیمتی مہلت بھی ہے۔ اِس وقت فضا ہر قسم کے ہنگاموں سے خالی ہے، کوئی شور شرابا نہیں، ذہنوں میں طوفانی مدّ و جزر نہیں، انفرادی دعوت کے لیے میدان چوپٹ کھلا ہے۔ اگر اس مہلت میں صحیح کام ہوا ہو تو اس کے گزرنے کے بعد روشنی ہونے پر آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ آپ کی قوت پہلے سے دس گنا بڑھ چکی ہے۔ لیکن اگر کما حقہٗ کام نہ ہوسکا تو آپ اپنے کو اسی جگہ پائیں گے جہاں اس دور سے پہلے تھے۔ پھر اگر جمہوریت کی بند سڑک کھل گئی اور انتخابات کی منادی ہو بھی گئی تو آپ کیا نئی توقعات کریں گے۔ الٹا اندیشہ یہ ہے کہ کسل مندی کے خوگر ہو کر ہمارے دوست ''چہ کنم'' کے چکر میں پڑے رہیں۔

مجھے اندازہ ہے کہ دعوت کا کام پوری طرح معطل نہیں ہوا ہوگا اور جتنا کچھ ہوا ہے اُس کی برکات سامنے آجائیں گی، مگر میں یہی اندیشہ کرتا ہوں کہ جتنا اور کچھ ہونا چاہیے، وہ بہ مشکل ہی ہوسکا ہوگا۔(۲)

---

(۱) اشارہ ہے ''آخری'' مارشل لا کی طرف۔

(۲) بدقسمتی سے بعد میں میرا اندیشہ تقریباً درست نکلا، بلکہ کارِ دعوت کی عادت کو نقصان پہنچا۔

اندریں صورت یہی کہا جاسکتا ہے کہ پہلے اگر کوئی کسر رہی ہو، تو اب جو مہلت باقی ہے، اس میں پوری قوت سے ہر فرد اپنی بساط کے مطابق تلافی کرے۔

بعض دوست یہ اشکال پیش کرتے ہیں کہ وہ اگر کسی سے ملتے ہیں اور بات کرتے ہیں تو اصلی بات دوسروں کی طرف سے چھڑتی ہی حکومت اور ملکی مسائل کی ہے۔ گرانی کے نوحے، جرائم کی فریادیں، فحاشی کا ردِّعمل اور اسی طرح کی چیزیں زیرِ بحث آتی ہیں۔ دعوت الی اللہ کا تو راستہ کم ہی ملتا ہے۔

بات میں سے بات

ایسے موقع کے لیے دو طریقے ہیں: ایک یہ کہ آپ دوسروں کو اپنی ساری باتیں کھل کر کرنے دیں اور جب اندازہ ہو کہ اُن کے اندر کا دھواں بیش تر نکل چکا ہے تو پھر بات میں سے بات نکالتے ہوئے گفتگو کرنے والوں کو اس طرف توجہ دلائیں کہ معاشرے کی ساری خرابیوں کی جڑ کیا ہے اور افراد کے کردار کیوں مختل ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ شروع ہی میں یا آگے چل کر کسی بھی موقع پر ہم نشیں کو یوں توجہ دلائی جائے کہ بھئی سیاسی اختلافات اور جھمیلے ایک طرف، ہماری ذاتی اور گھریلو زندگیوں میں سے بھی سکھ چین غائب ہے، ہم انسان ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے درندے بن گئے ہیں، ہم خدا پرست مسلمان ہوتے ہوئے بھی خدا کے بندوں کے لیے باعثِ آزار ہیں، آپس میں لوٹ کھسوٹ مچی ہوئی ہے، خیانت کا زور ہے، جبر کا دور دورہ ہے، خواہشوں کے جال میں ہم سب جکڑے ہوئے ہیں، آخر یہ حالات کیوں ہیں؟ کہاں سے یہ روگ شروع ہوتا ہے؟ یوں دل سوزی سے دعوت الی اللہ کا راستہ نکالا جاسکتا ہے۔

دعوت الی اللہ کی وسعتیں

دعوت الیٰ اللہ کے یہ معنی نہیں کہ ہمیں کچھ عقیدوں اور اخلاقی باتوں کی تلقین کر کے قصہ ختم کر دینا ہے۔ جب خدا پرستی اور خدا کے دین کی ضرورت اور برکت واضح ہو جائے تو اگلا سبق یہ ہے کہ خدا ساری زندگی کا خدا اور اسلام ہر شعبۂ حیات کے لیے واحد دین ہے۔ سیاست اور معیشت کے دائروں میں بھی ہمارا دین صرف اسلام ہے، کوئی دوسرا نہیں! پھر آپ اسلامی ریاست

اور خدا پرست قیادت کا تصور بھی دلا سکتے ہیں اور تبدیلئ قیادت کی دعوت بھی دے سکتے ہیں۔

مگر یہ سارا کچھ کسی ایک ہی ملاقات یا ایک ہی نشست میں ہو جانے والا نہیں۔ جن لوگوں پر کام کیا جائے۔ اُن سے بار بار ملا جائے اور دعوت کا ایک ایک سبق آہستہ آہستہ ودیعت کیا جائے۔ ہاں یہ ملحوظ رہے کہ مخاطب کی طرف سے محض گنبد کی صدا کی طرح ''ہاں ہوں'' ہی نہ ہوتی رہے بلکہ اس کی شخصیت کو آپ متحرک کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو آگے چلیں۔ کوئی آدمی اگر بالکل ٹھس ہی ملے اسے چھوڑ دیں، جس کسی کے شعور میں حرکت آئے، اسے قدم بہ قدم آگے لے چلیں۔

دورانِ سفر کسی شخص سے امید افزا بات ہو تو اُس کا پتہ لے لیں، اُس سے بعد میں خط و کتابت کریں، ضرورت پڑے تو کبھی اُس کے مسکن تک جا پہنچیں۔ کبھی اُسے اپنے ہاں مدعو کریں۔ کبھی کوئی پڑھنے کی چیز اُسے مطالعہ کے لیے بھیج دیں، کبھی تحفہ کے طور پر کسی درس یا تقریر کا کیسٹ اُسے پیش کر دیں۔

آدمی جب کچھ کرنے پر آتا ہے تو نہ جانے کیا کیا کچھ کر سکتا ہے!

ڈگر سے ہٹ کر

بعض دوستوں نے مجھ سے اِکّا دُکّا موقعوں پر یہ سوال کیا کہ ہم اپنے دفتر میں دس پندرہ سال سے موجود ہیں۔ اپنی دانست میں اخلاقی طور پر ہم نے کچھ نہ کچھ بہتر رویہ ہی اختیار کیے رکھا ہے۔ کبھی کبھار کوئی پڑھنے کی چیز بھی بعض دوستوں کو دی ہے، زبانی بات بھی کی ہے، مگر اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ بے کار ہے۔ رشوت اور خیانت اور کام چوری کے عادیوں کی روش جوں کی توں ہے۔ دفتر کی مصروفیت میں اوّل تو کچھ زیادہ باتیں ہو ہی نہیں سکتیں، ہوں بھی تو سرسری۔ ایک فقرہ ہم نے کہہ دیا، دوسرا فقرہ جواباً دوسرے نے کہہ دیا۔

سوال کرنے والے دوستوں سے میں نے پوچھا کہ کیا کبھی ایسا کوئی تجربہ بھی آپ نے کیا ہے کہ اپنے ساتھیوں میں سے کسی شریف مزاج یا تیز طرار آدمی کو چھانٹ کر آپ یہ دعوت دیں کہ عرصے سے میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کبھی میرے ہاں چلیں اور کھانا کھائیں یا چائے پئیں، مل بیٹھیں گے اور کچھ کہیں سنیں گے۔ دفتری رابطے کے پھیکے پن سے اکتا کر میں یہ خواہش کر رہا ہوں۔

یا بہ صورتِ دیگر یوں بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کسی دفتری ساتھی سے یہ درخواست کریں کہ دوست! کسی دن اجازت دو تو شام تمہارے ساتھ گزارنے کے لیے گھر پر آؤں۔

یہ ہرگز ضروری نہیں کہ پہلی ہی ملاقات میں سب کچھ آر پار ہو جائے۔ ہوسکتا ہے کہ دو ایک ملاقاتیں محض بے تکلفی اور ربط باہم پیدا کرنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں گزر جائیں۔ پھر کبھی دوسری متفرق باتوں کے ساتھ آپ اپنی دعوت کی ابتدائی بات بھی کریں۔ آگے چل کر مزید پیش قدمی کریں۔ بے تکلفی ہو جائے تو کبھی کسی حلقۂ درس یا کسی ادبی نشست یا مجلس تقریر میں ساتھ لے جائیں، نیز کبھی اپنے چند دوسرے دوستوں کے ساتھ چائے کی مجلس یا پکنک یا شب بے داری کا انتظام کر کے اُس میں نئے دوستوں کو شریک کریں۔

اپنے دفتر یا کارخانے یا کسی اور ادارے کے ساتھیوں پر نظر رکھیں، اگر کسی کے ہاں شادی یا مرگ کا واقعہ ہو تو اس میں حصہ لیں، کسی کے ہاں بیماری کا دور ہو تو بیمار پُرسی کے لیے جائیں، کسی کو کوئی خاص ایسا مسئلہ درپیش ہو جس کے حل کرانے میں آپ مدد دے سکتے ہوں تو ضرور دیں۔ اچھے انسانی رابطے اور خدمات دعوت کا راستہ بنانے میں مؤثر ہیں۔

کاش کہ اس قسم کے بہت سے تجربات ہمارے پاس ہوتے اور اُن کی رپورٹیں موجود ہوتیں، فائل ہوتے اور ان کے بل پر تکنیکی راہیں واضح ہو جاتیں اور ہر خادمِ تحریک اسلامی اُن کا مطالعہ کر کے اپنی مشکلات کو حل کر سکتا۔ سابق نقوشِ قدم جو کچھ ہیں، کم سے کم اُن کا ریکارڈ مرتب ہو جائے جو بیرونی اشاعت کے لیے نہ ہو صرف تربیت کاروں کے ذریعے اس سے حاصل شدہ نتائج پیش کیے جاتے رہیں تو یہ بھی بڑا کام ہے، ورنہ کام کرنے والوں کو اس عزم سے کام کرنا چاہیے کہ وہ خود تازہ تر نقوشِ راہ بنائیں گے اور اپنے نو بہ نو تجربات کا ریکارڈ مرتب کریں گے۔[۱]

---

(۱) ہم تو آج تک وہ کام بھی نہ کر سکے جس سے ہر مقامی شاخ (شہری محلّہ یا کوئی دیہہ) اپنے دائرے کی آبادی کی ایسی لسٹیں تیار کر لیتی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کمیونسٹ، قادیانی، ملحدین، مغرب پرست، لادینیت پسند، مخالف اسلام کون کون لوگ ہیں۔ اور اسلامی رجحان رکھنے والے کون کون؟ فرقوں کے لحاظ سے بھی معلومات ہونی چاہئیں۔ سرکاری افسروں اور ملازمین کا ریکارڈ بھی موجود ہو۔ اعلیٰ تعلیم پانے والے نوجوانوں کا بھی۔ آزادیٔ خواتین یا خاندانی منصوبہ بندی کی تحریکات کے اثرات پر بھی نظر ہونی چاہیے۔

پُرخطر ماحول اور دعوت

بنیادی اصولی دعوت پر اتنا زور دینے کا مطلب یہ نہیں کہ اگر ہمارے اِردگرد آگ لگ جائے، تو ہم اُسے بجھانے کے لیے کچھ نہ کریں اور آگ لگانے والوں یا بھڑکانے والوں کو بھی دعوت ہی دیتے رہیں۔ نہیں! ہم ایک طرف آتش افروزوں کے ہاتھ پکڑنے اور اُن کو بے بس کرنے کی کوشش کریں گے اور دوسری طرف آگ بجھانے کے لیے پورا زور لگائیں گے اور دوسروں کو پکاریں گے۔

بسا اوقات کسی ملک یا قوم کے عین وجود کے لیے اُس کے اساسی نظریے کے لیے، یا اُس کی آزادی کے لیے یا اُس کے اندر صحیح کام کرنے کی کھلی فضا کے لیے خطرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں بہت سے ملک ایسے ہیں جن کے لیے خود اُن کی حکومت ہی بہت بڑا سامانِ ضرر بن جاتی ہے، کہیں اپوزیشن کے مورچے پر کوئی خطرناک عنصر قابض ہو جاتا ہے، کہیں بیرونی طاقتیں اپنے زرخرید ایجنٹوں کو تخریبی عمل کے لیے مامور کر دیتی ہیں۔ ان ساری صورتوں میں جدھر جدھر کوئی خطرہ نمودار ہو اُس کی زد سے قوم کو بچانے کی سعی کرنا ہر داعیٔ اسلام کا فرض ہے، جب کہ قوم اور ملک سے اسلامی مقاصد کی تکمیل کی اُمیدیں وابستہ ہوں۔

آج ہم جس قسم کے حالات سے دوچار ہیں اس میں پاکستان اور اس میں بسنے والی امتِ اسلامیہ بیک وقت کئی اطراف سے خطروں کی زد میں ہے۔ ایسے حالات میں داعیانِ اسلام پر جو فرض عائد ہوتا ہے، انھیں اپنی نگاہِ بصیرت سے اُسے پہچاننا چاہیے۔ جہاں بیرونی خطرات سر پر لٹکے ہوئے ہوں وہاں اندر کی مصیبتوں پر صبر کر کے توجہ اُدھر کرنی پڑتی ہے۔ بعدہٗ کوئی راستہ ملے تو حکومت ہو یا اپوزیشن کا ذہن رکھنے والے عناصر یا عوام، اُن میں سے ہر ایک

کے لیے جذبۂ خیر خواہی رکھتے ہوئے اُن کی اصلاح کی سعی کرنی چاہیے اور کوئی بھی جانب سے کوئی غلط چیز نمودار ہو اُس پر گرفت کرنی چاہیے۔

ملک وملّت کی بڑی آزمائش

کسی ملک کے لیے بڑی آزمائش ہوتی ہے، اگر اُس کی حکومت کا رُخ درست نہ ہو، لیکن اس سے بھی بڑی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ اس کی اپوزیشن کے عناصر محض منفی سوچ بچار رکھتے ہوں لیکن مثبت حیثیت سے نہ اُن کے پاس صحیح نظریہ ہو، نہ کردار، نہ مردانِ کار۔ بلکہ وہ غلط سے غلط سلوگن اور ہتھکنڈے اختیار کرسکتے ہوں اور بُرے سے بُرے عناصر کے ساتھ تعاون پر تیار ہوں۔ اور اس سے بھی زیادہ بڑی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ کوئی قوم خود اپنے بھلے بُرے سے بے گانہ ہوجائے اور اُس کے افراد محض ذاتی زندگی بنانے اور کمائیاں سمیٹنے اور تفریحات سے لطف اٹھانے میں لگ جائیں۔

یہ کہنے کی جراُت کیسے کی جائے کہ ہمیں کون سی آزمائش اور کون کون سی بدقسمتی درپیش ہے، لیکن ایک بات کہی جاسکتی ہے کہ کچھ نہ کچھ مشکل امتحانی لمحات سے ہم گزر رہے ہیں اور کئی قوتیں ہمارے وجود کو مٹانے اور مسخ کرنے اور اُسے دوسروں کی غلامی میں دینے کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔

ایسے حالات میں آپ سیاسی دائرے کو چھوڑیے اور جلسوں کو بھول جایئے، سیدھے اپنے عوام اور شہریوں تک پہنچنے اور اُن سے انفرادی سطح پر دین، ایمان، آزادی اور سالمیتِ وطن کی بات کیجیے۔ لوگوں کے ذہنوں کو جمود اور انتشار کی حالت سے نکال کر دینِ برحق کے تقاضوں پر مرتکز کیجیے اور پیش آمدہ خطرات کی مزاحمت کے لیے انھیں تیار کیجیے۔(۱)

مطلوبہ قوت

ضرورت اس بات کی ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو، آپ معاشرے کے کارآمد عنصر کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اٹھا کھڑا کریں جو دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں محض آپ کی تائید کرنے والے اور

---

(۱) جس وقت یہ عبارت لکھی گئی تھی، کاش کہ اس وقت صحیح خطوط پر کام کیا جاتا، شاید ایسا کام بعد میں اپنے ہی گروہوں کے ہاتھوں ہونے والے آتشیں وخونیں تخریبی ہنگاموں سے کچھ بچاؤ کا ذریعہ ہوجاتا۔

نعرے لگانے والے ہی نہ ہوں بلکہ وہ اس دعوت کو اپنی چیز سمجھیں۔ انھیں براہِ راست اس کا فہم حاصل ہونا چاہیے۔ اور اُن کے دلوں میں اس کی قدر ہونی چاہیے، اُن کے اندر اس کے لیے محنت اور قربانی کا جذبہ ہونا چاہیے۔ وہ نظامِ اسلام کے برپا ہونے کے لیے بے چین جذبات رکھتے ہوں۔ اس مہم میں ہمہ تن مصروف ہوں۔ ناواقف لوگوں کے شکوک وشبہات کے جواب دے سکیں۔ عام لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرسکیں۔ مایوسانہ رجحانات سے لوگوں کو نکال سکیں۔ مخالفین کی مخالفتوں کا مقابلہ کرسکیں اور شریر لوگوں کی شرارتوں کو ناکام کرسکیں۔ آپ انھیں کسی کام کے لیے پکاریں تو وہ چاروں طرف سے لبّیک کہتے ہوئے لپکیں۔ دین اور خادمانِ دین کے معاندین اگر ارادۂ بد سے کوئی حرکت کریں تو وہ ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں۔ نظامِ حق کا قیام عمل میں آئے تو اپنے اندر سے اُسے چلانے کے لیے باصلاحیت افراد فراہم کریں۔ اور اُن کی بقیہ تعداد اس کا خیر مقدم کرنے والی اور خوش دلی سے اسے اپنے اوپر نافذ کرنے اور اُسے آگے تک پھیلانے والی ہو۔

پھر دعوتِ اسلامی کی مسلسل چلتی رہنے والی مہم کے نتیجے میں ہر شعبۂ زندگی میں مردانِ کار اُبھر آئیں، دفتروں میں، عدالتوں میں، وکلاء میں، اساتذہ میں، طلبہ میں، خواتین میں، تاجروں میں، مزدوروں میں، دکان داروں میں، صحافیوں میں، ادیبوں میں، ذرائع ابلاغ کے حلقوں میں، اسمبلیوں میں، بلدیاتی اداروں میں، چھاؤنیوں میں، تھانوں میں، دیگر پرائیویٹ فرموں اور سرکاری محکموں میں خدا پرست، دیانت دار اور خادمِ خلق لوگوں کی تعداد تیزی سے بڑھے۔ یہاں تک کہ اگر اکثریت نہ بھی ہو تو کم سے کم ہر دائرے میں ہر سطح پر ہر صلاحیت کی ایک مؤثر وفعّال اقلیت متحرک ہو جائے۔

جس لمحے تبدیلیٔ نظام کی یہ شرط پوری کردی جائے گی۔ بلا تاخیر غلبۂ اسلام کا دور شروع ہو جائے گا۔ چاہے انقلابی راستے سے ہو، خواہ انتخابی راستے سے۔

زیرِ سطح کام

تو جن محبانِ دین کو کام کرنا ہو، جن کو حقیقت میں اپنے اندر کوئی بے چین جذبہ اسلامی انقلاب کے لیے محسوس ہوتا ہو اور جنھیں ناخوشگوار حالات کے موجودہ گھیرے کو توڑ کر بچ نکلنے اور

تاریخ کے قلعے پر اسلام کا جھنڈا اگاڑ دینے کی خواہش ہو، وہ مندرجہ بالا شرائط کو پورا کرنے کے لیے زور لگائیں۔ ورنہ سطح کے اُوپر اُوپر نعرے لگانے اور امام خمینی کا مثنٰی بننے کے سارے خواب پریشان ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر سطح کے نیچے آپ کام نہ کریں گے تو کوئی دوسری قوت اپنا تانا بانا پھیلا دے گی۔

خیال رہے کہ ہماری اس سرزمین میں دیمک بہت ہے اور سیم بھی ہے۔ چوہے بھی سرنگیں کھودتے رہتے ہیں۔ آپ اگر اُوپر کسی عمارت کے اٹھانے کا نقشہ بنائیں تو اس بات کی فکر پہلے کر لیں کہ سطح کے نیچے ایسی مؤثر قوت پیدا ہو جائے جو سیم اور دیمک اور چوہوں پر قابو پا سکے۔

کچھ ایسی مساعی جن کا محض یہ اثر ہو کہ ہمیں تاریک فضا میں اپنا وجود محسوس ہوتا رہے، یہ بھی بڑی اچھی بات ہے، مگر اصل فیصلہ کُن امر یہ ہے کہ آپ کا وجود پھیلتا ہے یا سُکڑتا ہے، یا جامد بن کے رہ جاتا ہے۔ اسے سکڑنے نہ دیجیے، اسے جامد بھی نہ ہونے دیجیے، بلکہ اس میں پھیلاؤ پیدا کرنے کی تدابیر کیجیے۔ اس کا حجم بھی بڑھے اور وزن بھی اور قدر و قیمت بھی۔

ایسا ارادہ ہو تو سخت محنت و مشقت کا کام ہے۔ فیصلہ کر لیجیے کہ آپ کو محنت و مشقت سے یہ مہم چلانی ہے۔ نہیں چلائیں گے تو آپ کا پہاڑ جیسا وجود بھی گھلتے گھلتے رائی بن کے رہ جائے گا۔

اور ایسی مہمات چلانے کے لیے کوئی ایک بنی بنائی ڈگر ہر قسم کے حالات میں کام نہیں دیتی بلکہ بنی بنائی ڈگر پر چلتے چلتے بسا اوقات ذہنی جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈگر کو چھوڑیے اور جمود کو توڑیے۔

اہلِ دعوت اور مخالفانہ حالات

غلبۂ اسلام اور تحفظِ پاکستان کے لیے کام کرتے ہوئے گردو پیش کے حالات کا مدّ وجزر دیکھ کر ہم آپ سب کو بڑا اضطراب سا ہوتا ہے اور یہ اضطراب عین محبتِ دین اور خیر خواہیٔ ملک ووطن کا تقاضا ہے۔ مگر اضطراب ہونے کے معنی لازماً مایوسی ہی نہیں ہوا کرتے، یہی کیفیت کسی جماعت یا تحریک کی گاڑی کو آگے بڑھانے کے لیے زوردار اسٹیم بھی ثابت ہوتی ہے۔ اگر دلوں میں اضطراب کی کوئی لہر نہ اٹھے تو پھر جمود وقنوط کی برف گرنے لگتی ہے۔

ایسے ہی لمحہ ہائے اضطراب میں قرآن کریم کی یہ پکار کسی بھی زمانے کے داعیانِ حق کو سنائی دیتی ہے:

وَ لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٩﴾

(آل عمران: ۱۳۹)

"اور نہ ڈھیلے پڑو، نہ دل گیر ہو جاؤ، اور تم ہی (آخرکار) غالب آؤ گے ـــ بشرطے کہ تم ایمان والے ہو!"

اور پھر یوں محسوس ہوتا ہے کہ خدا کے فرشتے ہر طرف سے آ آ کر کان میں کہہ رہے ہیں کہ نہ خوف رکھو، نہ ملال۔ (اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا۔ حٰمٓ السجدہ: ۳۰)

پچھلا تجربہ

بات نہ من گھڑت نفسیاتِ تسکین کی ہے، نہ قصہ کسی کشف کا ـــ معاملہ تجربے کا ہے۔ پچھلی تہائی صدی میں اقامتِ دین کے لیے جو تھوڑا بہت کام تحریکِ اسلامی کے کارکنوں نے کیا،

ہمیشہ سنگین حالات کے ہوتے ہوئے کیا ہے۔ اور جو کچھ کیا ہے وہ بے نتیجے نہیں رہا، بلکہ نتیجہ خدا نے ہمیشہ مساعی سے بڑھ کر دیا۔ اگر ہم حالات کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے خوف و حزن کا شکار ہو کر ساحلوں پر بیٹھے اونگھتے رہتے، یا اپنے آپ کو ہر چڑھتی موج کے حوالے کر کے بہنے لگتے یا اضطرابات کے گردابوں میں ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو ڈبو دیتے تو شاید آج یہاں خدا کا نام لینا اور اقامتِ دین کا پرچم اٹھانا ممکن نہ رہتا۔

آج کا مخلص وقائع نگار، یا کل کا دیانت دار مورّخ پاکستان کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا کہ اس پر پونے بتیس(۱) برس کے لمبے دور میں، طرح طرح کے ایمان کش اور اخلاق سوز احوال سے گزرتے ہوئے اور محلاتی سازشوں اور آمرانہ دور کی فتنہ سامانیوں کے باوجود اگر کسی قوت نے اسلامی نظریہ و نصب العین کو تسلسل سے زندہ اور توانا رکھا تو بلاشبہ یہ سعادت تحریکِ اسلامی کے حصے میں ہے۔

ہدیۂ تبریک

پس ہزار ہدیۂ تبریک (طوبیٰ للغربا)، خدا کے دین کے ہر اُس سپاہی کے لیے جس نے مخالفتوں کے ماحول میں بار بار اجنبی بن کر کُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ؗ(۲) کا تقاضا پورا کیا، جس نے گالیاں کھا کر، جھوٹے الزام سن کر، تضحیک کا نشانہ بن کر، کفر کے فتووں کے وار سہ کر، تفرقہ باز مولویوں کے فتنوں کا مقابلہ کر کے اور سرکاری عتاب کے تازیانے کھا کر اپنا وہ بڑا اجتماعی فرض ادا کیا، جس کا عہد کلمۂ اسلام پڑھنے والا ہر شخص خدا سے استوار کرتا ہے۔ ایسے لوگ شہر شہر، گاؤں گاؤں سے ایک ایک دو دو کر کے (مَثْنٰى وَفُرَادٰى) اٹھنے والے بے مزد سپاہی، جب وسائل کے ساتھ بھی اور بے سر و سامانی کے عالم میں بھی (خِفَافًا وَّثِقَالًا) نکل کھڑے ہوئے تو اس چھوٹی سی قوت کے ہاتھوں تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل گیا۔ ان کی منظّم کوششوں سے کلمۃ اللہ کی گونج بڑھتی ہی گئی۔

اگر دعوتِ حق کے علم بردار اپنے آپ کو اس کیفیت میں پاتے ہیں تو آج کے حالات

---

(۱) یہ تحریر مئی ۱۹۷۹ء میں لکھی گئی۔

(۲) خدا کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے شاہد بن کر اٹھو۔ (المائدۃ:۸)

یہ محض عدالتی دائرے سے متعلق حکم ہی نہیں، بلکہ خدا کے نظامِ رحمت و عدل کی دعوت دینا بھی اس میں شامل ہے۔

کی پیچیدگی کوئی ایسی مردافگن نہیں ہے کہ سپاہیانِ حق جی چھوڑ کے، کمریں کھول دیں اور قلزمِ تاریخ کے ساحل پر اُونگھتے ہوئے موجوں اور مختلف پیراکوں کی کش مکش کا تماشا کرتے رہیں۔ اگر ہمیں خدا نے پہلے بارہا خوف ناک طوفانوں کا منہ پھیر دینے کی توفیق دی ہے تو آج بھی یہی ہوگا، لیکن اگر اندر کی ایمانی کیفیت کمزور پڑ گئی تو پھر باہر کے سارے مسائل کو لپیٹ کر رکھ دیجیے، اور گھر کے اندر کی خبر لیجیے۔

وسیع محاذِ مخالفت

حالات کی ساری پیچیدگیاں ـــــ بین الاقوامی بھی، اور ملکی بھی، نیز حکومتی دائرے کی بھی اور سیاسی و مذہبی گروہوں کی پیدا کردہ بھی ـــــ ہمارے سامنے ہیں۔

ہمیں خوب معلوم ہے کہ چاروں طرف سے جماعتِ اسلامی کے خلاف الزام و دشنام کی بوچھاڑ ہے۔ اس حملے میں اسلام دشمن قوتوں کے ساتھ ساتھ محاذ کے ایک سرے پر اگر طارق علی اور منہاج برنا جیسے لوگ کھڑے ہیں تو دوسرے پر نورانی ہستیاں اور پیران پارسا جلوہ گر ہیں۔ ایک مقام اگر "طلوعیوں" کا ہے تو دوسرا "ربوبیوں" کا۔ ایک طرف اگر بسم اللہ کے گنبد والے ہیں تو دوسری طرف سیکولر اسلام والے۔ ایک قلعہ اگر مسلم لیگی اقتدار کا ہے تو دوسرا کمیونسٹ دانشوری کا۔

اور یہ پورا محاذ زبانوں اور قلموں سے طرح طرح کی فضول باتیں سامنے لا رہا ہے اور غیظ و حسد میں پھُنکتے ہوئے عناصر موجودہ حکومت کے ساتھ ساتھ اسلامی قوانین اور جماعت اسلامی کے خلاف اپنا اپنا بخار نکال رہے ہیں۔ مگر جتنا بخار نکلتا ہے اتنا اور زیادہ چڑھتا ہے۔

ایک دل چسپ الزام

ایک دل چسپ صورتِ عتاب یہ ہے کہ موجودہ حکومت اور سابقہ کابینہ کے دور سے متعلق جس چیز پر بھی اعتراض ہو، اس کی ذمہ داری جماعت اسلامی پر ڈالی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے یہ نکتہ بھی اٹھایا کہ "صاحب" کو پھانسی جماعتِ اسلامی نے دلوائی۔ جرم، گواہ، عدالت، وکالت کا سارا کھیل تو گویا بس یوں ہی تماشا تھا اور صدرِ مملکت کی صدارت بھی محض

دکھانے کی چیز تھی، ورنہ ججوں اور صدر کے قلم ہاتھ میں لے کر ہر نوٹ اور فیصلہ تو جماعتِ اسلامی کے اصحاب ہی لکھتے تھے۔ کوتاہی صرف یہ رہ گئی ہے کہ بارود کے دو چار حادثوں اور ریلوے اور ٹریفک کے متعدد حادثوں کی ذمہ داری جماعت پر ڈالنے میں الزام تراش حضرات کے دروغ باف دماغوں نے ساتھ نہیں دیا۔(۱)

اس بدخبری کا اچھا پہلو یہ ہے کہ چوطرفہ حملہ آوروں کی مبارک توجہات کا ارتکاز یہ بتاتا ہے کہ مقابلے کے قابل اصل قوت جماعتِ اسلامی ہی کی ہے۔ باقی تو ''ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے ـــــ'' معاملہ برابر کا ہے۔ کیا رفقاء اس بشارت کو سمجھ سکیں گے؟ آخر اسی کی تو قیمت ادا کر رہے ہیں۔

جماعت اور وزارتیں

بے گانوں اور یگانوں اور دشمنانِ دین اور خادمانِ دین کا متذکرہ مشترکہ محاذ ایک پروپیگنڈہ یہ کرتا ہے کہ جماعتِ اسلامی کے جو لوگ اقتدار پر آ گئے، انھوں نے بدعنوانیاں کیں اور ناجائز فائدے اٹھائے۔ اس ہجو کا مطلع تو وہ بڑے زور سے اٹھاتے ہیں مگر آگے بڑھتے ہوئے اُن کے لئے ٹوٹ جاتی ہے۔ کیوں کہ انھیں مثال پیش کرنے کو کوئی امر واقعی نہیں ملتا۔ پھر اور آگے جا کر تو وہ دل ہی دل میں شدید شرم سار بھی ہونے لگتے ہیں کہ ان لوگوں نے فائدہ تو کیا اٹھانا تھا، اُلٹا جو فوائد ان کو جائز طور پر مل سکتے تھے، اُن کو بھی نہیں سمیٹا، بعض نے تنخواہیں لی ہی نہیں اور بعض نے تنخواہ اور سفری مصارف وغیرہ سب واپس کر دیے۔ نہ کسی نے بیٹوں بھتیجوں کو فائدے پہنچائے، نہ کوٹھیاں یا زمینیں الاٹ کرائیں۔ نہ جماعتی ساتھیوں کو نوکریاں دلوائیں۔ کورے کے کورے واپس آ گئے۔ وہ کہتے ہوں گے کہ ایسے درویشانہ انداز سے وزارتیں کرنی تھیں تو پھر گئے ہی کیوں تھے؟ ہمیں موقع ملتا تو وہ کچھ کر دکھاتے کہ دنیا پکار اٹھتی ـــــ ''مرداں چنیں کنند۔''

---

(۱) ان کا بس چلتا تو جہاز کے اغوا کا چارج شیٹ بھی جماعت پر لگا دیتے۔ گویا سارے ہنگامہ ہائے تخریب اور فتنہ ہائے زیاں کاری ہمارے ہی دم سے ہیں، ورنہ باقی تو سب زہد ہی زہد اور تقویٰ ہی تقویٰ ہے۔ (اگلے دن جہاز اغوا کرنے کا الزام بھی لگ گیا)۔

پاکستان کی تاریخ میں جماعت کے وزراء نے پہلی بار وہ زرّیں مثال قائم کی ہے جس کو نبھانا بعد والوں کے لیے مشکل ہوگا، مگر اس مثال سے سبق کسی نے نہ لیا۔

ہم خدا کے سامنے اس کے لیے شکر ادا کرتے ہیں اور مخالفین کے سامنے جائز حد تک فخر کا اظہار کرتے ہیں۔

انتخابات کے متعلق پروپیگنڈہ

جماعتِ اسلامی کو کمزور کرنے اور نقصان پہنچانے والا ایک پروپیگنڈہ اور بھی ہے جسے اٹھانے میں شر پسند بھی شامل ہیں اور نادانی سے ہمارے محبّ اور خیر خواہ بھی!

وہ یہ ہے کہ جماعت کو بار بار یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ اوّل تو انتخابات ہوں گے ہی نہیں اور ہوئے بھی تو اُن سے مثبت نتائج کا نکلنا ناممکن اور ۱۹۷۰ء کے تجربے کا دہرایا جانا یقینی ہے۔ دینی حلقوں کے ووٹ بٹیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اچھی پارٹیوں کو دو دو چار چار نشستیں مل جائیں گی۔ غالب اکثریت مخالفِ اسلام و پاکستان عناصر ہی کی ہوگی۔ پس انتخابات کو ملتوی[1] کرانا چاہیے اور فوجی اقتدار کو جاری رہنے دینا چاہیے۔

یہ بات اتنی بار دوہرا دوہرا کر اندر سے اور باہر سے کہی گئی ہے کہ یہ ہمارے ذہنوں میں نفوذ کرنے لگی ہے۔ مگر ایسے یاس انگیز نقطۂ نظر کے جڑ پکڑنے کے معنی یہ ہیں کہ اوّل تو ہم آگے بڑھ کر کچھ کام کریں ہی نہیں اور کریں بھی تو اتنی بے دلی سے کہ کوئی بڑا نتیجہ نہ نکلے۔

ذہن سے اس نقطۂ نظر کا سارا بوجھ اُلٹ کر پڑے پھینک دیجیے۔ قطعی طور پر یہ طے کر لیجیے کہ انتخابات ہوں گے اور لازماً ہونے چاہئیں اور اُن کو مؤخر نہ کیا جانا چاہیے۔ حالات خاصے اُلجھے ہوئے ہیں اور اگر فوجی اقتدار دو چار مہینے یا سال بھر تک یا اور آگے جائے گا تو یہ اور الجھ جائیں گے۔ خطرہ پیدا ہو جائے گا کہ اندر کوئی مدّ و جزر شروع نہ ہو جائے۔ دوسرا خطرہ یہ سامنے آتا ہے کہ کہیں حالات ویسے ہی نہ ہو جائیں کہ یحییٰ خاں کی طرح جلد سے جلد ایوانِ حکومت سے بھاگنے کا فیصلہ کر کے اقتدار کسی بھی راہ چلتے کی جھولی میں ڈالنا پڑ جائے۔ کچھ معلوم نہیں کہ وہ کون اور کیسا ہوگا۔

---

(۱) POSTPONE

انتخابات کے متعلق جب آپ دوٹوک فیصلہ کرلیں گے تو آپ کی قوتِ عمل صحیح اور پورا کام کرے گی، آپ قومی اتحاد کو مضبوط اور وسیع تر کرنے کے لیے بھی کوشاں ہوں گے اور اپنی جگہ ووٹروں پر بھی اثر انداز ہوں گے۔

ہماری انتخابی مہم

انتخابی مہم میں جتنی اہمیت کانفرنسوں، جلسوں، کارنرمیٹنگز، گھریلو نشستوں اور پوسٹروں، پمفلٹوں، بیانوں، قراردادوں اور پریس کانفرنسوں کی ہے، اس سے کہیں بڑھ کر اہم اور مؤثر اور نتیجہ خیز کام شہری محلوں اور دیہی بستیوں میں عوام الناس سے انفرادی رابطوں، ملاقاتوں اور گفتگوؤں کا ہے۔

ایک بار اگر جماعتِ اسلامی کے ارکان، کارکنان اور حامیان دل سے اس خوف کو نکال کر کہ ہر شخص بس اُن کی مخالفت کے لیے تلا بیٹھا ہے، پورے عزم سے مناسب منصوبے کے تحت میدان میں آجائیں اور کم سے کم ایک لاکھ آدمی آنے والے پانچ ماہ میں سو سو افراد فی کس کے حساب سے رابطہ کریں تو ایک خاصی تعداد اُن کو ایسی ملے گی جو پہلے سے قومی اتحاد یا جماعتِ اسلامی کو پسند کرنے والی ہے۔ ایک تعداد ایسی ملے گی جو معمولی ردّ وکد کے بعد آپ کی ہمنوائی کے لیے تیار ہو جائے گی۔ پھر ایک تعداد وہ ہوگی جس کو تعصّبات اور جذباتی ہیجانات سے نکالنے میں ذرا محنت کرنی پڑے گی۔ آخر میں کمیونسٹوں، قادیانیوں، کٹر قسم کے پیپلیوں، خالص مفاد پرستوں، خیانت کاروں، تفرقہ باز مولویوں کے لاعلاج فریب زدہ معتقدوں یا غنڈوں اور جرائم پسندوں کی وہ تعداد رہ جائے گی، جسے آخر دم تک بہر حال آپ کی مخالفت کرنی ہے۔

دیہی علاقوں میں اس طرح کا گہرا کام کرنے کے لیے جماعت کے حامی نوجوان طلبہ کو اس سال چھٹیوں کا پورا زمانہ صرف کر دینا چاہیے۔ وہ دو دو چار چار کے وفود بنا کر بھی گشت کریں، وہ اہم بستیوں کے قریب دو دو تین تین روز کے کیمپ بھی لگائیں جہاں سے وہ روزانہ چاروں طرف پھیل کر مسجدوں، گلیوں اور کھیتوں میں سادہ مزاج دیہاتیوں سے بات کریں۔ اُن کے اعتراضات کے کانٹے نکالیں۔ اُن کے مسائل کا تجزیہ کریں۔ اُنھیں ملک وملت کے خلاف کام کرنے والی قوتوں اور اُن کے اسلوبِ کار سے آگاہ کریں۔ نیز اسلام اور پاکستان اور عوام کے

لیے اُن کی خطرناکی کو واضح کریں۔

آدمی جب قریب ہو کر کھلے دل سے بالمشافہ بات کرتا ہے تو آدھی بازی تو اس کے خود جانے ہی سے سر ہو جاتی ہے۔

دیہاتی علاقوں میں کام

دیہاتی علاقوں میں رفاہ و خدمت کے لیے بھی ضروری اقدامات کرنے چاہئیں تا کہ اُن کی برکات اس ایجوکیشن یا تعلیمِ عوام کی مہم میں معاون ہوں۔ اس سلسلے میں اوّلین بنیادی ذمہ داری تو یہ ہے کہ آپ لوگوں کی شادی غمی کے مواقع پر اُن کے ساتھ شریک ہوں اور بیمار پُرسی اور شرکتِ جنائز اور تعزیت کے لیے جائیں۔ آگے کے کام یہ ہیں کہ کہیں مفت ٹیکے لگانے کا انتظام کریں، کہیں علاج معالجے یا سستی دواؤں کی بہم رسانی کی صورت نکالیں، لوگوں کو درخواستیں لکھ کر دینے کا بندوبست کریں، مطالعہ کے لیے دو تین اخبار منگوا کر ایک معمولی سے ریڈنگ روم کی بنا رکھیں۔ سرکاری محکموں اور اداروں (خصوصاً تعلیم، صحت، زراعت، بجلی وغیرہ) سے کام کرانے کے لیے لوگوں کے ساتھ نکلیں، خواتین کے لیے معمولی سلائی کڑھائی کے تربیتی مراکز کھولیں، مردوں اور عورتوں کے لیے قرآن و حدیث کے درس شروع کریں۔ چھوٹے بچوں کو ناظرہ قرآن کریم پڑھانے کے لیے مسجد یا کسی گھر میں انتظام کرائیں، مقامی رفاہی اور ترقیاتی کاموں کے لیے لوگوں کو جمع کریں اور تحریک دلائیں۔ بے روزگاروں کے لیے چھوٹے چھوٹے صنعتی مراکزِ تربیت قائم کریں۔

اوپر کی گزارشات کی روشنی میں حلقۂ خواتین کی قیادت کو باہمی مشورے سے اپنی جگہ خواتین سے رابطے کا ایسا پروگرام بنالینا چاہیے جو جماعت کے مجموعی منصوبے سے ہم آہنگ ہو۔

کام کی ایک راہ یہ بھی ہے کہ جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ دور رہنے والے رشتہ داروں، دوستوں اور سابق کاروباری یا دفتری ساتھیوں کو خصوصی خط لکھ کر آنے والے مراحل کے لیے مشورے دیں۔ اور اُن کو حمایت و تائید کے لیے آمادہ کریں۔

معروف انتخابی طریقہ ہائے کار کے ساتھ اس مرتبہ ہمیں زیادہ وسیع و عمیق اثرات حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ اور یہ کام اگر اس طریقے سے پورا زور لگا کے کیا جائے تو انشاءاللہ

نتائج حوصلہ افزا ہوں گے، بلکہ اگر خدا مدد کرے گا تو نتائج کی مقدار کام کے تناسب سے بڑھ جائے گی۔[1]

مندرجہ بالا مجموعی نقشۂ کار کے علاوہ دو مخالف قوتوں کے متعلق خصوصی مہم چلانی ہوگی۔ ایک قوت کمیونسٹوں[2] کی ہے جو اس وقت اپنی پوری ذہانت صرف کر کے ہر محاذ پر حملہ آور بھی ہے اور مزید معرکہ آرائیوں کی تیاریاں بھی کر رہی ہے۔

کمیونزم کا محاذ

اس قوت کے خلاف اسی طرح کام ہونا چاہیے، جیسے ۱۹۷۰ء میں دارالفکر کی مطبوعات کی صورت میں ہوا تھا۔ مگر اب سابق کام سے کچھ کام آگے بڑھانے ہوں گے۔ وہ یہ ہیں:

---

(۱) اصل میں میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ عین انتخابات کے وقت دوسروں کی طرح ووٹروں کے شکار کی مہم شروع کر دیں۔ میری پختہ فکر (بنیادی دعوتی لٹریچر کی اساس پر) یہ ہے کہ اصل کام دعوت الی اللہ کے لیے مستقل طور پر ہر دور میں جاری رہنا چاہیے۔ جو لوگ تحریک کا ساتھ دیں گے وہ ازخود تحریک کے ووٹر بھی ہوں گے۔ وقتی طور پر انتخابی ماحول میں کچھ اور اچھے لوگ بھی آگے آ سکتے ہیں۔ مگر بار بار اگر انتخابی موسم میں ''ووٹ ہانٹنگ'' کی تدبیر بغیر مستقل دعوتی کام کے دوہرائی جاتی رہی تو تحریک ہمیشہ کے لیے طاق پر دھری رہے گی اور جماعت کے کارکنوں کی تمام تر سرگرمیاں خالص ''سیاسی'' جماعتوں جیسی ہو جائیں گی۔

اور میرے اندازوں کے مطابق ایک عنصر ایسا (زیادہ حامیان و متفقین اور کچھ ارکان اور اکا دکا لیڈروں پر مشتمل) موجود ہے جو لمبے دعوتی کام سے تیار شدہ عوام کو اپنے گرد مستقلاً کافی تعداد میں جمع کیے بغیر کئی حلقوں میں اپنی جماعت کی پابندِ دین و اخلاق انتخابی سرگرمیوں کو کم دیکھتا ہے تو اسے انتخابات سے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ یہاں سے ذوق استعجال اور خوئے تن آسانی یہ راستہ دکھاتی ہے کہ خواہ مخواہ کی اخلاقی پابندیوں کو چھوڑو، ورنہ ممبریاں اور وزارتیں ملنے کی نہیں اور اس عنصر کو یہ غلط فہمی ہے کہ تحریک کا سارا کام اور انقلاب کی جدوجہد لازماً صرف انتخابی رہے گی۔ نتائج جو کچھ بھی ہوں (اور ان میں ہماری اپنی کوتاہیوں کو بہت دخل ہے) اور نتائج جو بھی پیش آئیں، دین کے اصول اور اخلاق کے تقاضوں کو ہم انتخابی کامیابیوں کے لیے مجروح نہیں کر سکتے۔ میں جو شروع سے انقلابی جدّ وجہد کا ایک حصہ انتخابی جدوجہد کو بھی سمجھتا رہا ہوں، میرا ذہن متاعِ دین واخلاق کی قربانی تو بادشاہت کے لیے بھی دینے پر تیار نہیں ہے۔

(۲) اگرچہ اب کمیونسٹ نظام کی تعمیرات ٹوٹ رہی ہیں اور فلسفہ ناکام ثابت ہو گیا ہے مگر پھر بھی طبقاتی تصادم اور عدم مساوات کی بنا پر بنی اصطلاحات سے بحثیں سامنے آ سکتی ہیں۔ واضح رہے کہ ہم بھی جاگیردار اور وڈیرہ طبقوں کے محافظ نہیں بلکہ مخالف ہیں مگر ہمارا نظریۂ اصلاح و تغیر تخریبی قسم کا نہیں ہے۔

۱- کمیونزم نے تاریخی سفر کے جو مزید مراحل اب تک طے کر لیے ہیں اُن کے حقائق کو سامنے لایا جائے۔

۲- خاص طور پر روس پون صدی میں اپنے باشندوں کی جبری سستی مزدوری استعمال کرنے کے باوجود جن پہلوؤں میں بڑی اقوام سے پیچھے ہے اُن کو اجاگر کیا جائے۔

۳- روس کے اندر عوام کی جو بے چینی تحریک کے پیرائے میں ظاہر ہو رہی ہے اس کو پیش کیا جائے۔(۱)

۴- روس سے نکلنے والے دانش وروں کے تجربات سے عوام کو آگاہ کیا جائے۔

۵- روس کے مسلمانوں پر جو کچھ گزری ہے اور اب وہ جس حالت میں ہیں نیز اسلام سے متعلق جس طرح کا نظریہ کام کر رہا ہے، اس کی تصویر کشی کی جائے۔

۶- روس کی پالیسیوں اور کارروائیوں کی چکی میں جو مسلم ممالک اب تک پسے ہیں اور پس رہے ہیں۔ اُن(۲) سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔

۷- پاکستان میں کمیونسٹ سوشلسٹ گروہ کے تمام تاریخی جائزے کے ساتھ ساتھ بعض خاص اداروں میں اور خاص مواقع پر انھوں نے جو پارٹ ادا کیا ہے اس کی رپورٹ قوم کے سامنے رکھی جائے۔

۸- علاقائی زبانوں اور کلچر کو بنیاد بنا کر ان لوگوں نے پاکستان کو ٹکڑوں میں بانٹنے کے لیے جو مساعی کی ہیں اور بائیں بازو کے سیاست کاروں نے پاکستان میں چار چار صوبائی قومیتوں کا نعرہ لگا کر جن فتنوں کی بنیاد رکھی ہے اُن کا حال بھی سامنے آنا چاہیے۔ (بعد میں پانچویں قومیت کا آوازہ بھی گونجا)۔

۹- ادب میں اسلام، اسلامی کرداروں، اسلامی شخصیتوں اور اسلامی قانون کے خلاف تحقیر و تضحیک

---

(۱) اب تو نوبت کھلے بندوں احتجاجی مظاہروں پر آ گئی، حالاں کہ کچھ عرصہ قبل تک یہ تصور کرنا بھی مشکل تھا کہ روس میں کوئی شہری احتجاج یا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے۔

(۲) افغانستان کے عوام پر روس نے بہیمانہ مظالم ڈھا کر اپنے آپ کو بے نقاب کر دیا ہے۔ نیز اسلامی علاقوں میں اس کی ظالمانہ پالیسی کا ریکارڈ بڑا شرم ناک ہے۔

(نوٹ): یہ باتیں میں نے افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی سے پہلے لکھی ہیں اور روس کا داخلی مدو جزر اب بعد میں زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ (ن ص)

کے لیے جو کچھ لکھا گیا ہے، فحاشی و عریانی پھیلانے کے لیے جو فن پارے پیش کیے گئے ہیں، اسلامی معاشرے کے محترم رشتوں کی جس طرح تذلیل کی گئی ہے، نیز نظریۂ پاکستان کے خلاف جو مواد اب تک آ رہا ہے، اس کا پورا گلدستہ سجا کر برسرِ عام رکھ دینا چاہیے۔

مطالعہ رکھنے والے ذہین افراد کا ایک گروپ کنارے بیٹھ کر صرف اس کام کو انجام دے۔ مطالعہ کرے اور ساتھ کے ساتھ پمفلٹ مرتب ہو کر شائع ہوتے جائیں۔ یہاں تک کہ تین ماہ میں ضروری مواد اگر پورا اشاعت میں نہ آ سکے تو بھی مرتب ضرور ہو جائے۔ افسوس کہ وسطِ ۱۹۸۹ء تک کوئی کام نہیں ہوا۔

مذہبی فرقہ سازوں کا محاذ

دوسری مخالفت مکفّر اور تفرقہ باز مولویوں کی ہے جو امت کی وحدت کو پھاڑ کر موجودہ نازک مرحلے میں دانستہ یا نادانستہ مخالفِ اسلام عالمی سازش کاروں کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مناسب صورتیں یہ ہیں:

۱- ایسی بڑی کانفرنسیں اور مقامی اجتماعات جن میں امتِ محمدیہ کے اتحاد کی تلقین کی جائے اور بتایا جائے کہ خدا نے حضورؐ کو اپنے اس احسانِ خاص کی طرف توجہ دلائی ہے کہ مسلمانوں کے لیے اسلام ذریعۂ وحدت و اخوت بنا۔ نیز واضح کیا جائے کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا، ان کے افتراقات کو ختم کرنا اور اتحاد کو ہر رخنہ اندازی سے بچانا دراصل رسول اللہؐ کی تفویض کردہ میراثِ وحدت کی پاسبانی ہے۔ واضح کیا جائے کہ خدا کے رسولؐ نے مسلم کہلانے والوں کی یک جان امت چھوڑی ہے، فرقے بنا کر نہیں دیے، تفرقہ تو حضورؐ کی تعلیم و سنت کا ترک ہے۔

۲- عوام پر یہ واضح کیا جائے کہ آج تک تاریخ میں مسلمانوں نے جو معرکے بھی کامیابی سے لڑے وہ اتحاد کی قوت کے بل پر لڑے اور جہاں کہیں اُن کی صفوں کا اتحاد ٹوٹا، وہیں ناکامی پیش آئی۔ خود برصغیر میں تحریکِ پاکستان کسی ایک فرقے کے چلانے سے نہیں چلی۔ پاکستان نہ کسی ایک فرقے نے بنایا ہے اور نہ کسی ایک فرقے کی اس پر اجارہ داری ہے۔ قرار دادِ مقاصد کسی ایک فرقے کے زور سے پاس نہیں ہوئی۔

جہاد ستمبر ۱۹۶۵ء کسی ایک فرقے کی بپا کردہ نہ تھی اور نہ کسی ایک فرقے نے قربانیاں دی ہیں۔ یہ جتنے واقعات ہوئے ہیں سب کے سب مسلمانوں کے وسیع اتحاد کی برکت سے ہوئے ہیں۔ یہ اتحاد اگر نہیں ہوگا تو ہر کام خراب ہو کے رہے گا۔

۳- یہ حقیقت بھی نمایاں کی جائے کہ جہاں ہمارے اندر نظامِ اسلامی کے قیام میں مختلف قوتیں مزاحمتیں کر رہی ہیں اور معاشی و اخلاقی احوال کو بد سے بدتر بنا رہی ہیں، وہاں ہمارے گرد و پیش کا ماحول بے حد خراب ہے۔ تیسری طرف اسلام، اسلامی انقلاب کی تحریکوں اور خود پاکستان کے خلاف بہت بڑی عالمی سازش کام کر رہی ہے جس میں سفید و سرخ سامراج ہم آہنگ ہو گئے ہیں اور جس میں یہود و ہنود دوش بدوش ہیں اور جس میں صلیب پرستوں کا بھی پورا پورا حصہ ہے۔ یعنی ہم سے بڑی بڑی مخالف قوتیں تو یہ احساس کر کے متحد ہوگئی ہیں کہ انقلابی اسلام کا خطرہ سر پر آ گیا ہے۔

اِن خطرناک حالات سے عہدہ برآ ہونا اتحاد کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ آزمائش جو ہمارے اتحاد کے باوجود بڑی مشکل نوعیت کی ہے، ہم اس کے سامنے بچوں کی طرح اگر بات بات پر لڑنے لگے۔ ایک دوسرے سے نفرت کا اظہار کیا، لوگوں کو اشتعال دلا کر تصادم پیدا کیے تو ممکن ہے کہ وقتی طور پر آنے والے انتخابات میں کسی گروہ کو اپنی جگہ دو چار سیٹیں زیادہ مل جائیں مگر اندر اور باہر سے جب لادینیت اور اسلام دشمنی اپنا کام شروع کرے گی تو ہمارے کامیاب ہونے والے تفرقہ باز بھی بُری طرح ناکام رہیں گے۔ جیت معمولی سی ہوگی اور ہار بہت دردناک ہوگی۔

جو مذہبی لوگ ملکی اور بین الاقوامی لحاظ سے سنگین پیچیدگی کے باوجود تفرقہ انگیزی کی انتہائی مہلک حکمت عملی اختیار کر رہے ہیں وہ یا تو بے حد سادہ لوح اللہ لوگ ہیں، یا پھر ان کو مخالفِ اسلام سازشی قوتوں نے آلۂ کار بنالیا ہے۔ براہِ راست نہ سہی، بالواسطہ سہی۔

ان عالمی قوتوں کے صیادانہ منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے ان کے کارندے یہاں پہلے سے موجود ہیں۔ سرمایہ دار طبقے میں بھی اور کمیونسٹوں میں بھی، یہ کارندے بڑی چابک دستی سے کسی بزرگ اور اس کے حواریوں کو مسکہ لگا لیتے ہیں کہ جناب والا!

آپ کی تو بڑی قوت ہے اور سارا دارو مدار آپ ہی پر ہے، آپ خود آگے بڑھ کر اپنا راستہ بنائیے اور قومی اتحاد یا جماعت اسلامی کو اپنے کندھوں پر پاؤں رکھ کر آگے نہ بڑھنے دیجیے۔ قومی اتحاد نے تو آپ کو محض اس لیے ساتھ لیا تھا کہ آپ کی طاقت کو اپنے کھاتے میں ڈال کر اس سے کمائی کرے۔ اور جماعتِ اسلامی تو اسلام اور پاکستان کے لیے خود ہی بڑی خطرناک چیز ہے، خدا کے لیے پاکستان کو اس کے چنگل میں پڑنے سے بچائیں۔

یہ ہے تکنیک جسے کسی بھی حقائق ناآشنا بڑے سے بڑے تفرقہ باز مولوی کو (جن کی نگاہ اس مخروطی[1] وجود سے آگے نہیں جاتی جس کا نچلا گھیرا اُن کے مریدوں پر مشتمل ہے اور جس کی چوٹی ان کی ذات ہے) صاف دکھائی دینے والے مخالفِ اسلام عناصر چرخ چڑھا دیتے ہیں۔

۴- یہ حقیقت نمایاں کر کے سمجھائی جائے کہ چاڈ کے مسلمان ہوں یا ارٹریا کے، فلپائن کے ہوں یا قبرص کے، کشمیر کے ہوں یا فلسطین کے۔ اور حالیہ حادثات کی روشنی میں جمشید پور کے ہوں یا علی گڑھ کے، اسلام دشمن[2] قوتوں نے کسی بھی جگہ اس بنا پر حملہ نہیں کیا کہ تم بریلوی اور اصلی اہلِ سنت ہو اور کسی بھی جگہ اس بنا پر کلمہ گوؤں کو نہیں بخشا کہ تم دیو بندی ہو یا وہابی۔ ان کا حملہ تو ہر اُس شخص کے خلاف ہے جو ''مسلم'' ہو۔ خواہ وہ فقہی مسائل اور شعائر و مناسک میں کسی بھی مکتب فکر سے وابستہ ہو۔ بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) میں تباہی آئی تو وہاں یہ سوال نہ تھا کہ تم نورانی میاں کو مانتے ہو یا مولانا روپڑی کو۔ اسی طرح آج افغانستان میں جو مسلمان مصیبت کے گرداب میں مبتلا ہیں ان کے خلاف توپوں کے دہانے اس دلیل سے نہیں کھولے گئے کہ تم سید احمد بریلوی شہید کے محبّ ہو یا احمد رضا خاں بریلوی کے عقیدت مند۔ جب حملہ مسلمان پر مسلمان ہونے کے لحاظ سے ہو اور ہر فرقے کے مسلمان شکار ہو رہے ہوں تو

---

(۱) ''مخروط'' جیومیٹری کی اصطلاح ہے۔ وہ شکل جس کا نچلا حصہ بڑا گھیر رکھتا ہو اور اوپر کی طرف کم ہوتے ہوئے آخر میں جا کر ایک باریک سا نقطہ رہ جائے۔

(۲) اور اب جودھ پور اور بھاگلپور اور دیگر خون خرابے والے علاقوں کا اضافہ کر لیجیے۔

اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی ایک فرقے کا محاذ بنانا اپنی شکست کا سامان پیدا کرنا ہے۔ محاذ پورے مسلمانوں کا متحدہ ہونا چاہیے۔

پھر یہ کہ کسی قلعے پر اگر باہر سے چوطرفہ گولہ باری ہو رہی ہو تو دشمن سے ملا ہوا کوئی غدّار ہی ایسا کرسکتا ہے کہ وہ قلعے کے اندر کی قوت کو ٹکڑے کر کے ان کو آپس میں لڑانے کا اہتمام کرے۔

۵- ایسے عناصر کے ۱۹۷۷ء کے رویے اور اب ۱۹۷۹ء کے رویے کے تضادات کو اچھی طرح نمایاں کیا جائے تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ یا اُس وقت یہ لوگ برسرِ باطل تھے، اور یا اب جھوٹ بولتے ہیں۔

۶- یہ حضرات تحریکِ پاکستان کا سرخیل (Champion) ہونے کا جو ڈھول گلے میں ڈال کر بجا رہے ہیں اس کا پول کھولنے کے لیے ان کے ماضی کے فرمودات اور نگارشات کا کچا چٹھا زور شور سے لوگوں کے سامنے لایا جائے۔ جیسے حال ہی میں جسارت، کراچی میں کچھ مواد چھپا ہے جس نے ایک حضرت کے بہت سے مریدوں اور غیر مریدوں کو پریشان کر دیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ایسا کام جماعتِ اسلامی سے باہر کے لوگوں کا کوئی حلقہ انجام دے۔

یہ دو محاذ اگر محنت سے سر کر لیے جائیں اور مخالف قوتوں کا زور توڑنے میں کوئی کسر نہ رہنے دی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ حالات کی رَو پر قابو نہ پایا جائے۔

یہ خاص تاریخی مرحلہ

اس وقت جب کہ دنیا میں اسلامی تحریکات پیش قدمی کر رہی ہیں۔ مغربی فلسفوں کی جو مرعوبیت مسلمانوں پر طاری ہوئی تھی وہ ختم ہو رہی ہے۔ ایران میں اسلام کے حق میں بھرپور انقلابی عمل واقع ہو چکا ہے۔ پاکستان میں یہ عمل جاری ہے جہاں مخالفِ اسلام قوتیں بِھنّا کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف غیظ و غضب اور کینے کا اظہار کر رہی ہیں وہاں اس امر کا موقع بھی واضح طور پر سامنے ہے کہ خدا کے بندے مجاہدانہ جذبے سے مخالفتوں کے طوفانوں سے گزر کر ساحلِ مراد پر جھنڈے گاڑ دیں۔ آپ پیش قدمی کریں تو آپ کو قرآن کریم کی یہ ہمت افزا پکار

سنائی دے گی: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آلِ عمران:۱۳۹)

ہمارے لیے اس صورتِ حالات میں سبق ہے جس کے بارے میں یہ کہہ کر مسلمانوں کو ڈرایا گیا تھا کہ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ (لوگ تمہارے خلاف اکٹھے ہوگئے ہیں پس ان سے ڈرو) مگر مسلمانوں کا جواب یہ تھا کہ ہمارے لیے (سب کے مقابلے میں) اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ (آل عمران: ۱۷۳) اور دوسرے موقع پر اُن کا جواب تھا کہ ان حالات کا تو اللہ نے پہلے سے وعدہ کر رکھا ہے اور سچ کہا اللہ نے اور سچ کہا اُس کے رسولؐ نے! اور ان کے ایمان و اسلام میں مزید اضافہ ہوا۔ (الاحزاب: ۲۲)

نظامِ انتخابات کی اصلاح

موضوع کا اصل تعلق چوں کہ انتخابات سے تھا، لہٰذا اس بارے میں ایک اہم اشارہ سامنے لانا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ انتخابات کی مشینری اور اس کا نظام اگر موجودہ طریقوں ہی پر چلتا رہے اور روپیہ، پیسہ، غنڈہ گردی، برادریوں کی عصبتیں، علاقائی و لسانی دھڑے بندیاں، عوام کی گردنوں پر ایک طبقے کی سیاسی و معاشی گرفت، ملازمینِ سرکار کا سیاسی استعمال وغیرہ عوامل کام کرتے رہیں تو اسلام تو رہا ایک طرف عام نوعیت کی شرافت کا بھی انتخابات کی راہ سے ایوان اقتدار تک پہنچنا ناممکن ہے۔

اس لیے مولانا مودودیؒ نے جو مباحث اس موضوع پر چھوڑے ہیں اور جو رہنمائی دی ہے اس میں صراحتاً یہ دعوت موجود ہے کہ خادمانِ دینِ حق کو فضا پر اثر انداز ہو کر انتخابی مشینری اور سسٹم اور معیارِ انتخاب اور شرائط امیدواری وغیرہ کو تبدیل کرانا چاہیے۔ اس سلسلے میں ہمارے ہاں متناسب نمائندگی کا طریقہ زیرِ غور آیا اور اسے منشور میں داخل کیا گیا، پھر دوسری جماعتوں نے بھی اسے قبول کیا، حتیٰ کہ پی پی پی کے منشور میں بھی ہے۔ مگر عملاً تبدیلی نہیں ہوئی۔

ایک کوشش اور ہوئی۔ الطاف حسن قریشی، مجیب الرحمٰن شامی اور صلاح الدین صاحب نے عدالت میں یہ مسئلہ اٹھایا کہ موجودہ دستور کے تقاضوں کو اگر صحیح طور پر ملحوظ رکھا جائے اور ان کے لیے عملی راستے بنائے جائیں تو انتخابی بدعنوانیاں ختم ہوسکتی ہیں اور علم و کردار والے لوگ منتخب ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ عدالت عالیہ کا اس پر بڑا مبارک فیصلہ سامنے آیا جس کے خلاف حکومت نے

سپریم کورٹ میں اپیل دائر کردی ہے۔

مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ جب تک عملاً وڈیرے اور سرمایہ دار اور جاگیردار اور برادری پرست لوگوں کے ہجوم اس ملک کی سیاست ومنفعت پر سوار ہیں، وہ کب کسی اچھے دستور یا قانون کو پاس ہونے دیں گے اور پاس ہوجائے تو اس کو جامۂ عمل پہننے دیں گے۔

مگر بہرحال اصلاح انتخابات کی تدابیر اگر جزبہ جز بھی رتبۂ عمل حاصل کرتی جائیں تو کچھ مدت میں جمہوریت کے ٹیڑھے مغربی راستے اسلام کے سیدھے راستوں سے بدل سکتے ہیں۔

تحریکِ اسلامی اور اختلافات

اختلافات ونزاعات کے بہت سے ہنگامے میں نے زندگی میں دیکھے۔ خاندانوں میں، کاروباری حلقوں میں، اخباروں میں، شعراء اور ادیبوں میں، سیاسی اکابر اور اُن کے گروہوں میں اور تا بحدِ آخر مذہبی جماعتوں اور دینی اداروں میں۔ نسبتاً قریبی دائرے کے اندر تحریکِ دین کے علم برداروں اور خادموں میں۔

انسانی ذوقِ اختلاف

یہ صدہا تجربات جہاں بے حد رنجیدہ ہوتے ہیں وہاں یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ ذوقِ اختلاف کی گندھاوٹ عین انسانی فطرت میں ہے۔ بقولِ ذوقؔ اختلاف ہی سے ساری رونقِ قائم ہے ـــــ انسانی افراد اور معاشرے کے اختلاف کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ایک مظہر قرار دیا ہے۔ شکلوں، صورتوں میں اختلاف، زبانوں اور اطوار میں اختلاف، لباسوں اور رہن سہن میں اختلاف، سیاست اور معیشت میں اختلاف، نظریات اور فلسفے بہت، نظام ہائے اجتماعی کے ڈھانچے مختلف، ایک جمہوریت ہی کے روپ کئی کئی، آمریت کے بھی بہروپ صدہا۔ اور تو اور شریعت میں ایک ہی نص کی مختلف تفسیریں، ایک ہی حکم کی مختلف تعبیریں، حتیٰ کہ چار فقہوں کی موجودگی برحق اور ایک گروہ کہتا ہے کہ پانچویں فقہ کو بھی مانا جائے۔ نئے لوگ تقاضا کرتے ہیں کہ ہمیں اجتہاد کر کے کوئی اور ہی فقہ بنانے دی جائے۔

اختلاف کی کچھ حدیں ہیں جن تک وہ محدود رہیں تو اختلافات سے خیر وخوبی پیدا ہوتی ہے، مگر حدودِ مناسب سے جب اختلاف آگے بڑھتا ہے تو خرابی وفساد کا باعث بنتا ہے۔

اصولی طور پر اس کی آخری حد وحی سے متعین ہوتی ہے، جیسے کہ مختلف مقامات پر مصحفِ پاک میں یہ مدعا بار بار بیان ہوا:

فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۭ (الجاثیہ:۱۷)

''یعنی انھوں نے العلم کے آجانے کے بعد ہی اختلاف کیا ہے، باہمی کش مکش کی بنا پر۔''

یعنی اہلِ ایمان کے ہر اختلاف وکش مکش کو العلم کے سامنے آنے پر ختم ہوجانا چاہیے۔ العلم سے مراد حکمِ خدا اور رسولؐ یا نص ہے۔ اسی بات کو یوں بھی قرآن کریم نے واضح کیا ہے:

وَ مَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ (الشوریٰ:۱۰)

''پھر جس معاملے میں بھی تم اختلاف کرو، تو اس کا فیصلہ کرنے والا اللہ ہے۔''

یہ تو سب سے بڑی اصولی بات ہے، لیکن تفصیلات بہت سی ہیں۔

یقیناً بعض جزئی اختلافات نیک نیتی سے بھی ہوسکتے ہیں، مگر ایسے اختلافات اگر غل وغش سے پاک ہوں تو ان کا حل خدا اور رسولؐ کے فرمودات کی روشنی میں فریقین خوش خلقی اور خوش بیانی سے خود ہی کرلیتے ہیں، لیکن بیش تر صورتوں میں اختلافی رجحانات و جذبات میں شیطان نفسانیت کی ملونی ڈال دیتا ہے۔

اسلامی حکمتِ اختلاف

اختلافات کا معاملہ ایسا ہے کہ قرآن و حدیث میں بڑے جامع انداز سے اسلامی حکمتِ اختلاف کو بیان کردیا گیا ہے اور ہر نکتہ کے ساتھ واقعاتی نظائر موجود ہیں۔ گو ان ساری تفصیلی ہدایات کو جمع کرنا ممکن نہیں، کوشش یہ ہے کہ اُن کا ماحصل سامنے لایا جائے۔

اسلامی حکمتِ اختلاف سے استفادہ کرنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ دینِ برحق جن مقاصد کے لیے آیا ہے اُن کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں کہ توحید کی بنیاد پر مسلمانوں کی مضبوط وحدت (بنیانِ مرصوص) استوار ہو۔ یہی اشارہ ہے فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ[1] کا۔ توحید جتنی صحیح طور پر دلوں میں راسخ ہوگی، اہلِ توحید کا اتحاد بھی اتنا ہی مضبوط ہوگا۔

پھر حقیقت کا ایک پہلو یہ سامنے رکھنا چاہیے کہ جس شخص کی نگاہ آخرت پر زیادہ مرتکز

---

(۱) پھر تم خدا کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے۔ (آلِ عمران:۱۰۳)

ہوگی یا جو کوئی اپنے نصب العین کے عشق میں سرشار ہوگا اُسے چھوٹے قضیوں اور جھمیلوں سے دل چسپی نہ رہے گی اور وقت اور قوتوں کا ضیاع پسند نہ کرے گا۔

ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ اصل اختلاف ایمانیات یا زندگی کے بنیادی تصورات کا اختلاف ہوتا ہے، بعد ازاں اصول و احکام کی تعبیرات کے اختلافات سامنے آتے ہیں، پھر تدابیر، مصالح اور انتظامی امور کے اختلافات اور آخری درجے پر ذاتی مفاد کے اختلافات۔

پہلی قسم کے اختلافات تو اسلام پر ایمان لاتے ہی اہلِ ایمان کے درمیان ختم ہو جاتے ہیں۔ دوسری قسم کے اختلافات علمی، تحقیقی اور استدلالی ہوتے ہیں جن کا فیصلہ استدلالی طریقوں سے ہونا چاہیے اور جن کو اگر فریقین خود حل نہ کر سکیں تو کوئی ایسا شخص یا ادارہ ڈھونڈا جاتا ہے جو "فَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٍ" کے مطابق علمی لحاظ سے فائق اور بلند تر اور معتمد علیہ ہو۔ تدابیر و مصالح کے اختلافات میں سے بعض بہت زیادہ اہمیت والے ہوتے ہیں اور بعض کم اہمیت والے۔ ان کو حل کرنے میں استدلالی طریق کے علاوہ شورائیت کے اس اصول کو بھی برتا جا سکتا ہے کہ چند افراد خود یا زیادہ وسیع حلقے کے اجماعِ تام یا اجماعِ ناقص کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ نہ کریں تو پھر کوئی حل نہیں۔ آگے افتراق ہی افتراق اور فساد ہی فساد ہے۔

سب سے آخری درجہ انفرادی یا گروہی مفاد کی کش مکش سے پیدا ہونے والے اختلافات کا ہے۔ ان کا حل گفتگو اور دلائل سے اگر نہ ہو سکے تو پھر ثالثی یا تحکیم یا عدالتی انداز سے ہو جانا چاہیے اور فریقین جس طریقے کو بھی مانیں اُس کے تحت ہونے والے فیصلے کا دونوں کو پابند ہونا چاہیے ـــــ خواہ نفع ہو یا نقصان! اور کسی صورت میں بھی کسی فریق کو بدگمانی نہیں کرنی چاہیے۔

یہ راستے خود شریعت ہی نے ہمیں بتائے ہیں۔ ان کو نہ مانا جائے تو پھر نزاعات کا کوئی حل نہیں ہے اور دل و دماغ میں زہریلے آبلے پڑ جائیں گے اور زندگی آگ کے شعلوں سے بھر جائے گی۔ وہ چہرے جن پر مسکراہٹوں کے پھول کھلنے چاہئیں ان پر نفرت کے تارکول کا غبار چپک جائے گا۔ اس غبار کو اگر دنیا میں نہ صاف کیا جا سکے تو خدانہ خواستہ آخرت تک بھی ساتھ جا سکتا ہے۔ ضروری انتباہ یہ ہے کہ اس دورِ عقل پرستی میں اختلاف کے بارے میں نامعقول رویے پھیل گئے ہیں۔ پولرائزیشن بہت عام ہے۔ جو جس بات پر اَڑ گیا، سو اڑ گیا۔ دوسرے کو دلیل سے نہ منوا سکے تو جبر و ظلم سے منوائے گا یا نہ ماننے کے انتقام میں جان تک لے لے گا۔

اپنے تحفظ کی تدبیریں

اوپر درج شدہ آیت میں لفظ ''بغی'' کا استعمال ہوا، جس کے معانی میں زیادتی، ظلم اور بے جا حصولِ مفاد وغیرہ شامل ہیں۔ یہ بیماری مال یا مادّی مفاد ہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ انانیت، تکاثر وتفاخر، رشک وحسد، شہرت حاصل کرنا، اپنی عزت وناموری کو بڑھانا اور دوسرے کا درجہ گھٹانا، قوت واثر میں کسی دوسرے سے بڑھ جانے کے لیے غلط سلط طریقے اختیار کرنا، اِن سب مظاہر کے پیچھے وہی بیماریٔ دل کام کرتی ہے۔ اس طرح کے محرکات وعوامل کا مخفی زہر فکری یا تدبیری اختلافات میں آملتا ہے۔ کبھی کبھی کسی کے متعلق کوئی ایسی وجہِ ناپسندیدگی پیدا ہوجاتی ہے یا کبھی ایسی بدگمانیاں جمع ہوجاتی ہیں کہ ان کی وجہ سے کسی فرد یا گروہ کے لیے نفرت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور پھر اس نفرت کا تلخ وگرم لاوا ہر قسم کے اختلافات کی بحثوں میں شامل ہوجاتا ہے۔

قرآنی تعلیمات کی رُو سے کچھ چیزوں سے اپنی حفاظت کرنی چاہیے۔ مثلاً:

۱- اپنے آپ کو مقام کبر (جس کی بنیادیں مادی فوقیتوں، علمی بالاتری، زہد وتقویٰ میں پیش روی، لسانی وقلمی مہارت یا عہدہ ومنصب جیسی چیزوں پر استوار ہوتی ہیں) پر رکھ کر دوسروں کی تحقیر وتضحیک نہ کی جائے۔

۲- کسی بھی قسم کی سرسری افواہوں پر جو کسی دوسرے شخص (خصوصاً جس کے متعلق پہلے سے کوئی پھانس موجود ہو) کے بارے میں موصول ہوں۔ اچھی طرح تحقیق کیے بغیر کوئی رائے قائم نہ کی جائے، بلکہ ہوسکے تو ایسی کہانیوں میں دل چسپی ہی نہ لی جائے۔ اس میں قلب کی سلامتی ہے۔

۳- غیبت کا راستہ ہرگز اختیار نہ کیا جائے بلکہ شخصِ متعلق سے کوئی شکایت یا اُس کے بارے میں کوئی اشتباہ ہو تو اخلاقی جرأت سے کام لے کر براہِ راست بات چیت کرلینی چاہیے۔ اپنی غلطی سامنے آجائے تو معافی طلب کرلینی چاہیے اور دوسرے کو غلطی کا احساس ہوجائے تو بلاتامل معاف کردینا چاہیے۔

اِس اُلجھن کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اگر متعلقہ لوگ شکایات وشبہات سننے پر تیار ہی نہ ہوں اور سنیں تو خوش گواری کے انداز کو برقرار نہ رکھ سکیں، نیز سن لینے

کے بعد متکبرانہ انداز میں شکایت کرنے والے کو بلیک لسٹ کر کے پھر اس سے انتقام لینے کی چالیں چلنے لگیں تو کیا ہو؟ میری رائے میں یہ حالت کسی اوسط درجہ کے اسلامی معاشرے خصوصاً اس کے تعلیم و تربیت پائے ہوئے افراد کی کسی تنظیم میں قابل تصور نہیں ہے۔ یہ حالت اگر عملاً پیدا ہو جائے تو پھر اسلامی کردار کی نشو ونما کی اُمیدوں سے ہاتھ دھو لینا چاہیے۔ بشرطیکہ اصلاح کا کوئی راستہ اور تدبیر نہ نکل سکے۔

۴- چند افراد کے سلسلۂ غیبت و نجویٰ سے بڑھ کر زیرِ سطح طوفانِ منافرت انگیزی زیادہ خطرناک ہے، جو دوب گھاس میں پھیلنے والے پانی کی طرح غیر محسوس طور پر دور دور تک کے رقبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ انتہائی بدنصیبی ہوگی کسی بھی دینی مقصد کے لیے جمع ہونے والے گروہ کی، جس میں شخصیتوں کی حمایت و مخالفت میں غیبت خانے کھل جائیں اور پروپیگنڈہ سنٹر قائم ہو جائیں، نیز نشر و اشاعت کی مہارتیں کام کرنے لگیں۔ میں نے بعض اوقات ماہرینِ فنِ نمیمہ کو بے دغدغہ ذہین و زبان کا نہایت افسوس ناک استعمال کرتے پایا ہے۔ میں جب عالمِ تصور میں یہ نقشہ دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ آیتیں اور حدیثیں پڑھ پڑھ کر اختلافات و نزاعات کی آگ کو مقدس دامنوں سے ہوا دے رہے ہیں تو غلبۂ الحاد و ظلم کے اس دور کی تباہ کاریوں کا اندازہ کر کے میرے دماغ کا ذرہ ذرہ لرز جاتا ہے۔

۵- دین کے سرچشمۂ ہدایت میں مسلمانوں کے لیے بہترین اور صحیح رویہ ''اصلاح بین الناس'' کا ہے۔ جہاں کوئی اختلاف و نزاع موجود ہو، وہاں بجائے اس کے کہ کچھ افراد ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں اور کچھ دوسرے کیمپ میں ـــــ اور پھر ایک طرف کی قوت اور دوسری طرف کی قوت رسہ کشی کرنے لگے تو جیت خواہ ''ا'' کی ہو، خواہ ''ب'' کی ـــــ خدا و رسولؐ کے دین کے لیے جو مہم چل رہی ہے اُسے ضرور نقصان پہنچے گا۔ آس پاس کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ ایک طرف والوں کو بھی غلطیوں کا احساس دلائیں اور مخالفت کے لیے تلخی کو کم کرائیں اور دوسری طرف جا کر بھی اصلاح و درستی کا سبق دیں۔ یہ کوئی طریقہ نہیں کہ کوئی سی مسلمان جماعت ایک طرف کا جھنڈا اٹھا کر دوسری جانب کے لیے صرف کردار کشی کی مہم چلانے میں لگ جائے۔

ضمناً یہ بھی مجھے عرض کرنا ہے کہ افراد اور جتھوں کی جب کبھی بھی کوئی کش مکش ہوتی ہے تو اسے حمایت صداقت کے نام پر اصولی رنگ ضرور دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ بیش تر نزاعات میں حقیقت و صداقت کے کچھ اجزا ایک طرف ہوتے ہیں اور کچھ دوسری طرف۔ ایک طرف والے دوسری جانب کی صداقتوں کو زیرِ غور نہیں لاتے اور دوسری جانب والے پہلے فریق کی صداقتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ صداقتوں کے اس طرح تقسیم ہو جانے کی صورت میں کسی طرف کے لیے صد فیصد حمایت یا مخالفت مغالطوں پر مبنی ہوتی ہے اور دوسروں کے لیے مغالطہ انگیز نزاعات کی فضا میں مہم صرف صلح و سازگاری کے لیے چلانی چاہیے۔

۶- ”المجالسُ بالامانۃ“ کا اصول توڑنے سے بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور معاملات سلجھنے کے بجائے الجھتے ہیں۔ کوئی بات جس دائرے کے اندر کی تھی اُس سے اٹھا کر باہر لے جانے کا قصور فریق ”ا“ سے جتنا سرزد ہو اُس کا وہ ذمہ دار ہے اور فریق ”ب“ سے جس حد تک صادر ہو اُس کا وہ جواب دہ۔ دوسری طرف اس اصول کو بااثر لوگ اپنے لیے آڑ بھی نہ بنالیں کہ کلھیا میں گُڑ پھوڑنے سے کیا بگڑتا ہے۔ جو کچھ کرنا ہے، کرتے چلو۔

بہر حال اصولاً جن اختلافات کے بیان کرنے کا ایک دائرہ شریعت کی روشنی میں دستور اور روایات کے ذریعے خود ہم نے اپنے لیے مقرر کیا ہے، اس دائرے سے اختلافات کو باہر لے جانا ایک سنگین لغزش ہے۔ ایسی لغزش جس سے بھی سرزد ہو اور جو بھی ایسی غلطی کے کسی ذمہ دار کی حمایت کا علم اُٹھالے، وہ اپنے کردار کے مطابق آخرت میں تو جواب دِہ ہے ہی، اِس دنیا میں بھی متعلقہ لوگوں کے سامنے اس کے لیے وضاحت کرنا لازم ہے اور خود لوگوں کو بھی وضاحت طلب کرنی چاہیے ـــــ اور اگر کسی کی غلطی واضح یا ثابت ہو تو اس پر انسانوں سے معذرت اور اللہ سے توبہ واستغفار ضروری ہے۔

خاص طور سے اگر ہم میں سے کچھ لوگ صرف ایک طرف اور کچھ دوسری طرف مل کر اور گفتگو کر کے ایک خصوصی نہج سے ”کیس“ مرتب کرلیں اور اسے دوسرے فریق

کے خلاف لے آئیں تو اُن کی طرف سے تو پہلا قدم ہی ناانصافی کا اٹھ گیا، اب وہ آگے کیا انصاف کریں گے۔ جسے کسی معاملے میں مصالحت پسندی یا منصفی کے جذبے سے دلچسپی لینی ہو وہ ایک طرف ملاقاتیں کرے تو پھر دوسری طرف بھی کرے، ایک طرف سے ''کیس'' معلوم کرے تو دوسرے سے بھی جا کر دریافت کرے۔ اتنی فرصت نہ ہو یا ذہن میں پہلے سے ذاتی قرب و بعد کا کوئی اثر موجود ہو تو ایسے جھگڑوں کے میدان میں اترنا ہر شخص پر فرضِ عین نہیں ہے۔ کئی اور نیک کام کرنے کے موجود ہیں۔ اِس ذمہ داری کو کسی دوسرے موزوں آدمی کے حوالے کرنا چاہیے۔

مجھے بعض ناخوشگوار احوال پیش آنے پر یہ تکلیف دِہ تجربہ ہوا کہ قرآن و سنت کے منشا کے مطابق غیر جانبدارانہ ذہن کے ساتھ مصالحت پسندی یا منصفی کے جذبے سے کم ہی کوئی شخصیت آگے بڑھتی ہے، زیادہ تعداد ایسی نکلتی ہے جس کا سلوگن زبانِ عمل سے یہ ہوتا ہے کہ ''اُدھر تم، اِدھر ہم''۔ اِس ''اُدھر اور اِدھر'' سے جو تباہی قومی زندگی میں مچتی ہے اس سے اندازہ کر لیجیے کہ کسی جماعتی یا کاروباری یا خاندانی دائرے میں یہی ذہنیت اگر داخل ہو جائے تو نتائج کیا ہوں گے۔ حضرات! یہ راستہ افتراق اور گروہ بندی کا راستہ ہے۔ سوچ سمجھ کر چلیے اور سنبھل کر چلیے۔

اس میدان میں محض جانبدارانہ جذبات کے ساتھ آنکھیں بند کر کے غلط طور پر زورِ زباں یا زورِ قلم یا زورِ عہدہ کا استعمال نہ دنیا میں مفید ہے، نہ آخرت میں باعثِ خیر۔

۷- فریقین اختلاف اور ان کے حمایتیوں کو اپنی کسی نزاع کے سلسلے میں جو بات بھی کہنی ہو، اُسے صاف نیت اور اخلاقی جرأت کے ساتھ قولِ سدید بنا کر پیش کرنا چاہیے۔ تشبیب و گریز اور لف و نشر اور کہ مکرینوں کے اسالیب اختیار کر کے ایسی پُرتضاد، الجھی ہوئی، طنزیہ اور چیستانی باتیں نہیں کرنی چاہییں کہ باہم دگر مغالطوں اور تندیٔ جذبات میں مزید اضافہ ہو۔ جو بھی دعویٰ یا شکایت یا اعتراض یا سوال برائے وضاحت طلبی ہو اُسے رشتۂ نطق کو بل دیئے بغیر سنجیدہ انداز میں بیان کرنا چاہیے۔ آدمی اگر کسی شخص کو بُرا سمجھتا ہے اور اُسے بُرا کہنا چاہتا ہے تو بہت ''اگر مگر'' کے چکر میں پڑے بغیر قلب و ضمیر کی بات کہہ دینی چاہیے۔ بشرطیکہ اُس سے مطلوب کی بہتری، الجھنوں کا حل، اللہ کی رضا

اور روح کی تسکین ہو۔ اسی طرح جس کے خلاف آپ کیس پیش کریں، اس میں اگر کوئی خوبی ہو تو اُسے کھلے دل سے ایسے انداز میں تسلیم کریں کہ آگے پیچھے کے جملوں سے یہ تأثر نہ ہو کہ آپ نے چاروناچار ایک بات تو کہی مگر اسے ملیا میٹ کرنے کا سامان بھی کر دیا۔

۸- عام حالات میں بھی اور نزاعی ماحول میں خصوصاً، جب کبھی کوئی شخص دوسرے کے متعلق کوئی واضح الزام یا اتہام لے کے آئے تو جس کے سامنے بھی بات ہو اُس کا اگر خدا پر ایمان اور تحریک سے لگاؤ ہو تو اس کی اوّلاً شرعی و اخلاقی اور ثانیاً تنظیمی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس پر دستاویزی یا شخصی شہادت طلب کرے۔ اس کے راویٔ اوّل یا مأخذ کا سراغ لگائے اور جرح و تنقید کر کے بات کو منقّح کر دے۔ یہ تعمیل ہوگی قرآنی حکم "فَتَبَيَّنُوْا"،(۱) کی۔

جہاں ایک مرتبہ ایسا جماعتی یا سماجی ماحول بن جائے وہاں غلط بیانی یا غیبت یا نجویٰ کرنے والے، چغلی کھانے والے یا دوسروں پر تہمت لگانے والے کسی شخص کے لیے سخت مزاحمت پیدا ہو جاتی ہے اور کوئی بھی شخص یاوہ گوئی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ غیبت ہو یا الزام تراشی، اِن خاردار جھاڑیوں کے اُگنے کے لیے ایک خاص طرح کی زمین اور آب و ہوا درکار ہوتی ہے۔ ایسی زمین اور ایسی آب و ہوا اپنے ہاں نہیں ہونی چاہیے۔

یہ بات بدترین گالی سے بڑھ کر ہے کہ کسی شخص کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ کسی کے ہاتھ بِک گیا ہے یا فلاں کا آلۂ کار ہے، یا اُسے جماعت کے حلقے میں کارِ خاص کے لیے داخل کیا گیا ہے۔ جماعتِ اسلامی کا کوئی آدمی سنجیدگی سے یا طنزاً یا محض اذیت رسانی کے لیے اس طرح کی بھاری اور تلخ بات زبان یا قلم سے ادا نہیں کر سکتا۔ تاوقتیکہ وہ حتمی ثبوت فراہم نہ کر سکے۔ دلائل اور موقف کی کمزوری آدمی کو بعض اوقات مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے دعوے کے وزن کی کمی الزامات کے ذریعے پوری کرے۔

مگر اسلام میں اختلافات کا راستہ بہتانوں اور تہمتوں کا راستہ نہیں ہے۔ حد یہ کہ تہمتیں اخباروں میں چھپیں، ان کا چرچا ہو، وہ قریب اور دور کے ہزارہا افراد تک

---

(۱) اچھی طرح کھوج کرید کر لو یا جانچ پڑتال کر لیا کرو۔ (النساء:۹۴)

پہنچیں۔ ایسی زیادتی جس سے بھی سرزد ہو اُسے شرمسار ہونا چاہیے اور فریقِ متعلق سے معافی مانگنے کے ساتھ ساتھ خدا سے استغفار کرنا چاہیے۔ کسی شخص کو بدنیت اور بے ضمیر قرار دینے کے بعد پھر بحث کا ہے کی۔

یہ تو ایک عجیب منطق ہوئی کہ جب تک کسی ایک نکتے کا اختلاف واقع نہ ہوا ہو تو دونوں فریق ایک دوسرے کو اچھا سمجھتے ہوں اور تعریف کرتے ہوں۔ ''ا'' بھی مؤقر و معظم اور ''ب'' بھی شستہ و شائستہ اور دونوں اسلامی ذہن و کردار کے دانشور اور قائد مگر اختلاف ہونے کے بعد عزتوں اور شرافتوں اور قابلیتوں کا ایک دوسرے کی نگاہ میں خاتمہ ہو جائے۔

اختلاف جرم نہیں

اختلاف کرنے والے کو مجرم بنا کر اس کے خلاف انتقام کا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ پہلی کوشش رفعِ اختلاف کی ہو یا کم سے کم کسی اختلاف کے ہوتے ہوئے مل کر چلنے کی راہ نکالی جائے۔ یہ معرکہ سر کرنے میں اگر دونوں طرف کی دماغی صلاحیتیں اور اخلاقی احساسات کامیاب نہ ہوں تو پھر ثالثی اور ثالثی کے بعد ایک طرح کی عدالتی تحقیق کے ذریعے معاملے کو فیصل کرا کے دونوں فریقوں کو سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے، یہ ممکن نہ ہو تو پھر ہنستے مسکراتے جدا ہونے کے بعد سارا قصہ بھول بھلا دینا چاہیے، اسے پلے باندھ کر رکھنا اور پچھلی باتیں یاد کر کے اور نئے نئے نکتے ایجاد کر کے اور ''جرمِ اختلاف'' کی سزا دینے کی تدبیریں اختیار کر کر کے اپنے اور حریف کے اعصاب کی پسپائی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ساری کارروائی ایک منفی کارروائی ہے۔ خدا خوفی سے آزاد آدمی یہ سوچتا ہے کہ جس نے اختلاف کی جسارت کی ہے اور گردن نہیں جھکائی ہے، اس کے لیے جینا دوبھر کر دیا جائے، اس کے سلسلۂ روزگار کو درہم برہم کر دیا جائے اور اس کی شخصیت پر الزامات واتہامات کا ٹنوں ملبہ گرا دیا جائے۔

اگر نزاع کے دو فریقوں میں سے کوئی ایک بھی اس منفی راستے پر قدم رکھنے سے انکار کر دے تو وہ اکیلے ہاتھ سے تالی نہیں بجا سکے گا۔ آخر پہلے بھی تو مولانا مودودیؒ نے مثال قائم کی اور جماعت کے لوگ اب بھی اس کے زیرِ اثر کئی حملہ آوروں کے حملہ ہائے پے در پے کے باوجود

ان کا کبھی ذکر نہیں کرتے، کیا کسی کے لیے اس میں کوئی سبق نہیں؟

یہاں تک بھی ایک بات ہے کہ آپ ایک بار دل کا سارا لاوا اُگل لیں، اس پر بس نہیں تو دوبارہ سہی۔ مگر کسی ''امرِ فی سبیل اللہ'' کے لیے اوّل درجے کے دماغوں کا میدان میں آ جانا، کچھ کا اگلے مورچوں سے فائر کرنا اور کچھ کا دور پیچھے گائیڈنگ کیمپ کے تہ خانوں میں بیٹھ کر حکم جاری کرنا، اخبارات و رسائل میں مضامین کی اشاعت، پمفلٹوں کی مہم، پھر ریشمی رومال تحریک کی طرح مکاتیب کی مہم، مراسلوں کا اجراء، ملک کے اندر ہی نہیں، بین الاقوامی دائرے میں بھی، پھر کسی کی حمایت سے بعض افراد کو روکنے کے لیے ان پر وفود کے ذریعے سماجی دباؤ ـــــ آخر یہ کوئی اسلامی یا شریفانہ اختلافات کے طریقے ہیں؟ پھر اپنی اپنی صفیں الگ کرنے کی کوششیں ایسی ہیں جیسے کوئی انتخابی معرکہ یا ریفرنڈم درپیش ہے کہ ایک فریق زیادہ سے زیادہ ووٹ اپنی طرف جمع کر رہا ہے، دوسرا اپنی طرف۔

کیا رسہ کشی کے اکھاڑے کی ایسی داستانیں ملتِ اسلامیہ یا تحریکات اسلامیہ کی روئیدادوں یا تاریخ کا جزو بننے کے قابل ہیں؟

اختلافات کے باوجود اتحاد

مسلمانوں کی بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ اسلام کے لیے کام کرنے کو بار بار اٹھتے اور جمع تو ہوتے ہیں، لیکن ذرا ذرا سے اختلاف پر آپس میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ پھر آگے چلتے ہیں، پھر اختلافات کی چھُری ایک ٹکڑی کو کاٹ کر الگ کر دیتی ہے۔ جماعتیں بن بن کر بکھر جاتی ہیں۔ اتحاد قائم ہوتے ہیں اور نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ قائم و دائم ہے تو وہ ہے تفرقہ!

مصیبت اصلاً یہی ہے کہ ''اختلاف کے باوجود اتحاد'' کی صف بنانا اور اُسے قائم رکھنا ہمیں نہیں آتا۔ ہم اختلافات سے عہدہ برآ ہونے کی صحیح ترکیب نہیں جان سکے ہیں۔ خدا اور رسولؐ کے جس دین کی سربلندی کا مشن لے کر اٹھے ہیں، اس نے آدابِ اختلاف اور طریقہ ہائے حلِ نزاع بھی ہم کو بتائے تھے۔ ان کو ہم مانتے بھی ہیں، مگر عملاً جب اختلافات کی آزمائش پیش آتی ہے تو وہ طریقے فراموش ہو جاتے ہیں۔ ہمارے قریبی بزرگ اور ساتھی جن کو اختلافات اور نزاعات کے حل کے لیے غیر جانب دارانہ انداز سے کام کرنے کو موجود ہونا چاہیے وہ وقت پر خود

جانب دار بن کر کھڑے ہو جاتے اور اپنے مرتبۂ قیادت اور دانشوری کے باوجود خادمانِ دین کو اختلافات سے پیدا ہونے والے خطروں سے نہیں بچا سکتے۔

جس دن اس مسئلے کا حل مسلمانانِ پاکستان اور مسلمانانِ عالم نے نکال لیا، اُس دن کوئی مزاحمت ہمارے سامنے کھڑی نہ رہ سکے گی۔ اور اس مدّعا کے لیے فکری اور عملی رہنمائی بہم پہنچانا تحریکِ اسلامی پر بدرجۂ اشد لازم ہے۔ اس دور کا سب سے مشکل کام یہی ہے!

رفعِ اختلافات کا دینی طریقہ

کوئی بھی اجتماعیت اس حقیقت کو نظر انداز کر کے قائم نہیں کی جاسکتی، چاہے وہ مسجد کمیٹی ہو یا پارلیمنٹ، یا ریاست کہ افراد انسانی میں مختلف مسائل و معاملات اور تدابیر و اقدامات کے بارے میں اختلاف ضرور ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہر معقول اجتماعیت وہ طریقہ بھی ضرور متعین کرتی ہے جس کے تحت تمام اختلافات کسی ایک خط پر آ کر ختم ہو جاتے ہیں، یا اگر عقلی حد تک رہیں بھی تو وہ عملی کام میں حائل نہیں ہوتے۔

اسلامی اجتماعیت نے اختلافات کے بارے میں یہ طریقہ وضع کیا ہے: اوّلین معیارِ فیصلہ چونکہ یہاں الکتاب اور الرسول ہے، اس وجہ سے جو امور صراحتاً کتاب وسنت کے نصوص سے ثابت ہوں، ان میں کسی کو اختلاف کرنے کا حق نہیں۔ ایسے معاملات میں صرف آمنّا وصدّقنا کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ منصوص معاملات میں اگر راہیں الگ الگ ہو جائیں اور ہر شخص کی تقسیم حلال وحرام اور تمیز جائز و ناجائز جدا جدا ہو تو کسی اجتماعیت کے قائم رہنے یا چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہاں، نصوص کی تعبیرات اور ان کے انطباقات میں نقطہ ہائے نظر کا فرق ہوسکتا ہے۔ یہ فرق اہلِ علم، سلف کے قابلِ احترام و اعتماد مفسرین و محدثین اور فقہاء کی تحقیقات کی مدد سے بہ دلائل واضح کر کے نقطۂ اتفاق پیدا کر سکتے ہیں۔ بیش تر معاملات میں اجماع اور قرونِ اُولیٰ سے اب تک کا یکساں تعاملِ امت فیصلہ کُن ہوتا ہے۔ پھر بھی اگر تعبیر و تاویل کے جزئی اختلافات رہیں تو وہ اگلی قسم کے مسائل کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔

اسلامی اجتماعیت کا اصل دائرۂ اختلاف تدابیر و مصالح سے تعلق رکھتا ہے۔ کب کیا

بات کہی جائے؟ کیا اقدام مناسب ہوگا؟ کس رویے میں دین کی خیر خواہی اور ملت کی بہبود یا انسانیت کی فلاح ہے؟ کس صورت میں تحریکِ اسلامی کا چہرہ زیادہ روشن ہوسکتا ہے؟ کس رُخ پر چلنے سے دعوتِ حق کی راہیں کھلتی اور آسان ہوتی ہیں؟ کس چیلنج کا کیا جواب دینا مناسب ہوگا؟ کس شخص یا گروہ کے بارے میں کیا رائے رکھی اور بیان کی جائے؟ الجھنوں کے جنگل میں سے کیسے راستہ بنانا مناسب ہوگا؟ کس شکل میں اجتماعیت کی زیادہ قوت مجتمع ہوسکتی ہے اور وحدت کی صف مضبوط ہوسکتی ہے؟ وغیرہ۔

اختلافی امور کی اسی دوسری صنف میں تعبیرِ نصوص یا انطباقاتِ احکام کا ہر وہ معاملہ بھی داخل ہوجائے گا جس کا حل اجماع یا تعاملِ امت یا علمائے سلف کی کاوشوں سے نہ ہوسکے۔

اس ذیل کے اختلافی اُمور کے لیے اُصولِ مشاورت مقرر کیا گیا ہے جس کے بعد اور کوئی طریقۂ حلِ اختلافات موجود نہیں ہے۔ یہاں آکر تمام بحثوں کو ختم ہوجانا چاہیے۔

اساسی ضوابط

اسلامی مشاورت کے اساسی ضوابط حسبِ ذیل ہیں:

۱- اہم مسائل و معاملات کو اُولی الامر (اربابِ مشاورت اور صاحبِ امر) کے حوالے کرنا چاہیے، یعنی پہلے سے نہ اس پر ایسی کھلی بحثیں ہونی چاہئیں کہ مختلف افراد اور گروہوں کے اندر حتمی آراء تشکیل پا جائیں، نہ کسی ایک یا دوسرے نقطۂ نظر پر گروپ یا جتھے بن جانے چاہئیں، بلکہ گفتگوئیں محض مسئلے کو سمجھنے کے لیے ہوں اور کوئی آدمی کسی خاص رائے کو نہ تو حتمی فیصلے کے طور پر پیش کرے، نہ ایسے فیصلے کے حق میں نجویٰ (Canvassing) کر کے فضا ہموار کرے اور نہ ہم خیالوں کا جتھہ بنائے۔[1]

(۱) یہ بھی ضروری ہے کہ اصحابِ امر یا اہلِ قیادت یا اکابر و عمائد بھی جتھہ بندی کر کے معاملات و امور کو پہلے سے اپنے درمیان طے کرنے سے مجتنب رہیں۔ اکابر اگر اس طریق نجویٰ کو مسلک بنالیں تو پھر کسی خرابی کا حل نہیں، بلکہ اس سے ہر طرف بگاڑ پھیلے گا۔ ارکانِ شوریٰ اور عام ارکان کو کڑی نظر رکھنی چاہیے کہ مشورے کے کام میں ایسا نجویٰ وجود میں نہ آجائے جو معاملات و امور کو بالا تر پہلے ہی سے طے کردے اور باقی ارکان کا کام صرف انگوٹھا لگانے کا ہو۔ سوچنے سمجھنے کے دروازے بند۔ معصومانہ سازش کے اس راستے سے جمہوری دائرے میں آمریت اور دینی دائرے میں پیری مریدی پیدا ہوجاتی ہے۔ (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

۲- جس سطح پر رائے طلب کی جائے، وہاں ہر شخص دیانت داری سے اپنی رائے دے (بلاخوف لومۃ لائم) کیونکہ کسی شخص کے اندر جو رائے بھی مفادِ دین اور مصلحتِ مسلمین اور خیر خواہیٔ انسانیت کے لیے پیدا ہو وہ ایک امانت ہے جو دیانت داری سے ادا کرنی چاہیے۔ اپنی رائے کے حق میں پورے دلائل دیے جائیں۔ امکانی اعتراضات اور مقابل کے شبہات کے بارے میں وضاحتیں کی جائیں۔ پھر جب آدمی یہ حق ادا کرے تو وہ اپنی بڑی ذمہ داری سے فارغ ہوا۔ اب یہ کام متعلقہ فرد، افراد یا مجلس کا ہے کہ وہ کشادہ دلی سے غور کریں اور استفادہ کریں۔

۳- کسی شخص کو اپنے متعلق عقلِ کل ہونے کا ادّعا اور دوسروں کے مقابلے میں ذہنی برتری کا احساس لاحق نہیں ہونا چاہیے کہ بس جو کچھ میں نے کہا ہے اُسے ضرور مانا جانا چاہیے۔ دوسروں کو بھی حسنِ نیت سے آراستہ سمجھنا چاہیے اور تسلیم کرنا چاہیے کہ دوسرے بھی سوچتے ہیں، دوسروں کے اندر بھی اپنی اپنی آراء اُبھرتی ہیں، دوسروں کے دلائل بھی قابلِ توجہ ہوتے ہیں اور دوسروں سے بھی استفادہ کیا جانا چاہیے۔

۴- پھر جب ہر طرف سے آراء سامنے آ چکیں تو کسی دینی مشاورتی مجلس کی فضا جو رنگ اختیار کرے اور ساری مجلس یا اس کی واضح اکثریت جب کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو اجتماعی نقطۂ نظر کو اس کشادہ دلی سے قبول کر لینا چاہیے کہ جیسے وہ بھی اپنا ہی فیصلہ ہو۔ ذہن میں اگر کوئی اختلافی رجحان باقی بھی رہے تو اُسے اجتماعیت پر قربان کر دینا چاہیے۔

علی الخصوص جب سربراہِ کار کی رائے بھی اکثریتی رجحان کے حق میں دوٹوک طریق سے سامنے آ جائے تو پھر سمع و طاعت اور ہم آہنگی کی ذمہ داری اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ایک وقت آتا ہے کہ خام اور کھوکھلے لوگ نظم کے اندر زیادہ گھس آتے ہیں۔ وہ نہ اتنا مطالعہ رکھتے ہیں اور نہ اتنا تفکر جس کی مانگ تحریکِ اسلامی کرتی ہے، لہٰذا ان کے لیے سہل صورت یہ ہوتی ہے کہ دو چار سوچنے والے خواص دماغ سوزی کا کام کر کے پکی پکائی کھیر ان کے سامنے رکھ دیں اور وہ پکار دیں "واہ وا، ہمارا ووٹ آپ کے ساتھ ہے۔" جو رائے امام کی، وہی مقتدی کی، حتیٰ کہ بعض اصحاب تو اب یہ تک چاہتے ہیں کہ مرکز کا یہ اشارہ سمجھ میں آ جائے کہ وہ کس شخص کو اہمیت دے کر آگے کرنا چاہتے ہیں بس وہ بھی فوراً اُسی کے حق میں آواز اٹھا دیں گے۔

اسلامی اصولِ مشاورت کے تحت کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اجتماعی فیصلہ ہوجانے کے بعد پھر اپنی جداگانہ اختلافی رائے کا جھنڈا بلند کرے بلکہ یہ بھی درست نہیں کہ اس کے الفاظ یا رویے سے کسی طرح کی تکدرانہ بددلی کا اظہار ہو۔

یہ ہے طریقہ تفردات کے فتنے سے بچ کر اجتماعیت کو مستحکم رکھنے کا۔ اگر حلِ اختلافات کے لیے ایسی کوئی آخری حد معین نہ کی جائے تو پھر آدمی کی اختلاف پسند فطرت نہ کسی اتحاد کو قائم رہنے دیتی ہے، نہ کسی اجتماعیت کو چلنے دیتی ہے۔

یہی تمام مخلص خادمانِ دین کی روش رہی ہے، یہی اسلامی نظام جماعت کے دستور کا تقاضا ہے اور یہی ۴۳ سال سے ہماری اٹل روایت رہی ہے۔

اس اصول و روایت میں خلل ڈالنے کے معنی یہ ہیں کہ ہزاروں افراد کی قربانیوں سے اسلامیت کے قلعے کی جو فصیل اٹھائی گئی تھی، اس میں دراڑیں ڈال دی جائیں، اور ساتھ اپنی بنی بنائی ساکھ کو برباد کر دیا جائے۔ محض اپنی ''انا'' کے سامنے اتنا قیمتی چڑھاوا پیش کر دینا کوئی اچھی بات نہیں۔

سمع وطاعت کہاں تک؟

یہ محض خودساختہ مصلحتی باتیں نہیں ہیں، بلکہ معاملہ کے ہر پہلو پر الگ الگ دلائل کتاب وسنت میں موجود ہیں۔ ان سارے دلائل کو جو شاید بیش تر نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں، میں یہاں دہرانا نہیں چاہتا، لیکن اسلامی نظامِ سمع وطاعت کے متعلق متعدد ہم معنی احادیث میں سے صرف ایک کو یہاں نقل کرتا ہوں:

عن جنادة بن امية، قال: دخلنا على عبادة ابن صامت وهو مريض، فقلنا حدثنا اصلحک اللّٰہ بحديث ينفع اللّٰہ به سمعته من رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلّم، قال، دعانا رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلّم فبايعنا، فكان فيما اخذ علينا ان بايعنا على السمع والطاعة فى منشطنا

ومکرهنا وعسرنا ویسرنا واثرة علینا، ولا ننازع الامر اهله، قالؐ الّا ان تروا کفر ابواحًا عندکم من اللّٰہ فیه برھان۔ (مسلم)

''روایت جنادہ بن امیہ کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم عبادہ بن صامت کے پاس گئے جو حالتِ مرض میں تھے، پھر ان سے ہم نے کہا کہ اللہ آپ کو شفا دے، ہم سے کوئی حدیث بیان کیجیے، جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو اور اللہ اسے ہمارے لیے باعثِ افادہ اور آپ کے لیے باعثِ صحت بنا دے۔ انھوں نے (جواباً) کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں (بیعت کرنے کے لیے) دعوت دی۔ اور ہم نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر) بیعت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے جو اقرار لیا (اور جس پر ہم نے بیعت کی) وہ یہ بات تھی کہ سمع وطاعت کے پابند رہیں، پسندیدہ صورتوں میں بھی اور ناپسندیدہ صورتوں میں بھی، آسانی کی حالت میں بھی اور تنگی کی حالت میں بھی۔ اور اس صورت میں بھی کہ ہم دباؤ میں ہوں اور یہ کہ ہم اختیار[1] کے معاملے میں اہل اختیار سے نزاع نہ کریں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اضافہ فرمایا کہ ''اِلّا یہ کہ تم صریح ونمایاں کفر (کے صدور) کو دیکھو، جس کے متعلق تمہارے پاس اللہ کی طرف سے واضح دلیل موجود ہو۔''[2]

اِس حدیث کو پڑھ کر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ کسی صحیح دینی اجتماعیت کا معاملہ عام سیاسی پارٹیوں کی طرح کا نہیں ہوتا، جو چیز چاہی مان لی، جس معاملے میں چاہا اختلاف کر کے الگ بیٹھ رہے، دوسروں میں اپنا اختلافی نقطۂ نظر پھیلانا شروع کر دیا، بات کو پریس میں لاکر ''المجالس بالامانة'' کی تعلیم کو پامال کر دیا۔ دینی اجتماعیت کے نظامِ امر اور نظامِ مشاورت اور حدودِ اختلاف کی خلاف ورزی گناہ ہے جس کے سرزد ہونے کے بعد توبہ کے علاوہ کوئی راہِ نجات نہیں۔

---

(۱) اس سے اشارہ ملتا ہے کہ ایسی نزاع جو اختیار کو اہل اختیار سے چھیننے کے لیے نہ کی جائے۔

(۲) یہ واضح کلمہ استثنٰی (واجازت) ہے۔

دو اہم نکات

اس حدیث (اور ایسی متعدد احادیث) کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی فیصلوں اور اربابِ امر کے احکام کی اطاعت خوش گواری اور ناخوش گواری، آسانی اور تنگی کی مختلف حالتوں میں کی جائے گی۔ بلکہ آدمی جب محسوس کرتا ہو کہ اس کی پُرخلوص رائے اور اس کا محکم استدلال دوسروں کی کثرت رائے یا صاحبِ امر کے نقطۂ نظر کے بوجھ سے دب گیا ہے، تب بھی اُسے اطاعت کرنی چاہیے۔ اور ایسا نہیں ہونے دینا چاہیے کہ اس کے رویے، اس کے الفاظ، اس کے لہجے یا چہرے کے رنگ سے بھی دیکھنے والوں کو یہ تاثر ہو کہ اس شخص کو اجتماعی فیصلے یا صاحبِ امر کے حکم سے کوئی تکدّر ہے۔

دوسری اہم بات اس میں یہ ہے کہ اہلِ امر سے اختیار چھیننے یا اس اختیار کو کم زور کرنے یا اسے کم اثر بنانے کے لیے بحثا بحثی اور شدّتِ اختلاف اور اظہارِ رنج اور جتھا بندی کے ذریعے شمہ بھر بھی کوشش نہ کی جائے۔ جو لوگ شریکِ مشورت ہوتے ہیں وہ بھی ''امر'' سے ایک گونہ تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا اُن کی اکثریت کو بے وزن اور قابلِ احترام قرار دینا بھی نزاع کی تعریف میں داخل ہے اور سربراہ تو کسی اسلامی نظامِ جماعت کو چلانے کی آخری ذمہ داری رکھتا ہے اور پوری جماعت کے سامنے سب سے بڑھ کر جواب دہ ہوتا ہے۔ وہ جب رفقائے مشورت کی بحثیں سن کر ان کے غالب رجحان کی بنیاد پر ایک فیصلہ دیتا ہے کہ یہ بات یوں طے ہوئی تو اس بات کو نہ ماننا یا زبان سے مان کر عمل سے اس کا حق ادا نہ کرنا، یا مثبت سرگرمی کے بجائے منفی انداز سے ذہنی برودت کا مظاہرہ کرنا۔ یہ ساری صورتیں کسی نہ کسی حد تک نزاع فی الامر سے تعلق رکھتی ہیں۔

آخری بات یہ ہے کہ حدیث کی رُو سے بگڑ جانے یا بَرَاُت کرنے یا مختلف رائے سامنے لانے کے لیے صرف ایک ہی حتمی بنیاد ہے اور وہ یہ کہ کھلے کھلے کفر کا صدور اصحابِ امر یا اربابِ مشورت کی طرف سے ہو اور کھلے کفر کا اطلاق محض جذبات کی بنیاد پر نہ کیا جائے، بلکہ آدمی کے پاس اللہ کی طرف سے صاف صریح دلیل ہونی چاہیے۔ یہ ہے کسی اسلامی نظامِ جماعت میں طاعت کی آخری حد۔ اگر لوگ اس آخری حد کے آنے سے پہلے ہی ہر اختلاف پر منہ پھیر لیں تو نتیجہ سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ ایک تیز رَو ندی جو چٹانوں کو ریلتی جاتی ہو، کئی دھاروں میں

تقسیم ہوجائے اور چھوٹے چھوٹے دھارے اس قابل بھی نہ ہوں کہ راستے میں جمع ہوجانے والے انبارِ خس وخاشاک کو بہالے جاسکیں۔ وہی ندی جسے عبور کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ اب اس کے چھوٹے چھوٹے دھاروں اور باریک باریک نالیوں کو بچے بھی الانگنے لگیں گے۔ اختلاف جب اپنی حدود کا پابند نہ رہے تو پھر اجتماعیت کا قائم رہنا ممکن نہیں رہتا۔ سمع وطاعت کے دینی اصولوں اور دیرینہ عملی روایات کو اگر توڑا جانے لگے تو پھر کسی فرد کی بھی سربراہی اور کسی مجلس کی مشاورت کی قوت کام نہ کر سکے گی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم شریعت کے نظامِ سمع وطاعت، اس کے ضابطۂ مشاورت اور اہلِ امر کے حقوق کو اچھی طرح سمجھیں اور ان کو قدم قدم پر ملحوظ رکھیں۔

ایک نازک مسئلہ

یہاں دو ایک وضاحتیں ضروری ہیں۔ اصولی بات تو بیان ہوگئی، مگر چوں کہ سلف سے ہماری دینی کوششوں کے لحاظ سے ذہنی جھکاؤ حفاظتِ نظم کی طرف زیادہ ہے اور فرد اور معاشرے کے حقوق نسبتاً کم زور حیثیت اختیار کر گیے ہیں۔ اِسی کا نتیجہ یہ تھا کہ خلافتِ راشدہ تک جو دورِ اقتدار چلا وہ عوامی رجحانات اور مشاورتی تقاضوں کے حدود میں کسا رہا، لیکن یہ نظام چونکہ اخلاقی ساخت رکھتا ہے، اس لیے امیر کو جو اختیارات حاصل ہوتے ہیں ان پر وہ تنقیدوں سے چاہیں تو زیادہ اثر نہ لیں اور مشاورت کے لیے بھی اپنی پسند کے افراد جمع کر لیں اور جدھر سے اختلافی اور احتسابی بات اٹھ سکتی ہو ایسے لوگوں کو وہ دور پھینک سکتے ہیں، یا ان کی بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا سکتے ہیں اور یوں آہستہ آہستہ آمریت کا راستہ بنتا ہے۔ میرا مطالعۂ احادیث ناقص ہے مگر اتنا تأثر میں نے لیا ہے کہ نظامِ اسلامی کا نام لیتے ہوئے اگر کوئی شخص ایک آمری شخصی نظام کی طرف گاڑی کو موڑنے پر اتر آئے تو یہ پورے دین اور پوری ملّت کا بھاری نقصان ہے۔ اس نقصان کو دور کرنے کے لیے زبان اور قلم کی طاقت ہر مؤثر طریق سے اور محتاط انداز سے استعمال کرنا لازم ہے۔ پھر اگر معاشرے کا درستیٔ احوال کے لیے عام تقاضا پیدا ہوجائے تو وہ اپنے راستے خود بنا تا رہتا ہے۔

میرے نزدیک کسی کی انسانی اطاعت کو خدا کے حکم کے تحت لاکر جب اطاعت

بالمعروف کہا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کوئی اطاعت معروف کو قائم کرنے اور منکر کو توڑنے والی ہو اور وہ مجموعی مصلحتِ دین اور مجموعی مصلحتِ امّت کے لیے باعثِ ضرر نہ ہو۔

یہ ہوسکتا ہے کہ آدمی بعض فیصلوں کی عملاً یا قولاً مخالفت نہ کرے جب تک کہ وہ صریحاً قانونِ شریعت اور اخلاقِ اسلامی کے مخالف نہ ہوں، مگر بعض فیصلوں کے خلاف اس کے دل میں کوئی دوسرا نقطۂ نظر ہوسکتا ہے۔ کوئی شخص ضمیر کو بالکل کچل نہیں سکتا اور ایسے نقطہ ہائے نظر کو مصلحتاً اگر روکنا پڑے تو نظم کی خاطر وہ رو کے ضرور جاسکتے ہیں، مگر کبھی کبھار گفتگوؤں، تقریروں، تحریروں میں نہایت خفیف درجے میں جھلک بھی سکتے ہیں۔ یہ کمزور انسان کی فطرت کی مجبوری ہے۔

اگر کوئی اقتدار یا جماعت لوگوں کو ایسی بہت سی پیچیدگیوں میں آئے دن مبتلا کرتی رہے اور ان کے اضطرابات کا لحاظ کیے بغیر اپنی مرضی اپنے حامیوں کے تعاون سے ٹھونستی چلی جائے تو آہستہ آہستہ انتشار اور بحران کی وبا پھیلتی جاتی ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ نہایت اچھے بنے بنائے کارکنوں کے خیالات اور رویوں کو صحیح پٹڑی پر ڈالنا مشکل ہوجاتا ہے۔

لہٰذا اطاعت کرانے کی ذمہ داری جن لوگوں پر عائد ہوتی ہے ان کا کام یہ ہے کہ ان شرائط کو ضرور پورا کریں جن سے رضا کارانہ جذبۂ اطاعت بڑھتا ہے۔ یہ دوطرفہ کام ہے۔ اگر حالات میں خلل ہوگا تو ذمہ داری دونوں طرف تقسیم ہوگی۔ کسی ایک فریق کو پاک صاف قرار نہیں دیا جاسکتا۔

واضح رہے کہ نبیؐ کی قیادت اور خلفائے راشدینؓ کی قیادت اور دوسرے صلحاء کی قیادت کو بر بنائے عدالت و دیانت اور بر بنائے محبتِ فرد و محبتِ ملّت، نیز اپنے رتبۂ عوامیت اور اہتمامِ مشاورت کی وجہ سے جو محکم اعتماد حاصل رہتا ہے، ضروری نہیں ہوتا کہ وہ اعتماد پورے معیار کے ساتھ یا ایک بڑی حد تک ہر جگہ موجود ہو۔ اس روح و جوہر میں اگر کمی ہو تو باقی صرف دستور اور ضابطے اور سرکلر اور فلاں مجلس اور فلاں مجلس کے فیصلے رہ جاتے ہیں۔ ہر قیادت کی اصل قوت محبت و اعتماد ہے، نہ کہ تحکم و جلال!

یہ چند سطور میں نے اس شعور کی روشنی میں لکھی ہیں جو تاریخ اور اجتماعی ہیئتوں میں کام کرنے والے قانون کے متعلق مجھے حاصل ہوسکا ہے۔

ایک ضروری نوٹ

یہ سطور بعد میں شامل کر رہا ہوں۔ بعض بزرگوں اور خُردوں نے مولانا مودودیؒ کے رجحان کو آمرانہ قرار دیا ہے۔ اور پھر جماعت کے نظم کے اعتبار کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ گو یہ دور بہتان طرازی کا طوفان گزر گیا ہے مگر کاغذ کی اسکرین پر اس کا ویڈیو کیسٹ بار بار دکھایا جاتا رہتا ہے۔

اس سلسلے میں جماعت کے لٹریچر میں ساری حقیقت مُبرہن ہے مگر دو ایک چیزوں پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ دہلی میں تشکیل جماعت سے پہلے مولانا مودودیؒ سید عبدالعزیز شرقی کو ساتھ لیے جناب عبدالجبار خیری سے ملے۔ دونوں صاحبان گفتگو کرتے کرتے ایک جماعت بنانے پر متفق ہو گئے۔ لیکن ایک اختلاف ایسا تھا جو حل نہ ہو سکا۔ خیری صاحب کا کہنا یہ تھا کہ امیر، امیر مطلق ہونا چاہیے اور مودودیؒ صاحب کا موقف یہ تھا کہ امیر مطلق تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ خاصی گفتگو کے بعد بھی اس مسئلے پر اتفاق نہ ہو سکا۔

(ارشادات سید عبدالعزیز شرقی، تذکرۂ مودودیؒ، ج ۱، ص: ۲۸۹)

تحقیقاتی عدالت بہ سلسلہ اضطراباتِ پنجاب ۱۹۵۳ء کے سامنے ڈائرکٹ ایکشن (سول نافرمانی) پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

> ''لیکن صرف یہ بات ہے کہ یہ ایک غیر آئینی طریق کار ہے، اس کو حق اور انصاف کے خلاف ثابت کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔'' ... ''ایک حکومت، قطع نظر اس سے کہ وہ جمہوری ہو یا شخصی یا کسی اور قسم کی، اطاعت کا غیر مشروط اور غیر محدود حق نہیں رکھتی۔'' ... ''اس کے احکام، قوانین، نظریات اور حکمتِ عملی، معقولیت پر مبنی ہوں اور ملک کے عام باشندے ان پر مطمئن ہوں۔ کسی حکومت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ لوگوں پر ان کی مرضی کے خلاف ایک ایسا نظام یا نظریہ یا حکم مسلط کر دے جو دلیل سے معقول اور جائز ثابت نہ کیا جا سکتا ہو اور جس کا بُرا اثر لوگوں کے مذہب یا اخلاق یا نظام تمدن و معاشرت یا مادّی مفاد پر پڑتا ہو۔'' ... ''ایسا رویہ اختیار کرنے کے بعد اسے یہ مطالبہ کرنے کا حق باقی نہیں رہتا کہ لوگ اس کے آئین کا احترام کریں۔''

''اسلام بدنظمی اور بدامنی کو سخت ناپسند کرتا ہے'' ... ''مگر اس کے ساتھ وہ یہ اصول بھی

مقرر کرتا ہے کہ خدا کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں۔ معصیت کا حکم بہ ہر حال نہیں مانا جاسکتا اور دین کے اصولوں میں ترمیم یا منصوص احکام میں تغیر کی بہ ہر حال مزاحمت کی جائے گی۔''

''جماعت اسلامی نے اپنے دستور کی دفعہ ۱۰، شق (۳) میں اپنے آپ کو آئینی طریقِ کار کا پابند کیا ہے''... ''مگر ہم حکومت کی ظِلُّ اللّٰهِی پر ایمان نہیں رکھتے کہ اپنے اوپر اس کے خدا جیسے حقوق مان لیں اور خداوندِ عالم کی قہاری کی طرح اس کی قہاری کو بھی تسلیم کر لیں۔'' (اقتباسات از قادیانی مسئلہ کلاں مؤلفہ مولانا مودودیؒ، ص: ۲۶۵ تا ۲۷۰)

آخری جملہ

اس سلسلے میں مولانا کے حق میں سب سے بڑا استدلال اس عملی رویے کی شکل میں سامنے آتا ہے جس کے تحت مولانا نے سب سے آراء اور اختلافی بحثیں اور تنقیدی اعتراضات حلیمی سے سنے اور اپنی طرف سے کوئی حتمی حکم ٹھونسنے سے گریز کیا۔

اتحاد ــــــ مقصد اور طریقہ

اِدھر چند روز سے یہ خوش آئند خبر گونج رہی ہے کہ محبّ اسلام اور خادمِ وطن (کالعدم) جماعتوں کے رہنما باہمی اتحاد کے موضوع پر گفت وشنید بھی کر رہے ہیں اور سوچ بچار بھی۔ بڑی مبارک خبر ہے اور اگر یہ نتیجہ خیز نکلے تو جملہ مومنوں کو یہ اتحاد مبارک ہو۔

مگر میری سمجھ سے یہ امر بالاتر ہے کہ ایک مسلمان کلمہ کو قبول کرتے ہی دوسرے مسلمان کا بھائی اور خیر خواہ بن جاتا ہے۔ اس بات کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ گفت وشنید کے سامان کیے جائیں اور باہمی ردّوکد ہو۔ اسی بات کو میں یوں بھی کہوں گا کہ جس دن کوئی شخص اسلام کو قبول کرتا ہے اُس دن سے اُسے جس طرح بنیادی عقائد، عباداتِ خمسہ کی تلقین کی جاتی ہے اسی طرح اسے یہ بات بھی سمجھا دینی چاہیے کہ اب تمام مسلمان تمہارے بھائی ہیں اور تم ان کے بھائی ہو۔

وحدت اور قوت اور اتحاد اگر خود اسلام ہی کے تقاضے ہیں تو اِن تقاضوں کو عوام تو کیا، خود ان کے دینی رہنما بھی نہیں سمجھتے۔ اور اُن میں دوسروں کے لیے جذبۂ خدمت وخیر خواہی نہیں ہوتا۔ بلکہ انہی کا رویہ اور انہی کی تلقینات کے تحت اُن کے معتقدین بھی محض کلامی اور فقہی اختلاف رکھنے والوں سے نفرت کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ معاشرتی اور سیاسی امور ہی میں! افتراق محدود نہیں رہتا بلکہ مسجدیں تک الگ الگ ہو جاتی ہیں۔

مساجد بہ طور مراکز تعمیر واصلاح

مسجدوں کا ذکر آیا تو بڑے دردمندانہ جذبے کے ساتھ میں یہ کہتا ہوں کہ کئی ہزار جامع

مساجد کے علاوہ عام مسجدیں بھی بہ کثرت ہیں۔ یہ گویا تعلیم وتلقین کے ایسے مراکز ہیں جہاں سے اگر چند سال مسلسل تعمیری کام کیا جاتا تو حکومتوں کے بگاڑ کے باوجود تیزی سے اصلاحات پھیلتیں، مگر میری ذاتی شہادت یہ ہے کہ مسجدوں میں حرام کمائیوں کے خلاف، ہاتھ اور زبان اور مال کے ذریعے دوسروں پر ظلم کرنے کے خلاف، اسراف کے خلاف، خیانت کے خلاف، محلے اور گلیوں کی گندگی کے خلاف، اسلامی تقاضوں کو کبھی اصل موضوع بنا کر ترتیب سے اصلاحِ معاشرہ کا کام نہیں کیا گیا۔ اسی طرح سیاست سے مسجدوں کی بے تعلقی اس حد تک ہے کہ خالص اصولِ سیاست پر بھی کبھی جامع اور مؤثر تقاریر نہیں ہوتیں جو تعلیم عوام کا ذریعہ بن سکتیں۔ توحید کی اہمیت کا بیان، رسول اللہؐ کے مدارج عالیہ کا تذکرہ، نماز، روزے اور حج وزکوٰۃ یا قربانی کے موضوعات پر ہر سال ایک ہی طرح کی گفتگوئیں اور پھر اس سے آگے نعتیں اور لاؤڈ اسپیکر پر اجتماعی ذکر وغیرہ کی طرف توجہ مبذول رہتی ہے۔ یہ ساری چیزیں اپنی جگہ رائج مگر قرآن وسنت کا وسیع حصہ جس میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی فلاح کا راستہ بتایا گیا ہے۔ وہ تقریباً نظرانداز رہتا ہے۔

ورنہ اگر مسجدوں کو فضول اختلافی بحثوں سے الگ رکھ کر انھیں دین کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں کا شعور پھیلانے کا ذریعہ بنایا گیا ہوتا اور درس، خطبوں وعظوں اور تقریروں کے ذریعے قوم کو صحیح معنوں میں عملاً مسلم قوم بنانے کی فکر کی گئی ہوتی تو پانچ دس برس میں ہمارے عوام کے ذہن اسلام کی روشنی سے چمک رہے ہوتے اور اُن کی عملی زندگی کی سرگرمیوں کی خوشبو ہر طرف پھیلتی۔ آج اسلامی تعمیر و اصلاح کے کئی ہزار مرکز شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے دیہات تک ہمارے پاس ہونے کے باوجود قوم وقت کی ڈگر پر چلی جارہی ہے۔۔ وہی دولت پرستی، وہی رشوت، وہی خیانت ، وہی قتل اور چوریاں، وہی غیر اسلامی تہذیب اور عریانی و فحاشی اور بدکاریاں اور وہی استحصال، جو غیر مسلم قوموں میں ہے، ہمارے ہاں بھی ہے۔ اسی طرح سیاسی ومعاشی امور میں اذہان پریشان ہیں اور جب زندگی اُن کے سامنے نت نئے مسائل رکھتی ہے تو وہ ان کا حل تلاش کرتے ہیں۔ انہیں علماء کی مختلف بارگاہوں سے مختلف جواب ملتے ہیں۔

اتحاد مطلوب ہے تو کچھ سوچیے بھی!

اتحاد کی مبارک مساعی کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ ضرور سوچیے کہ پہلے جو اتحاد بنا تھا وہ

کیوں ٹوٹا؟ اس معاملے میں ایک دوسرے پر الزامات لگانے کے بجائے اصولاً ان وجوہ واسباب کو متعین کیجیے جو خاتمۂ اتحاد کا باعث بنے اور لوگوں میں آہستہ آہستہ یہ احساس پروان چڑھتا گیا کہ محبِ اسلام و وطن جماعتوں اور ان کے لیڈروں میں اتحاد کو آگے بڑھانے اور اسے بدلتے حالات میں قائم رکھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اس بنا پر بہت سے لوگ سرے سے اس بات ہی کے مخالف بن گئے ہیں کہ ان جماعتوں کو اتحاد قائم کرنا چاہیے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اس امر کا بھی قطعی اور شعوری فیصلہ کر لیجیے کہ آپ حقیقت میں کس مقصد کے لیے اتحاد کرنا چاہتے ہیں؟ کیا محض جمہوریت کے لیے؟ کیا انتخابات جیتنے کے لیے؟ کیا اپنی اہمیت بڑھانے کے لیے اور اپنی برتری کا سکہ چلانے کے لیے؟ یا کیا کسی ردّعمل کے تحت؟ کیا کسی منفی پروگرام کے لیے کہ فلاں کو گرانا ہے یا فلاں چیز نہ رہے؟ آگے اور کچھ نہیں؟

اگر اس طرح کے کسی مقصد کے لیے مل بیٹھنا ہے تو پھر یہ سب کچھ چار دن کا کھیل ثابت ہوگا۔ ہاں اگر مقصد غلبۂ دینِ حق، اقامتِ دین یا نظامِ مصطفیٰ کا قیام اور پاکستان کی سرزمین اور اس کی سالمیت کا تحفظ ہو جس میں جماعتیں اور شخصیتیں ہر ممکن حصہ لیں اور بے لوث طریق سے کام کا نقشہ بنائیں اور کارکنوں کو اس میں مصروف کریں۔ لیکن حصولِ اقتدار کے لیے باہم دِگر کش مکش کرنے سے اتحاد کو محفوظ رکھیں۔

غلط طریقِ آغاز

یہ بات سچے اسلامی اتحاد کے منافی ہے کہ کوئی فریق کسی دوسرے سے چاہے کہ مجھ سے معافی مانگی جائے۔ یہ سلسلہ اگر آگے چلے تو ہر جماعت اور لیڈر کی طرف سے دوسروں کے رویے، ان کے بیانات، ان کے انٹرویوز اور ان کی تحریروں کے خلاف ایسی شکایات ہو سکتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہر کوئی یہ مطالبہ لے کے اٹھے گا کہ پہلے فلاں ہم سے معافی مانگے تب اتحاد ہو سکتا ہے۔

اختلافات اور شکایات کے پچھلے دفتر دریا بُرد کیے بغیر اتحاد اوّل تو ہونا مشکل اور ہو جائے تو چلنا مشکل۔ کیوں کہ اس طرح کی باتوں میں یہ جذبہ چھپا ہوتا ہے کہ ہم دوسروں سے برتر ہیں اور اپنی برتری کے ساتھ دوسروں سے ملیں گے۔

اگر یہ کسی جاگیر اور جائیداد کے جھگڑے کی بات ہوتی یا کسی مال کا بٹوارہ ہو رہا ہوتا تو

لڑنا، جھگڑنا، روٹھنا، دباؤ ڈالنا اور کسی فریق سے معافی طلب کرنا، یہ ساری چیزیں بجا ہوتیں۔

آپ تو اللہ کے دین اور اس کے کلمے کو بلند کرنے اور اس کی عطا کردہ آزاد اسلامی ریاست کو ہر طرح محفوظ رکھنے کے لیے یک جا ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ آپ کا تو یہ اپنا کام ہے، اور دوسروں ہی کو نہیں، خود آپ کو اس کی ضرورت ہے کہ جملہ محبّ دین و وطن عناصر آپ کے ساتھ ایک صف میں آجائیں۔ بل کہ اُلٹا آپ اس پر تیار ہو جائیں کہ کسی کی منت سماجت بھی کرنی پڑے تو ہم کریں گے۔ ورنہ اگر دوسری راہ آپ نے پسند کی تو یا تو آپ لادین، مخالفِ دین، تخریب پسند اور علیحدگی پسند سیاست بازوں کے طوفان کی ایک موج بننے پر مجبور ہوں گے، یا آپ جمہوری دور شروع ہونے پر کسی بھی ایوان میں سے چند فیصد سیٹیں لے جائیں گے۔ ایسی قوت دنیوی کاموں کے لیے سفارشیں تو کر سکتی ہے، مگر اسلامی نظام کی تعمیر کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔

آخری ضروری بات

ہم لوگوں کا ایک فلسفۂ اتحاد ہے۔ جس کے اصول قرآن و حدیث کی روشنی میں ہمارے لٹریچر میں بھی متعین ہوتے چلے آئے ہیں اور ہمارے عملی تجربوں سے بھی۔ ان سارے اصولیات اور تجربات کو دریا بُرد کر کے نِت نو بہ نو انداز تو اختیار نہیں کیے جا سکے۔ آخر ایک تحریک اور جماعت سے معاملہ ہے جس سے تعلق رکھنے والے ہزاروں لاکھوں دوستوں کے دل و دماغ اور کردار سانچوں میں ڈھلے ہیں، ان کے سوچنے کا ایک نہج ہے، وہ اپنے پیمانوں اور معیاروں کو کچھ نہ کچھ جانتے ہیں۔ کوئی ایسی بات ہم نہیں کر سکتے کہ ان کے قلب کا کمپیوٹر جس طرح برسوں سے سیٹ چلا آ رہا ہے، اس ترتیب کو درہم برہم کر دیا جائے۔

ہمارا پہلا نکتۂ اتحاد یہ ہے کہ ہم دینِ حق اور اسلامی نظام کو اوّلین اور اَساسی حیثیت دے کر دوسروں کے ساتھ صف بنا سکتے ہیں۔

ہمارا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ہم اپنے نظریہ و نصب العین کے کٹّر مخالفین کے ساتھ محض سیاسی مفاد کے سمجھوتے نہیں کر سکتے۔ جو لوگ دینی کام میں ہمیں کوئی مدد دے نہیں سکتے، ان کی مدد کے بھکاری ہم سیاست کے لیے نہیں بن سکتے۔

ہمارا تیسرا نکتہ یہ ہے کہ ہم بار بار منفی اتحادوں کے گردابوں میں پھنس کر غوطے لگانے کے بعد بے نیل و مرام ساحلوں پر پھینکے جاتے رہے ہیں، ہمارے اتحادوں کا اساسی اصول مثبت انداز چاہتا ہے۔

ہمارا چوتھا نکتہ یہ ہے کہ جہاں ہم اختلاف کو گوارا کرنے کا وسیع ظرف رکھتے ہیں اور جماعت سے خارج شدہ اصحاب کی بھلی بری بات کو سہتے چلے آ رہے ہیں، وہاں ہماری تحریکی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ جن لوگوں نے ہماری تحریک یا اس کے موسس کی مخالفت پست اخلاقی سے کی ہو، یا جنھوں نے ہمیشہ ہمیں نیش زنی کر کے اذیت دی ہو، ان کے ووٹوں کے لیے یا سیٹوں کے لیے یا کسی پاکیزہ مقصد کے لیے کبھی اتحاد نہ کیا جائے۔ ایسے لوگوں کو تحریک کی طرف سے مسترد کر دیا جانا چاہیے۔

ہمارا پانچواں نکتہ یہ ہے کہ پچھلے تجربوں کی روشنی میں سارے اتحادیوں کے لیے لازم ہو کہ وہ ایک امر کا مجلس میں حلف لیں کہ وہ پیٹھ پیچھے کسی بھی دوسری جماعت کی برائی یا تحقیر نہیں کریں گے۔

بعدازاں صرف ایسے ہنگامی اتحاد رہ جاتے ہیں جیسے محلے میں آگ لگ جانے پر یا بستیوں میں سیلاب کا پانی گھس آنے پر، یا زلزلے کی کسی تباہی کی صورت میں بہت سارے لوگوں کے مل کر کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے میں کافر و مسلم تک کو اکٹھے کرنا ہوتا ہے، لیکن یہ صرف متحدہ عملی سرگرمی ہوتی ہے، سوچا سمجھا اصول اتحاد نہیں ہوتا کہ جس کے تحت مل کر دینی، سیاسی، معاشرتی قسم کا کام کرنا ہو اس کا حکم الگ ہے۔

اسلامی نظام جماعت میں تبدیلیِ امارت

ریلوے کے ایک ڈویژن کا کسی اسٹیشن پر خاتمہ ہوتا ہے اور وہاں سے نیا ڈویژن شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں عملہ تبدیل ہوتا ہے___ بعض اوقات انجن بھی۔ بڑی تبدیلی ریل کے گارڈ کی تبدیلی ہوتی ہے۔ پیچھے سے کئی گھنٹے کی ڈیوٹی دے کر آنے والا گارڈ بڑی خوش وخرم حالت میں نئے آنے والے تازہ دم گارڈ کو سرخ سبز جھنڈیوں، بتّی، سیٹی اور چابیوں کے علاوہ کاغذات کا چارج دیتا ہے اور سلام کہہ کر اس طرح باہر کو لپکتا ہے "جیسے کہ جان بچی اور لاکھوں پائے" اور نئے گارڈ کے انتظام میں گاڑی اپنے مقررہ وقت پر، مقررہ راستے اور رُخ پر اور اپنی مقررہ منزل کی جانب روانہ ہو جاتی ہے۔

نہ جانے والے گارڈ کو کوئی صدمہ کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے یا وہ سوچے کہ کسی کو جرأت کیوں ہوئی کہ مجھ سے چارج لے، میں اس سے سمجھوں گا۔ نہ آنے والے گارڈ میں کوئی شائبۂ فخر کہ بڑا مرتبۂ کمال ہاتھ آیا۔ نہ جانے والے سے اظہارِ افسوس کرنے والوں کا کوئی ہجوم، نہ آنے والے کے لیے تحسین وتبریک کے نعرے۔ نہ مسافروں میں کوئی ہل چل، نہ کسی طرح کوئی مظاہرہ، نہ کوئی جلوس، نہ اخباری بیان بازی، نہ تصویریں اٹھا اٹھا کر کسی کی حمایت اور نہ کسی کی مخالفت۔

مگر سیاست میں اس طرح ڈیوٹی بدلی (Changing of Guard) نہیں ہوتی۔ حکومت کی وزارتیں ہوں یا انتظامی عہدے یا پارٹیوں کی لیڈرشپ یا انتخابات میں منصبِ نمائندگی کا حصول۔ بڑی سازشیں ہوتی ہیں، جوڑ توڑ ہوتے ہیں۔ لپاڈگی تک بھی نوبت پہنچتی ہے۔ اخباروں کے صفحات عہدہ طلبوں کی خبروں سے بھر جاتے ہیں۔

جماعتی عہدوں کے لیے ہمارا طریقِ انتخاب

سیاست کے اس گندے کھیل کی مغربی روایات کو توڑ کر نیا دردبست اسلامی اصولوں پر استوار کرنے کا تجربہ جماعتِ اسلامی نے شروع کیا۔ اور دوسرے مختلف پُر افادیت نظائر کے علاوہ جماعتی عہدوں کے انتخاب میں ایسا طرز اختیار کیا کہ نہایت صاف ستھری، صحت منداور مثبت فضا پیدا ہوگئی۔

حال میں مرکزی امارت کے انتخابات ہوئے، کوئی امیدوار نہ بنا، کسی نے پروپیگنڈہ نہ کیا، کوئی لٹریچر کسی کی حمایت ومخالفت میں شائع نہ ہوا، کوئی جھنڈے نہیں، تصویریں نہیں۔ مجلسِ شوریٰ نے تین نام ارکانِ جماعت کے سامنے رکھ دیئے کہ چاہیں تو ان میں سے کسی کو ووٹ دیں اور چاہیں تو کسی بھی دوسرے شخص کو ووٹ دے سکتے ہیں۔ اس انتخاب کے موقع پر چوں کہ ہمارے بزرگ رہنما میاں طفیل محمد صاحب نے اپنی صحت کی بنا پر تمام ارکانِ جماعت کو خط لکھ کر ان سے درخواست کی تھی کہ مجھے معذور سمجھا جائے، اب میں امارت کی ذمہ داری کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ لہٰذا ان کی صدق دلانہ اپیل کی وجہ سے ان کو ارکان نے ''بارِ امانت'' اٹھانے پر مجبور نہیں کیا۔ اس طرح میاں صاحب نے ایک روشن مثال قائم کردی کہ جماعت میں پُرزور حامیانہ فضا کے موجود ہوتے ہوئے انھوں نے ''کرسی'' کے ساتھ تادم آخر چمٹے رہنا پسند نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ میاں صاحب کا یہ عالی ظرفانہ رویہ حکومت اور پارٹیوں کے عہدیداروں کے لیے اپنے اندر موٴثر سبق رکھتا ہے۔

مجلسِ شوریٰ کے مقرر کردہ ناظم انتخاب (برائے امارت ۱۹۸۷ء) نے ہر رُکن کو پرچہ رائے دہی بھجوایا جسے پُر کر کے واپس کردیا گیا۔ ناظم انتخاب نے دو ارکانِ شوریٰ کی موجودگی میں ووٹوں کی گنتی کی اور مقررہ تاریخ تک نتیجے کا اعلان کردیا۔ جماعت کے اکثریتی ووٹ قاضی حسین احمد صاحب کے حق میں آئے اور وہ پانچ سال کے لیے جماعت کے امیر قرار پائے۔ حلف برداری کی تقریب ۶ رنومبر ۱۹۸۷ء کو منعقد ہوئی۔ اور نیا دورِ امارت باضابطہ طور پر شروع ہوگیا۔

آج جب کہ تحریکِ اسلامی کے گارڈ بدل گئے ہیں، گاڑی اپنے وقت پر اور اپنے راستے پر، طے شدہ منزل کی طرف ایسے جارہی ہے کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی تاریخی واقعہ پیش آیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ رحمت و سعادت اور خلفائے راشدین کے عہدِ خیر و برکت میں یہی صورت تھی۔ جو شخص موزوں تر ہوا، عوام نے اس کی بیعت کی اور دینی اصولوں کے مطابق سیاست و معیشت کا سارا نظام بہ خوبی چلتا رہا۔ کبھی کوئی مخالفانہ مظاہرہ نہیں ہوا، نہ کوئی جلوس نکلا، نہ واہیات نعرے گونجے، نہ کوئی کھُسر پھُسر ہوئی۔ سچی اسلامی جمہوریت کا منشا ہی یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً جزوی یا جامع تبدیلی کو تو آنا ہی ہوتا ہے۔ مگر وہ آئے تو پُرامن طریق سے آئے، آراء اور دلائل کے بل پر آئے۔ مسکراتی فضا میں آئے، رواداری کی شان اور اتحاد و یگانگت کا رنگ لے کر آئے۔

جب تک مسلم معاشرہ سیاسی امن واخوت پر عاملِ رہا اُسے یہ نعمت حاصل رہی۔ جب اہلیت ختم ہوگئی تو بادشاہت نے تخت بچھا لیے اور ظلم کے کوڑے حرکت میں آ گئے۔

سمع وطاعت کے لیے ہماری تربیت

ہم لوگوں کی تربیت قرآن وحدیث کے سایۂ مبارک میں ہوئی اور ہمارا ذوقِ اجتماعیت اس طرح کا بنا ہے کہ ہم ہر اس شخص کے ساتھ (بلاکسی نزاع کے) دلی تعاون کرتے ہیں جو دینی (اور دستوری) لحاظ سے جائز طور پر صاحبِ امر قرار پائے۔ کوئی سوال نسب کا، علاقے کا، مالی حیثیت کا اور دوسرے ظاہری مؤثرات کا نہیں ہے۔ اور ہم لوگوں کی تربیت یوں بھی ہوئی ہے کہ اپنے سابق امراء یا عہدیداروں اور غیر عہدیدار بزرگوں اور اہل علم اور اصحابِ خدمات و کردار کا ادب واحترام پوری طرح ملحوظ رکھتے ہیں۔

ہماری تربیت ایسی ہے کہ ہم اپنے امیر اور قائدین کے لیے بڑی محبت اور خیر خواہی رکھتے ہیں لیکن نہ کسی عہدے کی پرستش کرتے ہیں اور نہ اپنا کوئی مفاد حاصل کرنے یا ''نمبر بنانے'' کے لیے ان کے گرد طواف کرنا اور خوشامدی ذہنیت سے کام لینا درست سمجھتے ہیں۔ بس جو رشتہ ہے وہ محبتِ خدا اور رسولؐ اور قانونِ خدا اور رسولؐ کے تحت ہے۔

اسلام میں اہلِ امر کا معیار

حدیث کی رُو سے اسلامی نظامِ جماعت (و نظامِ معاشرہ) کے اہلِ امر کے معیار کا

ایک اہم پہلو یہ ہے کہ: تُحِبُّوْ نَهُمْ وَيُحِبُّوْ نَكُمْ وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ (مسلم) یعنی تم ان سے محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں، تم ان کے لیے دعائے رحمت کرو اور وہ تمھارے لیے دعائے رحمت کریں۔

یہ ہے اسلامی جمہوریت کی طرف سے قیادت کا دیا ہوا معیار۔ اس کے برخلاف آج اربابِ قیادت چاہے پھولوں کی سیجوں پر بیٹھے ہوں، ان کے چاروں طرف بدگمانی، بدگوئی، سبّ وشتم اور بُرے بُرے چرچوں بلکہ مظاہروں تک کے نکیلے کانٹے پھیلے رہتے ہیں۔ آج کل نظامِ قیادت پورے معاشرے کو نہ صرف سیاسی لحاظ سے بلکہ عام فضا کے لحاظ سے گندہ کر دیتا ہے۔

سچے مسلم معاشرے میں امارت کے معنی ایک بھاری بارِ امانت کو اٹھانے کے ہیں جو خدا کی طرف سے بھی امانت اور اس کے بندوں کی طرف سے بھی امانت ہے اور اس امانت کی آخرت میں سخت جواب دہی کا احساس۔

کسی امیر یا صاحبِ منصب سے پوچھا جا سکتا ہے کہ تم نے قرآن وحدیث سے فلاں مفہوم کس دلیل سے اخذ کیا اور لوگوں کو ایسا اور ایسا حکم کیوں دیا۔ لوگوں میں اگر اختلاف پھیلا اگر ان کا اتحادِ فکر ونظر خراب ہوا۔ اگر ان کو صحیح جادۂ اقدام کے متعلق مغالطے لاحق ہو گئے یا وہ ڈھیلے پڑ گئے، جمود میں مبتلا ہوئے یا مایوسی کا شکار ہونے لگے تو ان سارے نقصانات میں تمھارے طرزِ عمل کا کیا حصہ ہے وھلّم جراً۔

منصبِ قیادت کا تقدس

اسلامی تصورامارت وقیادت میں تقدس کے ساتھ جو ذمہ داری پائی جاتی ہے اس کا اندازہ دو مختصر احادیث کے اقتباسات سے کیجیے:

۱- حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کسی منصب کی درخواست کی تو حضوؐر نے فرمایا: اے ابوذر! تم کم زور ہو اور یہ مناصب (بھاری) امانت ہیں اور یہ قیامت کے دن سخت رسوائی کا باعث ہوں گے۔ بجز اُن لوگوں کے جو انھیں بنائے حق پر قبول کریں اور ان کے تحت جو ذمہ داریاں ان پر آتی ہیں ان کو پوری طرح ادا کریں۔

۲- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا

کہ تم لوگ حصولِ امارت وقیادت کی حرص کرو گے اور قیامت کے دن یہ تمہارے لیے ندامت کا باعث ہوں گے۔

ایسی ہی اسلامی امارت وقیادت کے لیے طاعت فی المعروف کا بھی شدید حکم ہے۔

اِن روایات پر نظر جاتی ہے تو آدمی لرز اٹھتا ہے کہ امارت وقیادت کے ثواب کے زیادہ ہونے کے ساتھ اس کا حساب کتاب کتنا سخت ہے۔ مثلاً حضرت سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے خیمے میں داخل ہوئے تو خادمہ نے (جسے بعد میں آزاد کر دیا گیا) اُن کے بُشرے کو دیکھ کر کہا: ''آپ شاید متردد ہیں؟'' بولے ''یہ تشویش ناک بات ہے ہی، مشرق ومغرب میں امت محمدؐیہ کا کوئی فرد ایسا نہیں ہے جس کا مجھ پر حق نہ ہو اور بغیر مطالبہ واطلاع اس کا ادا کرنا فرض نہ ہو۔''(۱)

پھر کام اس انہماک سے کیا کہ ان کی مشغولیت کو دیکھ کر بعض لوگ ترس کھاتے تھے۔(۲)

ایک غیر اسلامی تصورِ قیادت

اس موقع پر میں دورِ جدید کے اس غیر اسلامی تصورِ قیادت کی تردید کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں، جس کے لیے نوجوان قیادت کا ایک سلوگن ہر طرف پھیلا ہوا ہے، اسلام نے شعور صرف صالح قیادت کا دیا ہے۔ اور اس میں اچھے جسمانی قویٰ کے ساتھ علمی برتری کو ضروری قرار دیا ہے (وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ)۔(۳) واضح رہے کہ ''علم'' جس کا غالب پہلو علم حق اور علم ہدایت ہے کو کفار کے خلاف مسلمانوں کے غلبے کا ایک سبب بھی قرار دیا گیا ہے۔

اسی طرح خداوند تعالیٰ کی طرف سے کسی قوم یا انسانوں کو جو قیادت تفویض کی جاتی ہے اس کے لیے بھی معیار یہ ہے کہ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (القصص: ۱۴) ''پھر جب وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کے اعتبار سے تکمیل کو پہنچ گیا اور توازن واعتدال سے آراستہ ہو گیا۔'' حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً (الاحقاف: ۱۵) اس آیت میں اوسط زمانۂ تکمیل کا

(۱) سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ۔ از مولانا عبدالسلام ندوی ص: ۲۲

(۲) سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ۔ از مولانا عبدالسلام ندوی ص: ۱۵۰

(۳) پوری آیت: قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ''کہا خدا نے ان کو تمہاری سرداری کے لیے چن لیا ہے اور علم اور جسم کے لحاظ سے بڑائی دی ہے۔'' (البقرۃ: ۲۴۷)

خطِ ابتداء بھی معلوم ہوگیا اور وہ ہے چالیس سال۔[1] اس عمر میں قوتیں، عادات، ذوق، رجحانات، ساری چیزیں ایک معیار کو پہنچ جاتی ہیں۔ پھر آگے دس بیس سال تک ان میں نشو ونما ہوتی رہتی ہے۔ اس سلسلے میں سورۂ یونس کی آیت ۱۶ کے یہ الفاظ بھی بڑے اہم ہیں، جو حضورؐ کی زبان سے مخالفینِ اسلام کے سامنے ادا ہوئے: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾ یعنی مجھ پر اعتراض کرنے سے پہلے یہ سوچو کہ ”میں تمہارے درمیان ایک بڑا دورِ عمر گزار چکا ہوں پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ؟“

مراد یہ ہے کہ امارت و قیادت کے لیے صرف ایسے لوگ موزوں ہوسکتے ہیں جو کسی معاشرے میں ایک وقیع دورِ عمر گزار چکے ہوں اور اس دوران میں ان کے خیالات، ان کے جذبات، ان کے ذوق و شوق، ان کی تمنائیں، ان کے دوست احباب، ان کے مشاغل سب سامنے آچکے ہوں اور لوگ ان کے متعلق ایک ٹھوس رائے قائم کرنے کے قابل ہوں۔

مغربی تہذیب کا یہ دور چوں کہ جدّت طرازیوں کا زمانہ ہے۔ اس لیے نئے نئے شوشے پہلے دور پار سے اٹھتے ہیں۔ پھر وہ ہمارے معاشرے میں داخل ہوجاتے ہیں۔ پھر وہ خود ہم جیسے محبانِ دین کو بھی پسند آنے لگتے ہیں، جن کا اپنا نظامِ معیار و اقدار ہے۔

نوجوان قیادت کے تجربے

دیکھ لیجیے، اس دور میں جہاں کہیں نوجوان قیادت کا تجربہ ہوا اور جہاں بھی معاملات نوعمروں کے ہاتھ میں آئے ہیں وہاں حالات ابتر ہوگئے ہیں۔ مثلاً انڈیا کی نوجوان قیادت کا حالِ زار دیکھ لیجیے اور اس کے اثرات جو قوم پر پڑ رہے ہیں وہ بھی بغور ملاحظہ کیجیے۔ فلپائن میں اکینو کے تجربے کو دیکھیے اور اسی طرح تاریخِ ماضی و حال میں اور بھی نمونے زیرِ نظر لائیے۔ ایک

---

(۱) یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص جو چالیس سال کی عمر گزار لے وہ قیادت کا اہل ہو جائے۔ دار ومدار قوتوں اور صلاحیتوں کی معیاری نشو ونما اور ذہنی توازن و اعتدال پر ہے، جن کے ساتھ علم اور حکم کی ذمہ داریاں چل سکتی ہیں۔ شاذ صورتوں میں تھوڑی بہت کمی بھی کی جاسکتی ہے جب کہ ۳۶، ۳۸ سال میں علم و کردار کے معیارات ابھر آئیں۔ کیوں کہ آیت میں حد قطعی مذکور نہیں بل کہ صرف گائیڈ لائن دی گئی ہے۔

دور خود پاکستان پر بھی نوجوان قیادت کا گزر رہا ہے۔(۱)

یہ تو خدا کا شکر ہے کہ اسلام ذہنی تربیت ایسی کرتا ہے کہ مسلمان نوجوان کبھی خودسر نہیں ہوتے، محض اپنے بزرگوں کے ظاہری ادب و احترام ہی کا خیال نہیں رکھتے، ان کے علم و تجربہ کا بھی لحاظ کرتے ہیں۔ اور بڑے ان کو جس چیز سے روکیں، اس سے وہ رک جاتے ہیں اور جس چیز کے لیے وہ متوجہ کریں اُسے اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ ہے مسلمان نوجوان کی ساخت۔ اس روش سے ہٹ کر جو نوجوان معاشرے کی یونیورسٹیوں اور اس کے اداروں میں پائے جاتے ہیں، وہ جہاں بھی ہوتے ہیں بھینسوں جتنی موٹی انا اور اپنی ضد اور جدّت طرازی اور بغاوت پسندی کی وجہ سے طرح طرح کے بگاڑ پیدا کر دیتے ہیں۔

ہم پر اللہ کی مہربانی ہے کہ ہمارا جماعتی نظام امارت و قیادت کے انتخاب میں بہت اچھا نقطۂ نظر رکھتا ہے۔

---

(۱) طرفہ منظر ہے کہ روس اور چین تو رہے ایک طرف، برطانیہ اور امریکہ میں قیادت و اقتدار سال خوردہ شخصیتوں کے ہاتھوں میں ہے۔ دوسرے اکثر اہم مغربی ممالک کا حال بھی یہی ہے۔

جماعت اسلامی اور سیاستِ پاکستان

۱۔ جناب جاوید انصاری صاحب، مدیر معاون یونیورسل میسیج کراچی

۲۔ جناب فتحی عثمان چیف ایڈیٹر عربیہ۔ لندن

۳۔ مدیر ترجمان القرآن

ماہنامہ 'عربیہ' کے تازہ شمارے (ماہ ربیع الاوّل ۱۴۰۶ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۵ء) میں جناب جاوید انصاری نے جماعتِ اسلامی کی ایک عامیانہ تصویر پیش کی تھی۔ اس پر جناب فتحی عثمان چیف ایڈیٹر 'عربیہ' نے بطورِ خاص تبصرہ کیا اور جماعت کو انقلابیت سے ہٹ کر 'دعوت' کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی تھی۔ اس سلسلے میں میرے لیے بھی ضروری ہوگیا تھا کہ دونوں تحریروں کا جائزہ لوں اور پھر اظہار رائے کروں۔ چناں چہ یہ بحثِ مثلث پیش خدمت ہے۔

①

جناب جاوید انصاری، مدیر معاون 'میسیج' کراچی

گزشتہ برسوں میں جماعتِ اسلامی پاکستان، تنقید و تذلیل کی کئی مہموں کا موضوع رہی ہے۔ اس مضمون کا مقصد ان نکتہ چینیوں کا جائزہ لینا اور ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۵ء تک کے کٹھن دور میں جماعت کی پالیسیوں کا معقول اور متوازن دفاع کرنا ہے۔

مسٹر بھٹو نے جس جمہوریت کو چلتا کر دیا تھا اُس کی بحالی کے لیے جماعت پیش پیش

نوٹ: ذہنی تربیت کے سلسلے میں یہ ایک ایسی اہم بحث ہے جس میں جماعتِ اسلامی کے متعلق سیاسی اور دعوتی دونوں حوالوں سے تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ میں نے اس مضمون کو اپنے سیاسی مضامین کے ساتھ شامل کرنے کے بجائے اس مجموعہ میں پیش کرنا بہتر سمجھا۔

تھی۔ مگر اس تحریک میں شامل چند بے صبر عناصر جلد ہی الگ ہو گئے اور فوج کو پاکستان کی قومی سیاسی زندگی پر قبضہ مستحکم کر لینے دیا گیا۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۹ء تک کے عرصے میں تحریک میں شامل جماعتوں نے بالعموم فوج سے مفاہمانہ رویہ اختیار کیے رکھا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ نئی فوجی انتظامیہ نے وہ خطیبانہ سیاسی نعرہ اپنایا جو بہت دل کش تھا۔ جنرل ضیاء نے پاکستان میں اسلامی سیاسی نظام قائم کرنے کا وعدہ کیا۔ انھوں نے علامتی اصلاحات اور معاشی پالیسیاں نافذ کیں، جن کا مثبت اثر ہوا اور انھوں نے جلد ہی نمائندہ حکومت بحال کرنے کا بھی وعدہ کیا۔

اگست ۱۹۷۸ء میں جو سول انتظامیہ قائم کی گئی اس میں دو مقاصد کے پیشِ نظر جماعت بھی شامل ہو گئی: اوّلاً وہ اس طریق پر حاوی ہو جانا چاہتی تھی جو پارلیمانی جمہوریت پر منتج ہو۔ ثانیاً وہ ایسی قومی پالیسی اور اصلاحات بہ روئے کار لانا چاہتی تھی جو پاکستان میں اسلامی نظامِ معاشرت تعمیر کرنے کی راہ ہموار کر سکیں۔

نو ماہ کا وہ عرصہ جب جماعت حکومت میں شامل تھی، نہایت مایوس کُن ثابت ہوا۔ ہم میں سے جو صاحبان وزارتوں میں آئے وہ جنرل ضیاء اور اس کے فوجی حلیفوں کے اصل عزائم سے باخبر ہو گئے۔ یہ واضح ہو گیا کہ فوجی حکومت معاشرے کو اسلامی بنانے سے کوئی دل چسپی نہیں رکھتی۔ اُس کا تو مقصد اسلام کو اسی طرح استعمال کرنا تھا جیسے بھٹو سوشلزم کو اور فیلڈ مارشل ایوب خاں قومیت کو استعمال کر رہے تھے۔ یوں اسلامی بنانا محض معاشرے کو سیاست سے الگ رکھنے اور فوجی آمریت کو دوام بخشنے کا ایک ذریعہ تھا۔ جماعت کی وزارتوں نے ۱۹۷۸ء سے ۱۹۷۹ء تک کے عرصے میں جو پالیسیاں تجویز کیں اُن کی بڑی اکثریت کو صدر اور اس کے مشیروں نے مسترد کر دیا۔

۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۴ء تک جماعت فوجی انتظامیہ کی پالیسیوں کی کڑی مخالف رہی۔ ان پالیسیوں کے کھلے تضادات سے جماعت کی قیادت کو تشویش تھی تاہم بعض رفقاء کی دلیل یہ تھی کہ صدر خود تو ایک مخلص مسلمان ہے مگر سول انتظامیہ اس کی پالیسیوں کو ناکام بنائے دے رہی ہے۔ اس طرح ضرورت تھی کہ جس اسلامی فکر کی نمائندگی کا صدر کو دعویٰ تھا اُس کی تائید کی جائے اور ان پالیسیوں کے نفاذ کے لیے ایسے ادارے اور طریقے وضع کیے جائیں جو نوکر شاہی کو قابو میں رکھیں۔

ارکانِ جماعت کی بھاری اکثریت نے اس حکمتِ عملی کی توثیق کردی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدر ضیاء کو اس سال قومی استصواب میں جماعت کی حمایت حاصل رہی۔ اس استصواب سے حکومت کے 'اسلامیانے' کے لیے کیے جانے والے اقدامات کی توثیق مطلوب تھی مگر استصواب سے کچھ ہی قبل جنرل ضیاء نے ایک ٹیلی ویژن نشریے میں کہا کہ اس توثیق کا مطلب وہ یہ لیں گے کہ انھیں مزید پانچ سال تک پاکستان کے صدر بنے رہنے کا پروانہ مل گیا۔ جماعت جنرل ضیاء کی حمایت پر رضامند ہوگئی، کیوں کہ امیرِ جماعت میاں طفیل محمد سے ایک ملاقات میں صدر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ شریعت کو ملک کا بالادست قانون بنائیں گے۔ ۱۹۷۳ء کا دستور تمام وکمال بحال کرادیں گے اور غیر مشروط طور پر مارشل لاء اٹھالیں گے۔

جماعت کے جو رہنما ۱۹۷۸ء تا ۱۹۷۹ء سول انتظامیہ میں وزیر رہ چکے تھے انھیں صدر کی وعدہ خلافی پر کوئی تعجب نہ ہوا۔ وہ چھ سال پہلے ہی جان گئے تھے کہ فوجی قیادت افسر شاہی کے اختیارات گھٹانے یا عوامی نمائندگی کے لیے اسباب پیدا کرنے کا، جس سے افسروں کو قابو میں رکھا جاسکے، کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ ان رہنماؤں کا کہنا تھا کہ جماعت حکومت کی نافذ کردہ 'نفاذِ اسلام کی اسکیم' کا پول کھول دے اور عوام کو بتادیا جائے کہ یہ محض پاکستان پر فوجی آمریت جاری رکھنے کا ایک پردہ ہے۔

وسط ۱۹۸۵ء میں جماعت نے فیصلہ کیا کہ قومی اور تمام صوبائی اسمبلیوں میں حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرے، نیز اُس نے اس کے لیے بھی مساعی تیز کردیں کہ ایک وسیع البنیاد سیاسی پروگرام پر مبنی قومی اتحاد قائم کرے۔ اس پروگرام کے کلیدی عناصر یہ ہیں:

★ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تمام وکمال بحالی اور پاکستان میں اسلامی جمہوریت کا قیام۔
★ پاکستان کی قومی سالمیت کا تحفظ اور ۱۹۷۳ء کے دستور کے عطا کردہ چھوٹے صوبوں کے حقوق کی بحالی۔
★ جہادِ افغانستان کی حمایت جاری رکھنا۔

جماعت کو فوجی حکومت سے تعاون پر بھی ہدف نکتہ چینی بنایا گیا ہے اور اس کی مخالفت کے لیے ایک قومی سیاسی اتحاد قائم کرنے کی کوشش پر بھی۔ میرا یہ منشا نہیں کہ ان میں سے کسی حکمتِ عملی کا دفاع کروں، میں جس نکتے پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلامی اقدار اور اسلامی

نظریۂ سیاسی کے تناظر میں یہ دونوں حکمتیں بالکل جائز ہیں۔ کسی ایک سیاسی تدبیر کا انتخاب سیاسی طور پر مہنگا، بلکہ شاید بہت ہی مہنگا پڑسکتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ بطور ایک اسلامی انقلابی جماعت کے، جماعتِ اسلامی کے لیے یہ جائز نہیں۔

ایک اسلامی انقلابی پارٹی ہوتے ہوئے جماعت سے وقتاً فوقتاً سیاسی غلطیاں بھی ہوسکتی ہیں۔ جماعت نے اپنے ارکان اور کارکنوں کی اخلاقی و روحانی تربیت پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ کچھ کارکنوں میں دنیا کی طرف میلان پیدا ہو چکا ہے اور اسلامی کام سے اُن کا رویہ پیشہ ورانہ سا بن گیا ہے۔ اس کا نتیجہ پارٹی ڈسپلن ڈھیلا پڑ جانے اور پاکستانی معاشرے پر جماعت کے کام کا اخلاقی اثر ہلکا ہو جانے کی صورت میں رُونما ہوا ہے۔

۱۹۷۷ء کی تحریک میں جو فوائد حاصل ہوئے تھے، جماعت انھیں اختیار کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ مزید برآں انتخابی سیاست پر زیادہ توجہ دینے کے باعث سماجی اور تعلیمی کام، جو جماعت نے اپنے ذمے لے رکھے تھے، اُن کی طرف سے بے اعتنائی برتی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان کے شہروں اور قصبوں میں عوامی بنیاد قائم کر لینے کے بہت سے مواقع جماعت نے کھو دیے۔ سب سے بڑھ کر یہ امر نقصان دہ ہوا کہ انقلابی نظریے کے فروغ کی طرف ناکافی توجہ دی گئی۔ بہت سے پالیسی اقدامات بیرونی محرکات کے فوری (Adhoc) تقاضوں کے تحت عمل میں آئے۔

جماعت کو شدید خطرے کا سامنا ہے کہ اس کی نگاہوں سے اسلامی معاشرے کی تشکیل کے عمل کا مربوط منظر اوجھل نہ ہو جائے اور وہ اس عمل کو دوسروں کے سامنے آشکارا کرنے کی صلاحیت کے لحاظ سے کوتاہ ثابت ہو۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر عملیت اور تجربیت ہی پارٹی کے بنیادی اصول بن کر رہ جائیں گے۔

جماعت کو جو ناکامیاں ہوئی اُن کی وجہ سے کتنے ہی رفقاء کو مایوسی ہوئی اور کچھ جماعت سے نکل بھی گئے، مگر انھیں پاکستان کی لادینی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل کوئی اور پلیٹ فارم تیار کرنے میں ناکامی ہوئی، بلکہ اکثر نے تو یہ کوشش ہی نہیں کی۔ جماعتِ اسلامی ہی ملک میں وہ تنہا سیاسی اور سماجی قوت ہے جو پاکستان میں ایک اسلامی معاشرہ تشکیل دینے کے لیے پائیدار تحریک چلانے کی اہل ہے۔ یہ اس لیے کہ مولانا مودودیؒ کا پیش کردہ انقلابی نظریہ قطعی

درست ہے اور آج کی مسلم دنیا میں نظریاتی اور سماجی حالات میں انتہائی موزوں بیٹھتا ہے۔ اس کا خلاصہ ذیل کے قضیوں میں سمیٹا جاسکتا ہے:

- نو آبادیاتی استعمار کے تحت مسلم معاشرے میں باقاعدہ طبقہ بندی (Institutionalising) نمایاں ہے جو حکمران گروہ کی سماجی علیحدگی پسندی میں نظر آتا ہے اور یہ طبقہ اصلاً بیرونی استعمار کی حمایت کے بل پر سیاسی اقتدار پر قابض ہے۔
- ان معاشروں کے اسلامی کردار کی بحالی کا تقاضا ہے کہ ان زبردستی کے سیاسی دھرماتماؤں کو بے دخل اور منتشر کر دیا جائے اور منظّم مسلم طاقتوں کے ہاتھ میں سیاسی اقتدار مستحکم کر دیا جائے۔
- مسلم ممالک میں اسلامی معاشرہ تعمیر کرنے کا واحد پائیدار آلہ ایک اسلامی انقلابی جماعت ہی ہوسکتی ہے۔ ایسی پارٹیاں اپنے سماجی اثرات کو سیاسی اقتدار میں بدل دینے ہی سے غرض رکھیں، نہ کہ جزئی اصلاحات سے۔

یہ امر کہ جماعتِ اسلامی ایک اسلامی انقلابی پارٹی ہے، دو باتوں سے ظاہر ہے۔ قیامِ پاکستان ہی سے یہ جماعت پاکستانی سیاست میں فعال رہی ہے۔ وہ جزئی اصلاحات پر کبھی مطمئن نہیں ہوئی، بلکہ اپنی تمام سرگرمیاں پاکستان میں اسلامی اصولِ سیاست و مدنیت کی تعمیر کے بنیادی کام میں صرف کرتی رہی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں، ۱۹۶۳ء میں، ۱۹۷۱ء میں، اور ۱۹۷۷ء میں پاکستان کا اسلامی تشخص منوانے اور جمہوریت بحال کرانے والی تمام قومی تحریکوں میں مرکزی کردار جماعت ہی کا رہا ہے۔ ۱۹۸۲ء سے ایم۔ آر۔ ڈی کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ پاکستان میں بحالیٔ جمہوریت کی قومی تحریک، جماعت کی فعّال شرکت کے بغیر نہیں چل سکتی۔ آج جماعتِ اسلامی ہی پاکستان کی وہ واحد قومی جماعت ہے جو ایسی کوئی قومی تحریک منظّم کر سکتی ہے جو عزم و فداکاری کی عملی طاقت بھی رکھتی ہو اور ایسی قیادت بھی جو ملک کے قومی اور اسلامی مفادات کو ذاتی مفاد پر فوقیت دینے کی اہل ہو۔

قربانیاں دینے کی اعلیٰ صلاحیت رکھنا جماعت کی قیادت کا ہمیشہ سے نمایاں وصف رہا ہے۔ قیادت کے اندر پالیسی کے مسائل پر اختلافات نے جماعت کو ہمیشہ تقویت ہی بخشی ہے۔ گزشتہ سالوں میں میاں طفیل محمد اور پروفیسر غفور احمد کے مابین پالیسی تناظروں میں اختلافات پر بہت سے ہم دردوں کو تشویش ہوئی۔ بعض مخالفین نے اس پر خوش ہو کر جماعت کی یقینی شکست و

ریخت کی پیش گوئیاں بھی کیں۔ مگر جماعت کے اندران میں سے کسی رہنما نے بھی مایوسی ظاہر نہ کی۔ میاں طفیل محمد ایک نہایت محبوب امیر ہیں جنھوں نے ارکان کے لیے بلند اخلاق کا نمونہ قائم کیا ہے اور پروفیسر غفور احمد کی سیاسی بصیرت کا بھی وسیع احترام کیا جاتا ہے اور جماعت کا سیاسی کردار دوبالا کرنے میں اُن کا کام نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جماعت ہمیشہ جمہوری تنظیم پر کام کرتی ہے اور جب تک انفرادی قربانیاں اور اللہ کی رضا کے لیے کام کرتے رہنے کا عزم باقی رہے گا سیاسی تناظروں میں اختلافات جماعت کی تقویت ہی کا باعث بنتے رہیں گے۔ یہ اختلافات جماعت کی اندرونی زندگی میں جمہوری کردار کے مظہر ہیں۔ ان سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ جماعتی قیادت اختلافی سیاسی پسند و ناپسند سے باخبر ہے اور اپنی قومی حکمت عملی میں لچک کا عنصر شاملِ کر لینے کی اہل بھی ہے۔

پاکستان کے علم بردارانِ اسلام کو جماعت کے قریب تر آنا چاہیے۔ پاکستان کی قومی سالمیت برقرار رکھنے اور اس کا اسلامی کردار منوانے کے لیے یہ ایک اہم قوت کی نمائندگی کرتی ہے۔ ماضی میں اس نے سیاسی غلطیاں بھی کی ہوں گی، مگر بہ طور ایک اسلامی انقلابی جماعت کے، یہ تعمیری تنقید کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور ماحول کے تغیرات سے ہم آہنگ ہو جانے کی اہلیت کا ثبوت بھی دے چکی ہے۔ پاکستان کو اسلامی انقلابی خطوط پر چلا کر بدل ڈالنے کا اس کے سوا اور کوئی سیاسی ادارہ موجود نہیں ہے۔ جماعت پاکستان کا مستقبل بنانے میں اہم کردار ادا کیا چاہتی ہے۔ پاکستان کے اسلامی انقلابیوں کا، جو اس جماعت کی حمایت کر کے اور اس کی قیادت کے گرد جمع ہو کر بے یار و مددگار رہ جانے سے بچ سکتے ہیں، یہی قدرتی ملجا و ماویٰ ہے۔

(ترجمہ: پروفیسر آسی ضیائی، رام پوری)

---

(۲)

جناب فتحی عثمان، چیف ایڈیٹر 'عربیا' لندن

یہاں میں اپنی اس تحریر کی یاد تازہ کر رہا ہوں جو میں نے ڈاکٹر جاوید کے خط (عربیا جون ۱۹۸۵ء) میں لکھی تھی۔ میں اب بھی اس یقین پر قائم ہوں کہ مسلم انقلابی (Revolutionary Islamist) یا اسلامی انقلابی (Islamic Revolutionary) کی اصطلاح ان لوگوں کو نہیں سجتی

جو اسلام کے پیغام کو جامعیت اور اس کی امتیازی شان کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام کا دارومدار پیغامِ الٰہی کی حیثیت سے دعوت پر ہے اور اس کے مخاطب تمام لوگ ہیں، ظالم بھی اور مظلوم بھی۔ وہ ان کے دلوں اور دماغوں کو روشن اور پرزور دلائل اور موٴثر کردار کے ذریعے خدا کی طرف موڑنا چاہتا ہے:

''اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔'' (النحل: ۱۲۵)

یہاں تک کہ خدا کے رسول، موسیٰ اور ہارون علیہما السلام جو ایک جابر حکمراں فرعون کی طرف بھیجے گئے، انھیں بھی ہدایت کی گئی کہ وہ اسے خدا کا پیغام جس قدر ممکن ہو قابلِ قبول طریقے سے پہنچائیں:

''جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ نرمی سے بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرلے یا ڈر جائے۔'' (طٰہٰ: ۴۳، ۴۴)

ایمان والوں کو تو اپنا اور اپنے عقیدے کا دفاع کرنا ہی ہے جب کہ اربابِ اقتدار بھی ہمیشہ ان کو دباتے اور ان کے پیغام کو خاموش کرنے کے لیے قوت کا استعمال کرتے ہیں۔ میرے نزدیک تصادم کی پالیسی سے اسلام کے حق میں بہتر نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ کسی بھی گروہ کو اس وقت تک دشمن تصور کرنا درست نہیں جب تک دشمنی ایک ٹھوس حقیقت نہ بن جائے۔ مختلف گروہوں کے متضاد مفادات کا حل بنیادی طور پر ایک خدا پر یقین رکھنے میں ہے۔ اس نوع کے باہمی نزاعات کو حل کرنے کے لیے خدائی تعلیمات و قوانین کی مکمل اطاعت ضروری ہے اگر کوئی صاحبِ ثروت شخص آسائشِ زندگی کے میسر سامان اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے تو اسے محض اس بات پر اسلام کا انکار کرنے والا تصور نہیں کر لینا چاہیے، کیوں کہ خدائی پیغام کے اوصاف اور بنی آدم کو خدا کے عطا کردہ روحانی اور علم و دانش پر مبنی کمالات بسا اوقات انقلاب آفریں اور بنیادی تبدیلی کے سبب بن جاتے ہیں۔ دعوت کی حکمت عملی میں اہل ایمان کو جمع کرنا اور منظّم کرنا زیادہ اہم اور فائق ہے۔

''اور اس شخص سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی

سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی، وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں۔''
(حٰمٓ السجدہ: ۳۴-۳۵)

''اے نبیؐ! برائی کو اس طریقے سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ جو کچھ باتیں وہ تم پر بناتے ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہیں۔'' (المؤمنون: ۹۶)

یہ عین ممکن ہے کہ اسلامی تحریک کے کچھ لوگ معاشرے کی اساسی تبدیلی کا اسلامی تعلیمات پر مبنی تصور مؤثر، واضح، قابلِ عمل اور موزوں انداز میں پیش کرنے سے قاصر ہیں، اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس انقلاب کی وہ ترغیب دلاتے اور تبلیغ کرتے ہوں وہ بانجھ اور بنجر نکلے۔ اس اندازِ فکر و عمل کی بنا پر عوام اس کے فوائد سے محروم رہتے ہیں، یہ میرا پختہ ایمان ہے کہ اسلام کے لیے، جو تمام بنی نوعِ انسان کے لیے خدا کا پیغام ہے ''مستقل انقلاب'' کا نعرہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ ایک اسلامی تحریک کے لیے موزوں ترلقب ''مستقل دعوت'' ہے۔ وہ جو معاشرے کی اساسی تبدیلی کے اسلامی پیغام کو پیش کرتی اور اس کی اشاعت کرتی ہے۔ اس کی تشکیل متعدد عوامل سے ہوتی ہے۔ عقل اور اخلاق، انصاف اور امن کی تمام جہتوں میں ــــ روحانی اور مادی، سماجی اور سیاسی، داخلی اور بین الاقوامی ہر شعبے میں۔

''تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔''
(آلِ عمران: ۱۰۴)

''اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہلِ کتاب ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا۔'' (آلِ عمران: ۱۱۰)

کسی بھی نوع کی نزاعی صورت حال میں عقلی استدلال اور پُرامن حل کو ترجیح حاصل ہونی چاہیے۔ قوت کا استعمال صرف اسی صورت میں کیا جاسکتا ہے جب دلیل آزمالی گئی ہو اور ناکامی ہوچکی ہو اور کوئی مخالف قوت مسلسل جارحیت پر تلی ہو۔

''اور اگر اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کرادو۔ پھر اگر ان میں ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔'' (الحجرات:۹-۱۰)

اب جماعتِ اسلامی چاہے تو ڈاکٹر جاوید کی اپنے بارے میں ''ایک انقلابی جماعت'' ہونے کی رائے قبول کرے یا رد کردے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے اپنی اردو تحریروں میں جو لفظ ''انقلاب'' استعمال کیا ہے اور جو عربی تراجم میں بھی موجود ہے، معاشرے میں اساسی تغیر پیدا کرنے والے اسباب کی طرف نہیں بلکہ خود اس ''بنیادی تغیر'' کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پیغامِ الٰہی کی حیثیت سے اسلام کا یہ وصف ہے کہ یہ مطلوبہ تبدیلی کو انسان کی باطنی آمادگی (Conviction) پر تعمیر کرتا ہے اور یہ طاقت ور اور کم زور کو یکساں طور پر مخاطب کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہ ہر بنی آدم کے دل و دماغ کو مخاطب کرتا ہے۔ معاشرے میں بنیادی تغیر، ایسے تغیر کی دعوت دینے والی تحریک میں جمہور کی شرکت اور ان کی مادی اور اخلاقی ضروریات کی تکمیل کو صرف ''انقلابی'' کے ''لیبل'' تک محدود نہیں رکھا جاسکتا۔

ہر اسلامی تحریک کو ان مقاصد تک پہنچنے کے لیے ایسا منصوبہ بنانا چاہیے جس میں موجودہ ماحول اور زمان و مکان کے عملی تقاضوں کا خیال رکھا جائے۔ یہ اہتمام بھی کرلیا جائے کہ یہ اسلامی تعلیمات کی رہنمائی میں ہو مارکسی نقطۂ نظر سے جو چیز انقلابی معیار کے طور پر متعارف کی جاتی ہے ممکن ہے ایسے عملیت (Pragmatism)، تجربیت (Empiricism) یا اصلاح کاری (Reformism) کہہ کر مردود قرار دے دیا جائے، لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے یہ لازماً کوئی شجر ممنوعہ نہیں ہے۔ مفکرین اسلام کی یہ نہایت سنجیدہ ذمہ داری ہے کہ وہ سماجی تبدیلی کے سلسلے میں اسلامی تحریک کو رہنمائی فراہم کریں، نہ کہ یہ میدان مارکسی نظریے کی اجارہ داری کے لیے کھلا چھوڑ دیا جائے۔ فکری خلفشار سے حفاظت اسی طرح ہوسکتی ہے۔

تاہم جماعتِ اسلامی معاصر اسلامی تحریک کا ایک جزو ہے۔ یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ

''عربیبیا'' ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس سے تحریک اور فکر کے میدانوں میں مختلف اسلامی مکاتبِ فکر کو اظہارِ خیال کا موقع مہیا کیا جاسکتا ہے۔ اگر جماعت اسلامی اس سلسلے میں اپنا موقف بیان کرنا ضروری سمجھے تو اس مساعدت کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

(۳)

مدیر ترجمان القرآن، لاہور

میں تہِ دل سے جناب جاوید انصاری اور جناب فتحی عثمان کا شکر گزار ہوں کہ دونوں حضرات نے جماعتِ اسلامی کے متعلق جو کچھ کہنا ضروری سمجھا، نیک نیتی اور خیر خواہی سے کہا۔ اسی بنا پر میرے اندر کوئی تنقیدی ردِّعمل پیدا نہیں ہوا بلکہ استفادہ کا جذبہ غالب رہا۔ رہے کچھ اختلافی پہلو، تو وہ دیکھنے یا سوچنے والوں میں کہاں نہیں ہوتے۔

جناب فتحی عثمان کا وہ شان دار مقالہ بھی میرے سامنے ہے جو ''قیادت و خدماتِ مودودیؒ'' کے عنوان سے ''عربیبیا'' دسمبر ۱۹۸۴ء (ربیع الاوّل ۱۴۰۵ھ) میں شائع ہوا۔ میں ان کی صلاحیتوں ہی کا نہیں، ان کی محنت و کاوش کا بھی معترف ہوں۔

دونوں حضرات کی تحریروں (عربیبیا دسمبر ۱۹۸۵ء مطابق ربیع الاوّل ۱۴۰۶ھ) کے متعلق بعض نکات بہ طورِ وضاحت عرض کرتا ہوں:

۱- جماعتِ اسلامی پاکستان گزشتہ چند برسوں میں جہاں کچھ حلقوں کی طرف سے تنقید و تحقیر کا نشانہ بنائی گئی، وہاں ملک کے سنجیدہ مزاج خواص اور نیک نہاد عوام نے اُسے اِس لحاظ سے تحسین کی نگاہ سے دیکھا کہ دین اور ملک کو خطرات سے بچانے اور بحالیٔ جمہوریت کے لیے فضا کو سازگار بنانے کے لیے اُس نے نہایت درجہ محتاط اور متوازن پالیسی اختیار کی اور تصادم کے محرکات کے موجود ہونے کے باوجود تخریبی عناصر کا چند قدم بھی ساتھ نہیں دیا۔ جو لوگ اُسے تصادم کی راہ پر گھسیٹ لے جانا چاہتے تھے۔ اُنہی نے زچ ہو کر اُسے مارشل لاء کی بی ٹیم قرار دیا اور یہ بات بار بار اچھالی، مگر جماعت طنز و تعریض کی اس بوچھار کے باوجود اپنے سوچے سمجھے موقف پر

مضبوطی سے قائم رہی۔ آج بحالیٔ جمہوریت کی راہ میں اڑنگا لگانے والے عناصر پٹ گئے ہیں اور دعوتِ حق کے لیے کام کرنے کے راستے کھل رہے ہیں۔

۲- جماعت کے لیے حکومت میں شمولیت کی تین سہ ماہیاں اس لحاظ سے مایوس کُن یقیناً ثابت ہوئیں کہ جس مقدار و معیار کا کام کرنا مطلوب تھا وہ نہ ہوسکا، مگر دوسری طرف بہت سے دائروں میں ایسی تبدیلیاں خاص اُس دور میں تیزی سے شروع ہوئیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابلِ قدر تھیں۔

۳- مارشل لا یا جنرل ضیاء کے متعلق، انصاری صاحب نے، جن دو اختلافی آراء اور ان کے دلائل کو جماعت سے منسوب کیا ہے۔ ان کی کوئی جماعتی اہمیت مجلسِ شوریٰ کا دستوری فیصلہ ہوجانے کے بعد نہیں رہتی۔ ہمارے ہاں کوئی ایسی مسلمہ روایت نہیں ہے کہ کسی اہم مبحث کے متعلق جماعتی فیصلے سے پہلے مابعد میں اس کے افراد جماعت کے متعین کردہ دستوری دائرے سے باہر اپنی متفرق آراء کو الگ الگ کرکے پریس اور پلیٹ فارم کے ذریعے پھیلائیں۔ اگر ایسی کوئی لغزش کسی سے صادر ہو بھی جائے تو وہ لغزش جماعت کی خوبیوں یا خرابیوں میں محسوب نہیں ہوسکتی۔

۴- صدر کی جس وعدہ خلافی کا ذکر انصاری صاحب نے کیا اس کے خلاف بالاختصاص سابق وزراء ہی کا نہیں، مرکزی قیادت سے لےکر عام کارکنان تک کا کسی نہ کسی رنگ کا ردِّعمل موجود تھا۔ مگر جماعت کے مجموعی ذہن نے اس تکلیف دہ پوائنٹ پر "حکومت کے نفاذِ اسلام کی اسکیم کا پول کھول دینے" کی کسی بڑی مہم میں لگ جانے کے بجائے زیادہ بہتر یہ سمجھا کہ بھرپور کوشش اس بات کے لیے ہونی چاہیے کہ فوجی آمریت کی تلوار سروں سے ہٹے اور جمہوری راستے کھلیں اور ملک کے ہنگامہ پسند اور تخریبی عناصر کے پلڑے میں اپنی اجتماعی روش کا وزن ڈال کر ایسے حالات پیدا نہ کردیے جائیں کہ مارشل لا طول کھینچے یا وہ فقط اپنا چہرہ تبدیل کرکے رہ جائے۔

البتہ فوجی آمریت کے منصوبہ نفاذِ اسلام اور اس کے محرکات اور طریقِ نفاذ پر نہ صرف مجلسِ شوریٰ کی قراردادوں میں اور امیرِ جماعت کے بیانوں اور خطوط بہ نام صدر میں بل کہ ترجمان القرآن کے اوراق میں بھی تمام حقائق لگی لپٹی رکھے بغیر

واشگاف طور سے بیان ہوتے رہے ہیں۔

۵- کچھ لوگوں کی رائے کے مطابق اُس وقت بھی اور بہت سی آراء کے مطابق آج بھی ایک دوسرا رُخ صدر ضیاء کے کام میں قابلِ غور ہے۔

سارے تجربات واحوال کا بہ غور تجزیہ کرنے سے اس حسنِ ظن کی گنجایش نکلتی ہے کہ صدر ضیاء تن تنہا اِس سعی میں تھے کہ اسلامی اصول واقدار کے چلن کے لیے کچھ بنیادیں پڑ جائیں۔ کچھ خطوطِ کار بہ طور روایت قائم ہو جائیں، مگر شکل یہ تھی کہ ان کی فوجی اور سول بیوروکریسی اس مشن میں مجموعی طور پر ساتھ دینے والی نہیں تھی۔ وہ لوگ ایک طرح کا آرائشی (Ornamental) اسلام تو گوارا کرسکتے تھے مگر اتھارٹی والا اسلام ناپسند تھا۔ اسی کو مغرب والے فنڈامنٹلزم کہتے ہیں اور اس کے لیے اتنی بدتبلیغی انھوں نے اپنے علمی، ادبی، مذہبی ڈپلومیٹک اور ابلاغی ذرائع سے عالمی پیمانے پر کردی ہے کہ خود مسلمان دانشور اور ترقی پسند اور ارباب عہدہ و جاہ اسے انسانیت کی کوئی خاص بیماری سمجھ کر اس سے بچنا اور ملک کو بچانا چاہتے ہیں۔

۶- محض ''ہدفِ نکتہ چینی'' بننا کسی اسلامی نظامِ جماعت کے فیصلہ وعمل کے عدمِ صحت کی دلیل نہیں ہے۔ حکومت کے جن معاملات میں جہاں تک ہم نے تائید کی (اس کے ساتھ ہمارے شدید قسم کے تنقیدی بیانات اور قراردادوں کو سامنے رکھنا چاہیے) اور پھر دوسری جانب اتحاد قائم کرنے کے لیے جو نقشہ ہم نے بنایا، یہ دونوں باتیں ہماری دیانت دارانہ سوچ پر مبنی تھیں۔ یہ تو قاعدہ ہے کہ جب بھی کوئی جماعت سیاست میں رواجِ عام سے ہٹ کر کوئی موقف اختیار کرتی ہے تو اس پر نکتہ چینیوں کی بوچھار ہوتی ہے۔

۷- ۱۹۷۷ء کی تحریک کے فوائد کو سمیٹ سنبھال کر ساتھ لینا اور انھیں سرمایۂ کار بنا لینا اس لیے ممکن نہ ہوا کہ قومی اتحاد کے ٹوٹنے کے علاوہ خود جماعتیں کالعدم قرار پا گئیں اور ہمارے پاس وہ ٹھوس تنظیمی مشینری باقی نہ رہی جس کے ذریعے تحریک ۱۹۷۷ء کی فراہم کردہ قوت کو استعمال میں لایا جاتا۔

۸- انتخابی سیاست پر توجہ دینے کا زمانہ مارشل لا کے تحت تو بہت ہی مختصر تھا۔ سماجی، تعلیمی اور تربیتی کام (جنھیں جماعت نے اپنے ٹوٹے پھوٹے نظام کے بعد بھی یکسر ختم نہیں

ہونے دیا) اور اس کے اثرات میں جو کمی آئی، شہروں اور قصبوں میں عوامی بنیاد قائم کرنے کے مواقع ہمارے اہداف کے مطابق وسیع نہ ہو سکے (یہ اندازہ صحیح نہیں ہے کہ یہ مواقع یکسر کھو دیے گئے) نیز انقلابی نظریے کی دعوت کو حدِ مطلوب تک پھیلانے میں جو کوتاہی ہوئی، ان چیزوں کا بڑا سبب بھی جماعت کی کالعدمیت تھا۔ فکری انتشار کا ماحول، طرح طرح کے ٹکراتے ہوئے رجحانات کے جھگڑوں کا چلنا، مختلف سطحوں اور علاقوں کے کارکنوں کی تعدادِ کثیر کا نت بدلتے بے سنگم حالات میں ہم آہنگ نہ ہو سکنا، سیاسی لیڈروں کی متفرق بولیاں، مذہبی اکابر کی فکری نیز نگیاں، واعظوں کی شعلہ بیانیاں اور اخباروں کا متضاد قسم کے صد گونہ ''سچ'' بہت زیادہ بولنا، اِن حالات میں اگر خیالات میں الجھاؤ پیدا ہوں اور عمل میں کہیں تذبذب اور کہیں جمود اور اخلاق میں زوال، تو کیا عجب۔ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ جماعت میں اس طرح کا انتشار وانحطاط کچھ زیادہ واقع نہیں ہوا۔ اور بحالیٔ جماعت کے بعد کمزوریوں پر بہت جلد قابو پایا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر خدانہ خواستہ ہم بحالیٔ نظم کے بعد اپنی اصلاح وتعمیر کا کام نہ کر سکے تو پھر کیا کرایا خراب ہو جائے گا۔

۹- ایسا تو نہیں ہوا کہ اپنے اصول ومقاصد کو درکنار رکھ کر ہم نے محض بیرونی محرکات کے فوری تقاضوں کے تحت پالیسیوں کی تشکیل کی ہو۔ دو ایک بار خارجی احوال نے ہم سے ذرا جلد جواب مانگا۔ ویسے کون ساز زندہ فرد یا زندہ گروہ ہے جو خارجی احوال و ظروف سے قطع نظر کر کے انقلاب یا اصلاح کے راستے پر چلے۔ ہر حال میں ہم نے اپنے نصب العین اور اصولوں کو اپنے سامنے رکھا۔

۱۰- میرے خیال میں ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ ہمارے لوگ اسلامی معاشرے کی تشکیل کے جامع عمل سے غافل ہو جائیں یا اسے دوسروں کے سامنے واضح کرنے میں کوتاہ ثابت ہوں۔ اصولی طور پر تبدیلی کے تفصیلی اہداف ہر شعبۂ زندگی سے متعلق ہمارے لٹریچر میں موجود ہیں۔ اور اس لٹریچر میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسری طرف عملاً ہم تعمیر معاشرہ کی مساعی سے گزرتے ہوئے اور امکانات اور مزاحمتوں کو سمجھتے ہوئے حال اور مستقبل کی پوری تصویر پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ عملیت (Pragmatism) اور

تجربیت (Empiricism) کی اصطلاحات کے پیرائے میں آپ نے جس اندیشے پر توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ کہیں ہم سفینۂ تحریک کو اصول و مقاصد کے پتوار اور بادبان سے فارغ کر کے ہوائے وقت کے حوالے نہ کردیں۔ مطمئن رہیے کہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ انشاء اللہ۔

۱۱- آخر میں میاں طفیل محمد صاحب اور محترم پروفیسر غفور احمد صاحب کے اختلافات کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اختلافات تو اتفاقاً اور غیر متوقع طور پر سامنے آگئے، ورنہ پالیسی طے کرتے ہوئے جو بحثیں ہوتی ہیں، اگر کہیں وہ سامنے آجایا کریں تو میرا خیال ہے کہ ہر صبح اور ہر شام اپنے، بیگانے انتظار کریں کہ جماعت کی شکست و ریخت ابھی ہونے والی ہے۔ پروفیسر غفور احمد صاحب کے علاوہ بھی بہت سے اختلاف کرنے والے دل کھول کر اظہارِ رائے کرتے ہیں۔ کسر صرف یہ ہے کہ ان کی بحثیں اور آراء ایوان سے باہر نہیں آتیں۔

۱۲- متذکرہ مثال کو سامنے رکھ کر آپ نے بہ طورِ تحسین فرمایا ہے کہ یہ اختلافات جماعت کی اندرونی زندگی میں جمہوری کردار کے مظہر ہیں۔ بلاشبہ مقررہ سطح پر اور مقررہ دائرے میں ہمارا جمہوری کردار بڑے سے بڑے اختلافات کو گوارا کرتا ہے، مگر ہمارا دستور اس کی اجازت نہیں دیتا کہ درونِ ایوان کی بحثیں اور اختلافی آراء کو باہر لے جایا جائے۔ یہ جماعت کے جمہوری کردار سے تجاوز ہے اور ہماری کم زوری ہے۔ آپ کی تحسین کے شاید پوری طرح ہم مستحق نہ ہوں۔

۱۳- میری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ ''مسلم انقلابی'' یا ''اسلامی انقلابی'' کی اصطلاح دین کو جامعیت اور امتیازی شان کے ساتھ پیش کرنے والوں کو کیوں نہیں سجتی؟ اگر معاملہ محض ذوق کا ہو تو مقامِ بحث نہیں۔ اور اگر بات استدلال کی ہو تو قطعی دلائل سامنے آنے چاہئیں۔ دلائل صرف آیات ہی سے نہ ملیں گے بل کہ ان کی ایسی تعبیر و تشریح سے ملیں گے جو اقامتِ دین کی جمیع سرگرمیوں پر راست آسکے۔

دین کا اوّلین تقاضا اور دائمی مطالبہ ''دعوت'' ہی کا ہے، لیکن ''دعوت بہ معنی وعظ'' اور ''دعوت بہ معنی پیغامِ انقلاب'' میں فرق ہے۔ مولانا مودودیؒ نے رسالہ ''تجدید و

احیائے دین‘‘، ’’اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے‘‘، ’’اسلام کا نظریۂ سیاسی‘‘، ’’دعوتِ اسلامی کے تین نکات‘‘، ’’سیاسی کش مکش حصہ سوم‘‘، ’’خلافت وملوکیت‘‘، ’’جماعتِ اسلامی کا لائحہ عمل‘‘ وغیرہ میں اپنی دعوت کو انقلابی دعوت کے طور پر پیش کیا۔ ان کا مفہوم یہ تھا کہ مسئلہ صرف انفرادی اصلاح کا نہیں ہے، بلکہ افراد کو منظّم ہوکر اجتماعی اصلاح وتغیر کے لیے سعی و جہد کرنی ہے اور تباہ کن سیلاب کا مقابلہ جوابی سیلاب اٹھا کر کرنا ہے۔

انقلاب کا مفہوم لازمی طور انتہا پسندانہ تبدیلی (Radical Change) نہیں ہے، بلکہ انقلابی تبدیلی کے معنی جو ہمارے لٹریچر میں موجود ہیں (بہ خوفِ طوالت میں اقتباسات اور حوالے نہیں دے سکتا) وہ یہ ہیں کہ تبدیلی بنیادی قسم کی مطلوب ہے اور جامع اور ہمہ گیر قسم کی مطلوب ہے۔ فرد کے قلب وضمیر سے آغاز پا کر ایوانِ حکومت اور معاشرے کے ہر شعبے تک اسلام کو قائم ہوجانا چاہیے۔ نقطۂ آغاز فرد ہی رہے گا۔ اور بنیادی وسیلۂ کار دعوت ہی ہوگا۔

دعوت کے تصور کو وہ کتاب واضح کرتی ہے جس کا نام ہے ’’دعوتِ اسلامی کے تین نکات‘‘ اور تین نکات اجمالاً یہ ہیں:

۱- اپنی پوری زندگی میں اللہ کی بندگی اور انبیاء علیہم السلام کی پیروی اختیار کرو۔
۲- دورنگی اور منافقت چھوڑ دو اور اللہ کی بندگی کے ساتھ دوسری بندگیاں جمع نہ کرو۔
۳- خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کو (عددیت، کردار، تنظیم اور تشکیلِ رائے عامہ وانتخابات کے ذریعے تدریجاً، مگر تیز رفتار کام کرکے) دنیا کی رہنمائی اور فرماں روائی کے منصب سے ہٹادو، تاکہ زندگی کی گاڑی ٹھیک ٹھیک اللہ کی بندگی کے راستے پر چل سکے۔

لٹریچر کے دوسرے اہم حصوں کو سامنے رکھ کر ذیل کے چوتھے نکتے کا اضافہ کیا جاسکتا ہے:

۴- تمام گروہ بندیوں، فرقوں اور برادریوں کی عصبیتوں سے بالاتر ہوکر اقامتِ دین کا کام کرنے والے نظامِ جماعت میں اپنی قوتوں کو مجتمع کرو اور پھر اپنی منظّم طاقت سے دعوت کو بھی پھیلاؤ۔ امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر بھی کرو اور کفر بالطاغوت کا فریضہ بھی ادا کرو۔ تاآں کہ اس جہادِ مسلسل کے نتیجے میں پورے کا پورا دین قائم ونافذ ہوجائے۔

۱۴- میرا خیال ہے کہ آج کل شاید بعض اصحاب اسلامی انقلاب کی اصطلاح سے اس لیے بھی بچنا چاہتے ہیں کہ ایران کے اسلامی انقلاب سے اپنے کام کی نوعیت کو ممیّز رکھا جائے اور امریکہ و یورپ میں ''جارحانہ اسلامیت'' کا جو خوف پھیلایا گیا ہے اس کا ازالہ کرنے کے لیے انقلاب کے لفظ کو چھوڑ دیا جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ بار بار بلاوجہ دعوت کی وضاحت میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کو بدلنا نہیں چاہیے، البتہ ان کا صحیح مفہوم واضح رکھنا چاہیے۔ مولانا مودودیؒ نے بہ خوبی تشریح کر دی تھی کہ ہماری مراد مار دھاڑ کا انقلاب نہیں ہے، بل کہ دعوتی، تعلیمی، پُرامن اور آئینی جدوجہد کا دوسرا نام ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ اصل نقطۂ آغاز بھی دعوت ہے اور دعوت ہی کو آخر دم تک تمام دوسری سرگرمیوں کے ساتھ جاری رہنا ہے۔ البتہ نہیں کہا جاسکتا کہ بالکل آخری مرحلے کی ایک جَست تحریک کس انداز سے لگائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کی ایک ہزار ایک شکلیں ہوسکتی ہیں۔

۱۵- یہ درست ہے کہ اسلام کی دعوت کے مخاطب ظالم و مظلوم سب ہیں اور وہ دلوں اور دماغوں کو روشن دلائل اور مؤثر کردار کے ساتھ خدا اور اس کے دین کی طرف موڑنا چاہتے ہیں، لیکن عملاً تاریخ میں ایسا ہوتا رہا ہے کہ مظلوم اور غریب اور کم زور عناصر جلد اور کثیر تعداد میں لبیک کہتے ہیں جب کہ ظالم افراد اور طبقے مزاحمت کرتے ہیں اور ان کی اکثریت اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے دعوتِ حق کو ملیامیٹ کر دینا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لبیک کہنے والوں، مزاحمت کرنے والوں اور دشمنی پر اُتر آنے والوں کے لیے دعوتی رویے الگ الگ ہوتے جاتے ہیں۔

اساسی طور پر دعوتِ اسلامی کی روح اخلاص اور نرم خوئی ہی رہے گی، مگر احوال اور مخاطبین کی روش کی وجہ سے اندازِ دعوت میں تبدیلیاں ہوسکتی ہیں۔ اگر حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کو فرعون کے سامنے ''قول لین'' کہنے کی ہدایت دی گئی تھی تو ساتھ ہی لرزا دینے والی ۹ نشانیاں بھی دی گئی تھیں۔ نیز انھوں نے خدا پرستانہ اساسی دعوت کے ساتھ یہ سیاسی مطالبہ بھی صاف صاف طور پر کر دیا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے کا حق دو۔ اس سے الگ ایک انداز حضرت ابراہیمؑ کا بھی تھا، جنھوں نے بتوں کا مثلہ بھی کیا اور

اس سلسلے میں بت پرستوں کے جواب طنزیہ دیے، نیز نمرودِ سرکش کے سامنے چیلنج کے انداز کی بات کی۔ ''حکمت'' کا مدّعا یہی ہے کہ موقع بہ موقع دعوت کے مؤثر انداز اختیار کیے جائیں۔ نوبت ''جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ'' تک پہنچتی ہے۔

۱۶- یہ تصور کہ ایمان والوں کو محض اپنے عقیدے کا دفاع کرنا ہوتا ہے، حقیقت کا کوئی جامع نقشہ پیش نہیں کرتا، دعوت ایسے پُرزور استدلال اور اخلاقی وزن کے ساتھ دی جاسکتی ہے کہ مخالفین اپنے نظریات کو جارحانہ طور پر آگے بڑھانے کے بجائے ان کا دفاع کرنے پر مجبور ہوجائیں۔ تصادم سے بچنے کی ہزار کوشش کیجیے، کسی بھی نئی دعوت کا اٹھنا پہلے فکری، پھر سماجی اور آخر میں سیاسی تصادم پیدا کردیتا ہے، خصوصاً جب کہ ''لا'' کے پردے میں کفر بالطاغوت دعوت کے بنیادی کلمے میں شامل ہو۔ عموماً تصادم کا آغاز مخالف قوتوں کی طرف سے جھوٹ، بے جا الزام تراشی اور تشدد کی شکل میں ہوتا ہے اس طرح دعوتِ حق کے علم بردار مظلومی کے مقام پر آجاتے ہیں اور مظلومی ایسی قوت ہے جو ظلم کی تلوار کو توڑ کے رکھ دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ داعیٔ حق فرد یا جماعت یا تحریک کو ظالم بن کر نہیں، بلکہ مظلومی کی راہ سے کام کرنا ہے۔

۱۷- مسئلہ محض کسی شخص کے آسائشیں رکھنے کا اہم نہیں ہے، بل کہ ایک تو اُس کو نوازنے والے نظامِ تقسیم دولت کو دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ کہاں تک عادلانہ ہے اور دوسرے یہ ملحوظ رکھنا پڑتا ہے کہ آسائشیں رکھنے والے لوگوں ہی کی اکثریت یا تو مزاحم بنتی ہے، یا اختلاف کرتی ہے، یا بے عملی کا شکار رہتی ہے، نیز ایک ایک شخص کی آسائشیں کتنے ہی دوسرے بے شمار انسانوں اور ان کے بچوں کے لیے وجہ اذیت اور باعثِ اضطراب بنتی ہیں۔ لہٰذا دعوتِ حق فقط آسائشیں رکھنے کی بنیاد پر کسی شخص کی مخالفت نہیں کرتی، مگر یہ بھی مسلمہ ہے کہ خدا کی راہ میں صاحبِ دعوت یا داعیٔ انقلاب بننے کے ساتھ دنیوی لذّات اور آسائشوں کی کثرت چل نہیں سکتی۔ یا تو دعوت کے لیے انفاق کے بڑھنے کے ساتھ لذّات اور آسائشیں گھٹیں گی یا پھر خود دعوت کم زور ہونا شروع ہوجائے گی۔ اسلام کا کام کرنے کے لیے ایک گونہ فقر کا ہونا ضروری ہے۔ یہ درست ہے کہ دولت

کے ہوتے ہوئے بھی فقر غالب ہوسکتا ہے مگر ایسا مرتبہ پانے والے کم ہی دیکھنے میں آئیں گے۔

۱۸- جس طرح یہ ممکن ہے کہ اسلامی تحریک کے لوگ معاشرے کی اساسی تبدیلی کا اسلامی تعلیمات پر مبنی تصور موزوں انداز میں پیش کرنے سے قاصر رہیں، اسی طرح یہ بھی بہت زیادہ ممکن ہے کہ خالص دعوتِ اسلامی کو پیش کرنے والے بھی اس کے صحیح مفہوم اور تقاضوں اور وسعتوں کے ساتھ اور اُس کی مطلوبہ تبدیلیوں اور اس سے پیدا ہونے والے اصولی اور فکری تصادم کے ساتھ سامنے نہ لا سکیں۔ نتیجہ اس کا یہی ہوگا کہ دعوتِ اسلامی سے وہ انسانِ مطلوب اور اس کے رویے وجود میں نہ آسکیں گے، جن کا طلب گار دین ہے، تارک الدّنیا درویش، خانقاہی صوفی اور انفرادی مسلمانیت کے نمونے اسی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔ پس انقلابی دعوت اگر نتائج کے لحاظ سے بانجھ اور بنجر نکل سکتی ہے تو خالی دعوت بھی اس معنی میں بانجھ پن دکھا سکتی ہے کہ سینکڑوں نیک آدمیوں کے موجود ہوتے ہوئے بھی بدی کا تخت ان کے کاندھوں پر ٹکا رہے اور ظلم وخیانت کا طوفان چاروں طرف موجزن رہے۔

۱۹- ’’برائیوں سے روکنے‘‘ کا جو حوالہ آپ نے آلِ عمران کی آیت نمبر ۱۰۴ سے دیا ہے، اس کے متعلق کیا یہ فرمائیں گے کہ روکنے سے کیا شکلیں مراد ہیں، نیز کیا اس کی کسی ادنیٰ شکل پر سالہا سال ے لیے قانع ہوکر بیٹھ رہنا اس جذبے میں زندگی باقی رہنے دے گا۔ دنیا میں جب بھی کسی مروّج چیز کو روکنے کا کام شروع کیا جاتا ہے، معاشرے میں مدّ وجزر پیدا ہوجاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر دعوت کا واعظانہ تصور ختم ہوجاتا ہے۔

۲۰- ایک قوت ہے، فوجی قوت، اس کا استعمال تو بہت ہی خاص قسم کے حالات کے لیے مخصوص ہے۔ دوسری قوت رائے عامہ کی سیاسی قوت ہوتی ہے۔ آپ کسی بھی حکومت میں رہتے ہوئے اس قوت سے کام لے کر مخالف کو زچ کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہمارے معاشروں میں لادینیت اور سیکولرازم کا طوفان جارحانہ انداز سے آگے بڑھ رہا ہے، عیاشی وفحاشی کا ریلا ہے، شریعت میں ترامیم کی جارہی ہیں۔ دینی اصطلاحات کو بدلا جارہا ہے، پردے کو غارت کیا جارہا ہے۔ کیا اس حالت میں یہ بات ’’دعوت‘‘ کے

خلاف ہوگی کہ اخبارات اور اسٹیج کے ذریعے اس طوفان کے خلاف آواز اٹھائی جائے، جلسے کیے جائیں، ممکن ہوتو پُرامن خاموش مظاہرے کیے جائیں، ارکانِ پارلیمان سے ووٹروں کے وفود ملیں، محضر نامے بھجوائے جائیں۔ مجھے اس میں کوئی اُلجھن نظر نہیں آتی۔

۲۱- باطنی آمادگی (conviction) ضروری ہے۔ مگر اس آمادگی کے حصول کے بعد اگر ایک شخص یا گروہ اپنی قوتوں کو اسلامی انقلاب انگیزی کی مہم میں لگائے تو کون سا گناہ اس سے سرزد ہوا۔ ''لیبل'' کا مسئلہ تو وہاں ہوتا ہے جہاں حقیقت تو کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کرنا ہو۔ ہم تو فی الحقیقت تصورِ اسلام کے ساتھ انقلابیت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لیبل ازم کا ایسا ہی اطلاق غیر انقلابی دعوت پر بھی ہوسکتا ہے۔

۲۲- عملیت اور تجربیت اور اصلاح کاری کی جو اصطلاحات جناب انصاری اور جناب فتحی نے استعمال کی ہیں اُن کی جبلّت مادّہ پرستانہ ہے۔ یہ اصطلاحات ایک جامع فلسفے کے معروف سوچ ہیں۔ ان کا جوڑا اسلام سے لگانا مناسب نہیں، ہماری اپنی اصطلاحات ہیں اور ہمیں انہی میں بات کرنی ہے۔

۲۳- یہ بڑی قابلِ قدر بات ہے کہ برادر مکرم فتحی عثمان صاحب نے ''عربیا'' کے صفحات کو مختلف اسلامی مکاتبِ فکر کے لیے مشترک پلیٹ فارم قرار دے کر یہ دعوت دی ہے کہ جماعتِ اسلامی کی طرف سے بھی احباب چاہیں تو خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟

ملاحظہ کیجیے، اپنے دور کے عالمی علوم اور ترقیات اور ادارات کو اور پھر اندازہ کیجیے کہ انسان کتنی سہولتوں اور سامانوں کے میسر ہوتے ہوئے بھی ایک طرف دوسروں کے لیے وجہٗ آزار بنا ہوا ہے اور دوسری طرف سے اپنی حد تک بھی ذہنی سکون اور قلبی راحت میسر نہیں۔ معاشرہ اور فرد دونوں اپنے اپنے گردابوں میں چکر کھا رہے ہیں اور راہِ نجات نہیں۔

اللہ کے عذاب کا یہ سلسلہ بڑا عجیب اور غیر معمولی ہوتا ہے کہ فرد یا معاشرے کو ان کے اپنے ہی اعمال کے کڑوے کسیلے اور زہریلے پانی میں غوطے پر غوطے دیے جائیں اور یہ سلسلہ کہیں نہیں رُکتا۔ اس وقت مجموعی طور پر ساری انسانیت اپنی عملی کج فکریوں، اپنے ہی ایجاد کردہ پُر پیچ فلسفوں، اپنے ہی بلند بانگ ارادوں اور اپنی ہی عافیت سوز تفریحات میں ڈبکیاں کھا رہی ہے۔

دور کی باتوں کو چھوڑیئے، اپنے یہاں دیکھیے۔

نتیجہ اُلٹ

میں اور آپ کھانے، پہناوے، رہن سہن اور گھریلو سامان، آرائشوں اور آسائشوں میں پچھلی نسلوں سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ شرحِ خواندگی کا اضافہ کم سہی، مگر ایک تو بڑے بڑے درجہ ہائے تعلیم تک پہنچنے والے اصحاب زیادہ ہیں۔ ساری قوم کے خیالات و کردار پر اثر انداز ہونے والے ذرائع ابلاغ۔ اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن۔ کا طوفان اُمڈ رہا ہے۔ ثقافتی مجالس ہیں، سیمینار ہیں، مذاکرے ہیں، نت نئی کتابیں چھپ رہی ہیں۔ رسالے جاری ہیں، کیسٹ ٹیپ پھیل رہے ہیں۔ اب تو وڈیو کیسٹ کا بھی رواج ہو چکا ہے، دینی تقاریب اور جلسے

ہوتے ہیں، جمعہ کے خطبات سارے ملک میں ہو رہے ہیں۔

اِن وجوہ و اسباب کے نتیجے میں پچھلے پچاس سال کے عرصے میں یہاں کے انسان کو بہت بہتر ایمانی و اخلاقی معیار پر آ جانا چاہیے تھا، مگر نتیجہ اُلٹ نکلا۔ کیوں کہ ان چیزوں میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ انسان کو روحِ تقویٰ سے مالا مال کر دیتیں۔

تحزّب، سیاست، دولت پرستی

پہلے ہمارے ہاں فرقہ وارانہ جھگڑوں کی وجہ سے اضطراب ہوتا تھا، لیکن اب تو سیاسی فضا میں بھی عدم رواداری ہے۔ افراد میں بھی اپنی بات دوسرے پر ٹھونسنے کا جوش بڑھ گیا ہے۔ اور اسی لیے ذرا ذرا سے اختلاف پر چاقو نکل آتے ہیں اور پستول چل جاتے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں کی کثرت، اُن کا بے اُصولا پن، اُن کے ہاں شرافت کی ٹھوس قدروں کا فقدان، لوگوں کا اِدھر سے نکل کر اُدھر آتے جاتے رہنا، آپس کی کھینچا تانیوں کی وجہ سے خود پاکستان کی وحدت اور نظریۂ پاکستان کے خلاف رنگا رنگ جھنڈوں اور نعروں کا بلند ہو جانا، یہ سب کتنا دردناک نقشۂ احوال ہے۔

پھر پورے معاشرے کا مجموعی سماں یہ ہے کہ ہر کوئی دولت کی پری کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور بلند ہوتے ہوئے معیارِ زندگی کے لیے اُچھل رہا ہے اور اپنے آپ کو ضروریات اور خواہشات کے حوالے کرنے کے بعد وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ چوری کرے، رشوت لے، جعل سازی کرے، ملاوٹ سے کام چلائے، اسمگلنگ کا دھندا کرے، سرکاری اموال میں خورد بُرد کرے یا ٹھیکوں اور بیرونی سودوں میں سے کمیشن لے۔ یہ تجربے جتنے جتنے عام ہو رہے ہیں، اندر کا ''سیمرغ'' پیٹ بھرنے کے لیے اتنے ہی ہاتھی اور مانگ رہا ہے کہ یہ لاؤ، ورنہ میں تمھیں کھا جاؤں گا۔

آج ہم ایک دوسرے کے لیے جس طرح سانپ اور بچھو بن گئے ہیں، کیا یہ عذاب نہیں ہے؟

جبریت، اسلحہ اور غارت گری

اور کیا یہ عذاب نہیں ہے کہ اسلحہ ہمارے ہاں بڑوں، جوانوں اور بچوں کے ہاتھوں میں کھلونوں کی طرح ہے اور لوگ بے باکی سے انسان کو اس طرح مار دیتے ہیں جیسے کوئی چیونٹی مسل دی

اور پھر اس کارنامے پر فخر کرتے ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ ہماری دشمن طاقتوں نے ہماری تباہی کا ایک سامان یہ کیا ہے کہ ہمارے ہاتھوں میں زیادہ سے زیادہ مہلک اسلحہ پہنچا دیا ہے۔ اور ہمارا حال یہ ہے کہ جہاں ذرا اختلاف ہوا، اپنی بات ٹھونسنی ہوئی، فوراً کلاشنکوف کا دہانہ کھول دیا۔ یعنی ایک دوسرے کو مارتے جاؤ، باہر سے کسی حملے کی ضرورت ہی نہیں اور کسی دشمن فوج کی احتیاج ہی نہیں، تم خود ہی اپنے دشمن اور اپنے قاتل بنتے رہو۔ بڑے پیمانے پر جو کچھ کراچی میں ہوا اور ہو رہا ہے اور مزید ہونے کا خطرہ ہے (اور ۱۹۹۰ء میں مزید تباہی) اسے سامنے رکھ کر اندازہ کیجیے کہ ہم اپنی جڑیں آپ کاٹنے میں کتنے استاد ہیں۔ ہم کس طرح پھٹ سکتے ہیں! آناً فاناً ہم دشمن نسلی اور علاقائی جتھوں میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اپنوں پر ہم بم پھینک سکتے ہیں! اپنوں کو ہلاک کر سکتے ہیں اور اپنوں کے گھر جلا سکتے ہیں؟ یہ اجتماعی خودکشی کا ایک راستہ ہے جس پر دو ایک قدم چل کر دیکھا گیا ہے کہ یہ کہاں تک کامیاب رہتا ہے اور ہماری کرم فرما طاقتیں بھی اندازہ کرنا چاہتی ہیں کہ مسلمان ان کے اشاروں پر بے وقوف بن کر کس حد تک جا سکتا ہے۔ ہاں جناب! ہمارا مسلمان بڑی تیز رفتاری سے آپ کے اشاروں پر بہت دور تک جا سکتا ہے۔ وہ دین، قومی وحدت، ملکی سالمیت اور اپنی آزادی وغیرہ سارے اسباب کو آپ کی جلائی ہوئی آگ میں پھینک سکتا ہے۔

مگر بس اس وقت تک کہ اس کی چشمِ ایمان وا نہ ہو اور اس کی شمعِ شعور روشنی نہ دینے لگے۔

پھر کیا یہ عذاب نہیں کہ دشمن طاقتوں کی تیار کردہ تخریبی قوتیں جا بجا تباہی پھیلا رہی ہیں۔ کبھی کسی تھانہ کا صفایا ہے، کبھی کہیں سے ریلوے کی پٹری اکھیڑ دی ہے، کبھی کسی پل کے ساتھ پلاسٹک بم باندھ دیے ہیں، کبھی کسی دفتر کو اڑا دیا ہے اور ہر طرف سے روزانہ بے گناہ انسانی جانوں کی ہلاکت کی خبریں آتی ہیں۔

آسمانی عذاب

کیا یہ عذاب نہیں ہے کہ مئی میں شدید سردی اور بارش اور اولوں کی وجہ سے خربوزے اور آم کی تباہی کے علاوہ گندم کی بربادی بہت بڑے پیمانے پر ہوئی ہے۔ اور اب اس کے صحیح اعداد و شمار کو چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ سبزیوں کی فصلوں کو نقصان

پہنچا ہے۔علاوہ ازیں اگلے موسم کی فصلوں کی بوائی کا سسٹم بھی درست نہیں رہا۔

ہمارے اکابر تو اس کا ایک ہی علاج جانتے ہیں کہ کچھ تو سڑی ہوئی گندم کو غریب طبقوں کی غذا بنا دیا جائے، کچھ گندم امریکہ سے لے لی جائے۔اور کچھ قرضہ زراعتی نقصان کی تلافی کے لیے حاصل کر لیا جائے۔

یہ سارے حالات ایک طرف اور روس کے آئے دن پاکستانی علاقے پر بمباری اور بھارت کی مسلسل تیاری اور سازش کاری وغیرہ دوسری طرف۔گویا ہم دوہری مصیبتوں کی زد میں ہیں۔اور ہمیں خدا سے ڈرنا چاہیے اور اس کی گرفت کا خوف اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔

راہِ نجات

اس موجودہ لمحے کی پیچیدگیوں سے بچ نکلنے کے علاوہ آنے والے مراحل میں اگر تحفظ مطلوب ہو تو خدا پرستی کی راہ اختیار کیجیے، اپنی غلط روشوں پر توجہ کیجیے اور تقوے کے اصول کو اپنائیے۔

یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ آج مصائب کے جس گھیرے میں ہم گھرے ہوئے ہیں کہیں اس کی وجہ نفاذِ شریعت سے ہمارے حکام اور ہماری پارلیمان کی رُوگردانی تو نہیں؟ اگر ہے تو ووٹروں اور شہریوں کو بھی سوچنا چاہیے کہ ان کے ووٹوں سے جو لوگ نمائندگی پر آئے ہیں اور اختیارات کے مالک ہوئے ہیں۔ان کے اعمال کی ذمہ داری کیا لوٹ کر ووٹروں اور شہریوں پر تو نہیں آتی؟ یقیناً آتی ہے۔تو پھر آپ سب کا فرض ہے کہ اپنے منتخب کردہ نمائندوں اور حکام پر دباؤ ڈالیں اور اُن سے مطالبہ کریں کہ وہ خدا کے قانون کو عملاً نافذ کریں۔

سعی اقامت دین اور کامیابی ونا کامی کا مسئلہ

(ایک سوال کے جواب میں)

آپ جیسے محبّ اور عزیز حضرات ہر اس چیز کے سامنے آنے پر پریشان ہو جاتے ہیں جس کا مقصد مولانا مودودیؒ یا تحریکِ اسلامی کی فکر پر ضرب لگانا ہو۔ یہ نیک کام اصل میں دو وجوہ سے ضروری ہے: ایک یہ کہ جہاں تک مولانا مودودیؒ کی بھاری بھرکم شخصیت کے چھتنار نظامِ افکار کا تعلق ہے جب تک اس میں کیڑے نہ ڈالے جائیں کوئی نوخیز ذہین آدمی مولانا مودودیؒ کے اس عہد میں اُبھر نہیں سکتا۔ دوسری یہ کہ ہماری اسلامی حکومت اس بات کی سخت ضرورت مند ہے کہ مولانا مودودیؒ کے اٹھائے ہوئے تحریکی ریلوں سے ان کی مسندوں اور قالینوں اور شیشہ خانوں اور ان کے محبوب نظامِ مفاد کو محفوظ رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ رضا کار انھیں ایسے ملتے رہیں جو ایک جوابی آئیڈیالوجی مہیا کریں اور اسلام کا کوئی ایسا تصور معاشرے میں پھیلائیں کہ لوگ تبلیغ و ذکر تو شوق سے کرتے رہیں مگر حکومت و سیاست کی روش سے کوئی تعرض نہ کریں۔ دوسرے لفظوں میں وہ خالص غیر سیاسی اور غیر اجتماعی مذہب کی سرپرستی کر سکتے ہیں۔

اس منفی مقصد کے حصول کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ اقامت دین یا انقلابِ اسلامی کے کسی ایک طور پر قوتوں کو جمع نہ ہونے دیا جائے، بلکہ نوبہ نو نظریات اور طریقہ ہائے فروغِ اسلام کے علم اٹھا کر معاشرے میں حالتِ انشقاق و افتراق پیدا کر دی جائے۔

میں کہتا ہوں کہ آپ اتنی سی بات سے گھبراتے کیوں ہیں کہ شیر کے جسم پر کوئی چیونٹی بھاگی چلی جا رہی ہے۔ بھاگنے دیجیے، آخر اسے چند ثانیوں کے بعد واپس اپنے بل کو چلے جانا ہے۔ کچے نظریات، ادھورے فلسفے، ٹیڑھے دینی تصورات اگر تھوڑی دیر کے لیے کچھ بہادری دکھا لیتے ہیں تو کیا ہرج۔ اب تو حال یہ ہے کہ تمام دانشور اور عالم اور لکھنے والے یا تو مولانا مودودیؒ کے حق میں لکھ سکتے ہیں یا ان کے خلاف۔ گویا سب کے ذہنوں پر مولانا مودودیؒ کا سکہ رواں ہے۔

میرے خیال میں یہ بات اچھی ہے کہ مخالفت کی کچھ لہریں اٹھتی رہیں، کیوں کہ وہ ہمارے بھی دلوں اور دماغوں کو متحرک رکھتی ہیں اور ہمیں موقع دیتی ہیں کہ ہم اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لیے بحثیں اٹھائیں۔ جس داعی یا جماعت یا تحریک کی کوئی مخالفت ہی نہ کرے وہ مشکل ہی سے آگے بڑھ سکتی ہے۔

اس سارے سلسلۂ بحث و دلائل میں ایک ہی بات قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ قرآن میں کامیابی کا تصور کیا ہے؟

فرض کیجیے کہ ایک شخص اپنی بستی میں تعلیم بالغاں کی مہم شروع کرتا ہے اور سر توڑ کوشش کرتا ہے کہ لوگ اس سے تعلیم حاصل کریں، مگر ساری جان فشانیوں، صرفِ مال اور قربانی آرام کے باوجود وہ ہزاروں کی آبادی میں بہ مشکل دس بیس افراد کو سکھا پڑھا سکتا ہے۔ درآں حالیکہ اس پر لوگوں نے طرح طرح کے الزام لگائے ہوتے ہیں، کئی بار لوگ اس سے لڑے جھگڑے ہوتے ہیں، کئی طرحوں سے اُسے سازشی اور سی آئی ڈی کا آدمی قرار دے کر اُسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ہوتی ہے۔ اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑے بڑے جاگیردار اور نواب سلسلہ جنبانیاں کر کے نوجوانوں کی نئی نئی تنظیمیں بنوا دیتے ہیں اور وہ معلم اس حال میں آخری سانس لیتا ہے کہ نہ ایک کچے کوٹھے سے زیادہ کوئی جائے قیام وہ حاصل کر سکا، نہ اُسے اور اُس کے بچوں کو اچھی غذا اور اچھی خوراک ملی اور نہ دنیوی مفاد کے لیے کوئی مستقبل اس کے سامنے ہے۔

یہ کامیابی ہے، یا ناکامی؟

ایک شخص کہتا ہے کہ بڑی ناکامی ہے، کیونکہ بیس پچیس برس کی محنت کے باوجود بستی تعلیم حاصل نہ کر سکی اور نہ اس خدمت کے علم بردار کو کوئی اچھا نتیجہ ملا! دوسرا کہتا ہے کہ جی نہیں، جس شخص نے خلوص سے ایک نیک مقصد کے لیے جاں فشانی کی اور بظاہر اس کو حاصل کم ملا۔

ایسے شخص کو ایک تو ضمیر کے اطمینان کی نعمت حاصل رہی اور دوسرے آخرت میں اس کے لیے بہترین جزا ہے۔ ورنہ کون سی گارنٹی قانونِ الٰہی نے اسے دی ہے کہ وہ اگر کسی نیک کام کے لیے محنت کرے گا تو اُسے ضرور کامیاب کر دیا جائے گا۔

ایک آدمی چاہتا ہے کہ بیماری کا قلع قمع ہو جائے، دوسرا کوشاں ہے کہ ہر طرف صفائی کا بول بالا ہو، تیسرا چاہتا ہے کہ تاریکیاں چھٹ جائیں ـــــ اور ایسے تمام لوگ پوری پوری محنت کرتے ہیں، لیکن جو نتیجہ اُن کے سامنے ہوتا ہے، مطلوبہ مقدار و معیار میں وہ برآمد نہیں ہوتا، یعنی وہ تو اپنی طرف سے مساعی کا حق ادا کر دیتے ہیں لیکن مخاطب قوت اپنی ناقص ذہنیت کی وجہ سے ان کا ساتھ نہیں دیتی۔ حصولِ مقصد کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ کچھ حاصل نہیں ہوا جو جس قدر مطلوب تھا یا جس قدر محنت و ایثار سے کام لیا گیا تھا۔ لیکن اگر خدا کے ایک بندے کی حیثیت سے خدا کے پسندیدہ مقصد کے لیے کسی کے خلوص و خدمت کا پورا صلہ نہیں ملا تو آخرت میں تلافی ہو جائے گی۔

ایک مالکِ زمین کا ملازم کسان پوری محنت کرتا ہے، مگر فصل نہیں اُگتی، یا نہیں بڑھتی یا برباد ہو جاتی ہے۔ تو اگر اس کی کوتاہی نہیں تو اس کا سچا انصاف پسند مالک اُسے پورا پورا معاوضہ ادا کرے گا۔ یا ایک بادشاہ کا جنرل اگر جی جان سے دشمن سے لڑا اور فوج کو کماحقہٗ لڑایا مگر فوق الاختیار وجوہ سے شکست ہو گئی تو صحیح علم رکھنے والے انصاف پسند بادشاہ کی نگاہ میں وہ مجرم نہیں ہو گا بلکہ انعام کا حق دار ہو گا۔ ایک شخص عمارت کھڑی کرتا ہے اور وہ خاصی بلند ہونے کے بعد زلزلے سے گر پڑتی ہے، ایک ناخدا بڑی محنت سے کشتی کو کھے رہا ہے، مگر طوفان اٹھتا ہے اور کشتی ڈوب جاتی ہے تو وہ ڈوبنے والوں کا قاتل تو قرار نہیں پائے گا، لیکن کشتی سے محروم ہو جائے گا جو اس کا ذریعہ معاش تھی۔ ایسے واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسانی، محنت اور کوشش ایک قابل قدر چیز ہے، مگر ضروری نہیں کہ ہر بار اور ہر شخص کے معاملے میں اس کے ظاہری اور دنیوی نتائج ایک سے نکلیں۔

ایک رشوت خوار نے بڑی بلڈنگ کھڑی کر لی، ایک جاسوس نے دشمنوں سے مال لے کر زرخیز اراضی خرید لی، ایک عالمِ دین نے حکمرانوں سے گٹھ جوڑ کر کے کاروبار چلا لیا، ایک بنکار نے سود کی آمدنی کے بل پر بچوں کو اونچی تعلیم دلوا کر ڈاکٹر، انجینئر اور پی۔ سی۔ ایس افسر بنوا لیا،

ایک جواری نے جوئے کی بھاری رقم جیت کر اس سے ٹرانسپورٹ کا سلسلہ شروع کر دیا تو کیا یہ کامیابی ہے؟ قرآن کی تعلیم کے لحاظ سے نہیں!

ایک شخص اصولِ دین پر استوار رہتا ہے، دعوتِ حق کو آگے بڑھاتا ہے، سچائی کی حمایت کرتا ہے، فاقہ مستی کے باوجود رزقِ حرام سے دامن بچاتا ہے، مستکبرین زِمانہ کی خوشامد اور مترفین کی حاشیہ برداری نہیں کرتا، قانونِ حق کو زندگی میں غالب دیکھنے کے لیے دن رات تگ ودَو کرتا ہے، اس مقصد کی سرمستی میں وہ ایک جھونپڑے میں زندگی گزارتا ہے، اس کے ہاں صوفے قالین نہیں ہیں، کراکری نہیں ہے، آرٹ گیلری نہیں ہے، اس کا لباس تھوڑی قیمت کا ہے، اس کا کھانا بہت غریبانہ ہے، اس کے بچے تعلیم اور صحت کے لحاظ سے آگے نہیں بڑھ سکتے ــــ تو کیا یہ ناکامی ہے؟

ناکامی تو یہ ہوتی کہ وہ اپنے اُصول ومقاصد کو معاش ومال کے لیے ترک کر دیتا ہے۔

متذکرہ سطور(؟)ی مثالوں کی روشنی میں کسی نکتہ آفریں کا کہنا یہ ہے کہ جس نبیؐ یا مردِ صالح یا داعیٔ حق نے جتنا اثر پھیلانا اور جتنے لوگوں کا تزکیہ کرنا اور جس درجے کی تبدیلیاں پیدا کرنا چاہیں وہ بہ طورِ امرِ واقعہ اگر ہوگئیں تو یہ ہے کامیابی۔ حالاں کہ افراد کی سوانح عمریاں تاریخ کے واقعات، قرآن کی آیات اور حدیث کی وضاحتیں اس کے خلاف ہیں۔

اس دنیا کی حد تک اصل کامیابی دل اور روح کی کامیابی ہے۔ یہ کامیابی غریبانہ حالات میں، بلکہ جیل کی کوٹھڑیوں میں رہنے والوں اور پھانسی کے تختوں پر کھڑے ہونے والوں کو بھی حاصل ہوجاتی ہے، بشرطیکہ وہ ان منازل سے اپنے عقیدے اور دین اور مقصد کی خاطر گزریں۔

لیکن بے شمار عمارتوں والے، بینک بیلنس والے، گاڑیوں والے، طرح طرح کی تفریحات میں محو رہنے والے، لوگوں کے دلوں اور دماغوں اور ضمیروں کو خریدنے والے، کمزوروں پر ظلم ڈھانے والے، کبر واستکبار میں مبتلا رہنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں کبھی بھی دل کی خانہ خرابی، روح کی باطنی اذیت اور ضمیر کی نیش زنی سے ایک لمحہ کو نجات نہیں ملتی۔ وہ بہ ظاہر جامِ شراب چھلکا کر خوشی سے ناچتے دکھائی دیں گے، ان کو اندر سے سانپ اور کنکھجورے کاٹ رہے ہوں گے۔

یہ دو مختلف و متضاد کردار ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ ایک طرف غالب منظر دنیوی کامیابیوں کا اور دوسری طرف قلب وروح اور ایمان واخلاق کی ناکامیوں کا ہوگا۔ دوسری طرف منظر دنیوی ناکامیوں مگر قلب وروح کی شادابیوں اور ایمان واخلاق کی فصل بہاراں کا ہوگا۔ ہاں اسلامی معاشرے اور ریاست کے لیے وعدہ ہے کہ ایمان واخلاق کے ساتھ علم اور جاہ ومال کو جمع کر دیا جائے گا، مگر صرف اسی صورت میں جب کہ اس کے علم بردار فروغ وعروج کی شرائط پوری کر دیں۔

یہ طرزِ فکر جس کے لیے قرآن میں بے شمار واضح آیات ہیں، اگر کوئی ترک کر دے تو نہ وہ ''مَعِيشَةً ضَنْكًا'' کا مطلب پا سکے گا اور نہ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً کا۔

دین کے مخلص ترین خادم دعوتِ حق کو پھیلانے کی تمام کوششیں صرف کر دیتے ہیں، مگر برسوں میں وہ چند افراد سے زیادہ لوگوں کو متاثر کر کے ساتھ نہیں لے سکتے، دوسری طرف وہ دنیوی معاش کے لحاظ سے بھی دشمنوں سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ان کو کیا کہیے گا کہ یہ کس مقام پر ہیں۔ صاف بات ہے کہ وہ اپنی ڈیوٹی ادا کرنے کے لحاظ سے کامیاب اور مستحقِ انعام ہیں، مگر ظاہری دنیوی نتائج کے لحاظ سے انھوں نے دوسری طرح کی کامیابی کو معیارِ ذہن و کردار کبھی بنایا ہی نہیں تھا۔ نہ قرآن نے کسی سے یہ چاہا کہ تم پیغام پہنچا دینے کے بعد اس بات کے ٹھیکیدار بھی ہو کہ لوگوں کو یا اُن کی کثیر تعداد کو ضرور ہی اس پیغام کا قائل کر کے چھوڑو اور دشمنوں کو بھی اپنے جادۂ ہدایت پر چلا کر دکھا دو۔ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝۲۱ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝۲۲ (الغاشیۃ: ۲۱، ۲۲)

کامیابی و ناکامی کے مسئلے پر ایک خاص متجددانہ تفسیر اس لیے کی گئی ہے کہ اس نے نظامِ حق کو دائرۂ دین ودعوت سے خارج کر دیا ہے، یعنی راج پاٹ سامراجی طاغوتی طاقتوں کے قبضے میں ہو، منافقین کے پاس ہو یا مترفین و مستکبرین کے قابو میں آجائے اور سکہ ظلم کا چلے یا ملکی دولت کی لوٹ مار ہو رہی ہو، یا تقسیم معیشت کے نظام نے غالب ومغلوب دو طبقوں کی دائمی تقسیم کر کے غریب طبقے کو پسنے کے لیے وقف کر دیا ہو، یا قانون کے سایۂ عاطفت میں تعلیم الحاد، سود، بے حیائی، بے پردگی، غیر اسلامی تہذیب لادینیت اور مخالفِ اسلام نظریات اور فسق و فجور پرورش پاتے رہیں۔ خدا کے دین کے نقیبوں امر بالمعروف اور انہی عن المنکر کے علم برداروں کو حق نہیں کہ وہ اس نظام کی تبدیلی کی تحریک اٹھائیں یا انتخابی اور انقلابی مساعی عمل میں لائیں۔ بس ان کا کام برسر اقتدار بدی کے سائے میں نیکی کی تبلیغ کرتے رہنا ہے۔ ورنہ وہ ناکام رہیں گے۔

مکہ میں حضورؐ نے یاسرؓ اور آلِ یاسرؓ کو کبھی یہ نہیں کہا کہ تم اسلامی حکومت دیکھو گے، بلکہ صبر کی تلقین کی اور فرمایا کہ تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔

شہدائے بدر کو کیا پتہ تھا کہ اس جنگ کا کیا نتیجہ ہوگا اور بعد میں کیا کیا تصادم ہوں گے اور نظامِ حق برپا ہوگا یا نہیں۔

جن کمیونسٹوں نے سال ہا سال یورپ اور روس میں عذاب بھگتے ان کو پہلے سے کس نے بانڈ لکھ دیا تھا کہ تم ضرور کامیاب ہو گے؟

یہودیوں نے دو ہزار سال کی آوارہ گردی کے بعد اپنی آرزوئے وطن کو برطانیہ کی مدد سے عربوں پر ظلم کر کے پورا کر لیا۔ مگر ان پر جو کچھ گزری (صرف جرمنی ہی کے حالات دیکھ لیں) وہ کتنی بڑی اذیت تھی۔

یہ اہلِ باطل تو کامیابی کی گارنٹی اور ٹائم ٹیبل پہلے سے متعین کرائے بغیر محوِ سعی رہے اور خدا پرست مسلمان یہ پوچھتے پھرتے ہیں کہ اسلام کی کامیابی کی کیا گارنٹی ہے۔ ایسے لوگ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ ان کا پہلا قدم ہی ناکامی کا قدم ہے۔

جماعت اسلامی کیا ہے؟

ایک دوست نے سوال کیا:

''کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ جماعتِ اسلامی محض ایک عام سیاسی پارٹی کی حیثیت سے جانی اور پہچانی جاتی ہے یا اس کا کردار اسلامی و انقلابی جماعت کے طور اُبھرا اور نمایاں ہو رہا ہے؟

اسلامی انقلاب محض اسلام کی دانش وارانہ و علمی فوقیت و برتری سے برپا ہوگا یا اللہ تعالیٰ کی سنت کے حساب سے عملاً اسلامی نظام قائم و دائم ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کھلا اور صاف فرمان ہے کہ نہ اس کی سنت میں کبھی تبدیلی ہوئی، نہ ہوتی ہے اور نہ ہوگی؟''

اس کے جواب میں میری گزارشات یہ تھیں:

یہ بات کہ جماعتِ اسلامی کس حیثیت سے جانی اور پہچانی جاتی ہے، اپنی جگہ ایک الگ موضوع ہے، مگر اس وقت اہم پہلو یہ ہے کہ ہم لوگوں نے جماعت کو کس نقشے پر کھڑا کیا۔ اور اب تک کس شعور اور کس مقصد سے اس کا کام چلایا۔ اصولی طور پر یہ دینی جماعت ہے۔ اور اس کے سامنے چونکہ اقامتِ دین کا مقصدِ اعلیٰ ہے، جس کی راہ میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی رکاوٹیں ہیں، اس لیے اس کا راستہ محنت و جہاد کا وہ سخت راستہ ہے جسے آج کل انقلابی راستہ کہتے ہیں۔ دونوں باتوں کو جمع کریں تو جماعتِ اسلامی ایک اسلامی انقلابی جماعت ہی قرار پاتی ہے۔

یہ آپ کو مغالطہ ہے کہ ہمارے نقطۂ نظر سے اسلامی انقلاب محض اسلام کی دانش ورانہ و علمی فوقیت و برتری سے برپا ہوگا۔

اسلام کے غلبے کی مہم بہت سے تقاضوں کو پورا کرنے سے نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ سب سے

پہلے ایمانی و تعبدی پہلو، اخلاقی پہلو، دعوتی پہلو، عملی سرگرمیوں کا پہلو، علمی و ادبی پہلو اور سیاسی پہلو۔ ان میں سے کسی بھی چیز کو لفظ ''محض'' کے ساتھ آپ اگر ذریعۂ انقلاب قرار دیں گے تو یہ جماعت کا نقطۂ نظر نہ ہوگا۔

علمی برتری ویسے اپنی جگہ بڑی وقعت رکھتی ہے۔ سورۂ انفال کی آیت نمبر ۶۵ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم سے اگر سو افراد ہوں تو وہ ہزار کافروں پر غالب آئیں گے، '' کیوں کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔'' کیا سمجھ نہیں رکھتے ؟ اوّل تو یہ کہ جنگ کے لیے جو نظم اور ضوابط مسلمانوں نے نبیؐ کی رہنمائی میں دین کے مطابق اختیار کیے تھے وہ علمِ حق اور سمجھ بوجھ کا نتیجہ تھے۔ لیکن زیادہ اہم یہ بات ہے کہ کفار علم آخرت کے لحاظ سے کورے تھے اور مسلمانوں کے اندر آخرت کی حیاتِ دائمی اور شہادت کے نورانی ثمرات کا شعور موجود تھا۔

علاوہ ازیں علمی برتری تو آپ کو سمیناروں میں، مکالموں اور مذاکروں میں، ادب اور صحافت میں، زندگی کو سنوارنے اور باریک تہذیبی احساسات پیدا کرنے میں ایسا مقام دلواتی ہے کہ آپ حریفوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکلتے ہیں۔ اور آپ کے ساتھ ساتھ دعوتِ حق بھی عروج حاصل کرتی ہے۔

آدمی اپنے نظریہ و مقصد کو صرف جاہل عوام پر واضح کر سکے، مگر فلسفیوں پر، وکلاء پر، پروفیسروں پر، ایڈیٹروں پر، وزیروں پر اور جرنیلوں پر واضح نہ کر سکے تو دعوت ایک چھوٹے حلقے میں محصور رہے گی۔ ہر طبقے اور ہر دائرے میں غلبے کے لیے جملہ اقسام کے علوم کی برتری مطلوب ہے۔ سلف میں بھی بے شمار علمی کام غلبۂ اسلام کے لیے کیے گئے۔ ماضی قریب میں بھی ہوئے اور اب بھی ہو رہے ہیں۔

مگر ہم صرف قرطاس و کتاب تک محدود نہیں رہتے، خدمتِ خلق بھی کرتے ہیں، جیلوں میں بھی جاتے ہیں، جبر و تشدد بھی سہتے ہیں۔ مصر میں، سوڈان میں، شام میں، بنگلہ دیش میں اور دنیا کے ہر گوشے میں لوگ پتھر کھاتے ہوئے جادۂ عشق پر رواں ہیں۔

سیاست کے دائرے میں بھی ہم دعوت کے راستے نکالتے ہیں اور اصلاحِ احوال چاہتے ہیں، مگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ سیاست اتنی غالب آجائے کہ دینی و اخلاقی قدریں دب جائیں اور ہماری اساسی دعوتِ عام بے جان ہو جائے۔ یہاں تک کہ جماعتِ اسلامی کو محض ایک

سیاسی پارٹی سمجھا جانے لگے۔ اگر کچھ لوگوں کو ایسی غلط فہمی ہے تو ہمیں اپنے طرزِ عمل اور پالیسیوں کے توازن سے اسے جلد سے جلد رفع کر دینا چاہیے۔

ہم دین اور سیاست کو دو الگ چیزوں کی حیثیت سے لے کر پھر اُن کا ایک مرکب تیار نہیں کرنا چاہتے کہ اتنے گرام دین اور اتنے اونس سیاست۔ بلکہ ہم پہلے سے سیاست کو معاش، معاشرت، تعلیم کی طرح دین کا اپنا ایک تقاضا سمجھ کر کام کرتے ہیں۔

پس نہ دار مدار صرف علمی سرگرمیوں پر ہے، نہ محض سیاسی جدوجہد پر، بلکہ ان کے اپنی جگہ ضروری ہونے کے باوجود اقامتِ دین کی مجموعی مہم انقلابی نوعیت کی ہے۔

''سنت اللہ'' کے متعلق آپ کا ایک جملہ پڑھنے سے بات بہت واضح تو نہیں ہوتی، مگر یہ حقیقت ضرور کھل جاتی ہے کہ اس کا صحیح مفہوم اور دعوتِ دین اور جماعت دین سے تعلق آپ پر واضح نہیں ہو سکا۔

سنت اللہ کی اصطلاح قرآن میں جہاں جہاں استعمال ہوتی ہے، ان مواقع کو آپ بہ غور دیکھیں۔ سنت اللہ ایک ایسا قانونی نظام ہے جس کا بیش تر حصہ تقدیر سے متعلق ہے اور بہت سے حقائق غیب میں رہتے ہیں۔ اور ایک حصہ جو تدبیر سے متعلق ہے وہی ہمارا محورِ فکر ہے، مگر تدبیر والے حصے میں بھی تدبیر کا پوری طرح عمل میں آ جانا اور اس کے لیے وسائل کا جمع ہو جانا، اس کے لیے اعلیٰ درجے کے افراد کا مل جانا، ان افراد میں محبت، اتفاق اور نظم کا مسلسل کارفرما رہنا، پھر رُونما ہونے والے حالات و واقعات سے اثر لینا اور ڈالنا اور آخر میں کسی نتیجے کا برآمد ہونا، یہ سب کچھ پھر انسان کے بس میں نہیں ہے۔

سنت اللہ کا مطالعہ قرآن اور تاریخ کی روشنی میں یہ بتاتا ہے کہ اگر کوئی دعوت یا مقصد برحق ہو، اُسے صحیح طور پیش کیا جائے، اُسے پیش کرنے والوں کا ایمانی، اخلاقی اور تنظیمی معیار اعلیٰ درجے کا ہو، مخاطب معاشرے کا انسانی مواد کم سے کم اوسط درجے کی اچھی کوالٹی کا ہو اور لوگ دعوت کو بکثرت قبول کریں، پھر تاریخ کے مدّ و جزر بھی مفید ثابت ہوں تو نتیجۂ مطلوبہ برآمد ہو سکتا ہے۔ ان ''ضروریات'' میں کوئی ایک ضرورت پوری ہونے میں بھی کسر رہ جائے تو ازسرِ نو مساعی کرنی پڑتی ہیں۔

''سنت اللہ'' کا تصور یہ نہیں کہ آپ اس انتظار میں بیٹھ جائیں کہ سنت اللہ اپنا کام

کر رہی ہے، وہ کرتی رہے گی اور وہی اسلامی انقلاب نافذ کردے گی۔ سنت اللہ اس طرح خلا میں کام نہیں کرتی کہ آپ کچھ کریں کرائیں نہیں اور کام بن جائے۔ کسان کھیتی کو نہ جوتے نہ بوئے، مگر فصل بھر پور اُگ آئے۔

اب آپ ان گزارشات پر غور کریں اور کسی بات کی وضاحت کی مزید ضرورت ہو تو یہ ناچیز ہر خدمت کے لیے حاضر ہے۔ جہاں تک وقت اور قوت ساتھ دے۔

ایک سادہ تاریخی فارمولا

سنت اللہ کے تحت تاریخ میں جماعتوں اور تحریکوں کے جو کام ہوئے ان میں عقلی نقطۂ نظر سے حسبِ ذیل اجزا مل کر نتائج پیدا کرتے ہیں اور کوئی مقصد رونما ہوتا ہے:

- دعوت، اس کی صحت اور اس کا شعور۔
- مردانِ کار (انسانی قوت) بہ لحاظ تعداد، بہ لحاظ نظم و اتحاد، بہ لحاظ اخلاق و کردار بہ لحاظ اندازۂ قوتِ اعداء اور ان کے توڑ کی تدابیر، بہ لحاظ عہدہ مرتبہ۔
- کل سرمایہ (اور وسائل) کا صرف۔
- مدّت۔

ان کو مزاحمتوں اور مخالفتوں کے مقابلے میں رکھ کر دیکھا جائے۔

یعنی

(دعوت + مردانِ کار + سرمایہ + مدّت) ÷ مزاحمت (- تاریخی موافقین)

اس فارمولے کے تحت اگر مردانِ کار کی مناسب تعداد اور سرمائے کی مناسب مقدار اور وقت کی اچھی خاصی مقدار (اوسط درجے کی مزاحمتوں کے باوجود) نتیجہ نہ دے سکے تو مردانِ کار یا نظم یا طریقِ کار میں کوئی خلل ضرور ہوگا۔ اس کی تحقیق کرنی چاہیے۔ بعدازاں، آپ سنت اللہ پر غور کریں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

شخصیت اور طریق کار کی ایک جھلک

کسی اسلامی تحریک یا نظامِ جماعت کو چلانے کے لیے ذرا مختلف قسم کے اوصاف درکار ہیں۔ اس معاملے میں سرکارِ رسالت مآبؐ کی شخصیتِ مقدسہ اور ان کے مسلکِ پاکیزہ کا مطالعہ اوّلین ضرورت ہے۔ بعدازاں حضورؐ کی پیروی میں حضورؐ کے پروگرام کے مطابق اقامتِ دین کا کام کرنے والوں کا جائزہ لینا مفید ہوسکتا ہے۔

میں اِس نقطۂ نظر سے جب مولانا مودودیؒ کے حسنِ گفتار اور حسنِ کردار کو دیکھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شخص اپنے نبیؐ کی مشعل کو بلند کرنے اور اس کے گرد لوگوں کو جمع کرنے کے لیے خاص صلاحیتوں سے نوازا گیا تھا۔

میں جہاں صرف ایک چیز کو لیتا ہوں ـــــ محبت واعتماد۔

محبت واعتماد کا رویہ

وہ مرکز کے کارکنوں یا جماعتی رفیقوں یا آنے والے مہمانوں سے ہمیشہ محبت واعتماد کا معاملہ کرتے تھے۔ یہ کسی کو کبھی محسوس نہ ہوا کہ مولاناؒ اس پر کوئی شک رکھتے ہیں، اس کو ناپسند کرتے ہیں، کسی اور کو ترجیح دے کر اسے محسوس کراتے ہیں کہ ہمارے پاس تو تم سے بہتر لوگ موجود ہیں اور تم بھی اگر اُن جیسا بننا چاہو تو ہماری پسند کی ترازو پر پورے اترو۔ وہ ہر سوال یا اعتراض یا اختلاف پر تند و تیز بحث کر کے آدمی کو دبوچ نہیں لیتے تھے کہ اس کی جرأتِ اظہار ہی کچل جائے۔

حسنِ استدلال

وہ کبھی اتھارٹی اور اختیار نہیں جتاتے تھے۔ وہ کسی سوال کا جواب یہ نہیں دیتے تھے کہ بس یہ ہمارا فیصلہ ہے۔ نہیں، وہ بار بار مختلف لوگوں سے مختلف طرز پر استدلال کرتے رہتے۔ اہلِ علم سے، اہلِ اخلاص سے، اختلاف کرنے والوں سے، دفتر کے کارکنوں سے، معترضین سے۔ اس طرح وہ دلیل کی قوت سے آہستہ آہستہ میدان فتح کرتے چلے جاتے۔ بات کرنے والے کی بات کو کبھی کاٹ کر نہ رکھ دیتے۔ یہ نہ محسوس کراتے کہ یہ ہم پہلے سے جانتے ہیں یا اس پر ہم پہلے بات کر چکے ہیں یا بیان دے چکے ہیں۔ کسی کو یہ بھی نہ کہتے کہ تم کسی سازش کا شکار ہو، تم پر کسی غلط قوت کا اثر ہے۔

بلکہ ان کا بنیادی طریقِ کار محبت سے تبادلۂ خیال کرنا ہوتا، پھر اگر کوئی شخص ساتھی بنتا تو وہ اس پر پورا اعتماد کرتے اور اس کو ایسی ذمہ داری یا ایسا مقام تفویض کرتے کہ وہ ہکا بکا نہیں، بلکہ کانپتا رہ جاتا اور درخواست کرتا کہ مجھ سے بہتر آدمی مل سکتے ہیں۔ وہ فرماتے کہ آپ یہ کام کریں تو سہی، شاید آپ ہی موزوں آدمی ثابت ہوں۔ چناں چہ مولانا کا اعتماد میرے جیسے چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو بڑے بڑے کام کرنے کے قابل بنا دیتا۔

اُن کی بڑائی یہی تھی کہ جو ان کے قریب ہوا اُس کو انھوں نے احساس دلایا کہ تم ایک اہم آدمی ہو اور اُس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ آہستہ آہستہ وہ آدمی بلند تر ہوتا چلا جاتا۔

مجالسِ مشورہ میں

مشاورتوں (اور مجالسِ شوریٰ) میں وہ نہ تو پہلے سے طے شدہ فیصلہ یا اسکیم یا منصوبہ لے کے آتے اور نہ جملہ ارکان سے الگ پہلے کسی گروپ کو کسی خاص اَمر کے لیے تیار کرتے، بلکہ صورتِ حال کا نقشہ سب سے سننے کے بعد کوئی ایک سوال سامنے رکھ دیتے مثلاً انتخاب میں حصہ لینا چاہیے یا نہیں اور پہلے سے اپنی طرف سے کوئی رجحان سامنے لائے بغیر تمام رفقاء کو آزادانہ اظہارِ خیال کا موقع دیتے۔ یہاں تک کہ بات نتھر کر کسی ایک رُخ پر آ جاتی۔ پھر وہ پھیلے ہوئے الفاظ اور خیالات کو سمیٹ کر سب سے یہ دریافت کرتے کہ کیا آپ کا نقطۂ نظر یہ ہے؟ اگر محسوس ہوتا کہ فیصلے کا مرحلہ نہیں آیا، بلکہ اختلافی رجحانات موجود ہیں تو اجماع و اتفاقِ رائے پیدا کرنے

کے لیے بحث کے خاص پہلوؤں پر توجہ دلا دیتے کہ یہ اور یہ باتیں بھی زیرِ غور لا کر سوچیں۔ تا آں کہ دو تین دور گفتگو کے چل کر کوئی ایسا فیصلہ طے پاتا جس پر پوری مجلس متفق الرائے ہو جاتی اور بالعموم کسی کے دل میں گھٹن نہ رہ جاتی کہ میری بات کو دبایا گیا ہے۔ اگر کسی فرد کو شکایت ہوتی تو ایک آدمی کے لیے ساری بات کے اجزاء پھر سامنے لاتے۔ بہت ہی کم مواقع پر معمولی اقلیت کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ ہمارے خلاف کوئی خاص دباؤ ہے یا محاذ ہے، بلکہ غیر اختیاری طور پر مجلس میں کامل اتفاقِ رائے پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایسے حضرات اپنی آراء کو ایک طرف رکھ کر بہ خوشی اکثریتی فیصلے کی علم برداری میں تعاون کرتے۔

جماعتی قیادت اور ملکی سیاست

میرا خیال ہے کہ اسلامی نظامِ جماعت کی امارت اور اس کی تنظیم و تربیت کے بھاری کام کے لیے موجودہ دور کے لحاظ سے بہترین نمونہ سید مودودیؒ نے نہ صرف عملاً پیش کیا بلکہ تحریری طور پر اپنے طریقِ کار کا ریکارڈ بھی چھوڑا اور عملی کردار کے گواہ بھی ابھی موجود ہیں۔

مولاناؒ کی صحتِ قیادت اور ان کی روشِ محبت و اعتماد کا راز یہ تھا کہ وہ تحریک کے کام کو اصلاً اقامتِ دین کا کام اور اس کام کے ہر ضروری جزء کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے سیاست کو کاملاً تابع دین رکھا۔ دین سے آزاد ریاست، دین سے آزاد جمہوریت یا دین سے آزاد انتخابات کا کوئی تصور دور دور تک ان کے ہاں نہ تھا۔ دین کی رہنمائی، مقاصد اور سرگرمیوں اور رابطوں میں بھی کارفرما رہتی۔ انھوں نے ووٹوں یا سیٹوں کے زیادہ تعداد حاصل کرنے کے لیے ایسے طریقے یا ایسے رابطے کبھی اختیار نہیں کیے جو دینی اصولوں کے خلاف ہوں۔

رفیقوں اور کارکنوں کی اہمیت

مولانا مودودیؒ کی ایک عظیم خوبی یہ تھی کہ وہ اونچے سے اونچے مرتبے پر ہوتے ہوئے نچلی سطح کے کارکن تک برادرانہ یک جہتی کا گہرا رابطہ رکھتے تھے۔ خط و کتابت کے ذریعے، گفتگوؤں کے ذریعے، اپنی شام کی مجلسِ عام کے ذریعے، دوروں میں ایک ایک کارکن

سے ملاقات کے ذریعے وہ اپنے رابطے کو گہرا کرتے رہتے تھے۔ وہ کارکنوں کا ذہن جس طرح کئی سال میں تشکیل کرتے تھے، پھر اس بات کا لحاظ کرتے تھے کہ وہ کوئی ایسا فیصلہ و اقدام محض منصبِ امارت یا مجلسِ شوریٰ کے اختیارات کی بنا پر نہ نافذ کردیں جو خود ان کی بنائی ہوئی ذہنیت سے ٹکرائے اور ان کی اپنی ہی دی ہوئی تربیت کی فصل کو ویران کر دے۔ ان کی خاص صلاحیت تھی کہ وہ تحریک کے اصول و مقاصد کو، جماعت کی روایات و اقدار کو، کارکنوں کے ذہن و مزاج کو پوری طرح نگاہ میں رکھتے تھے اور یہ اندازہ کر لیتے کہ کس معاملے میں کس وقت جماعت اس کے کارکنوں کے جذبات و احساسات کیا ہیں اور ان کی مانگ کیا ہے اور ان کی نفرت کا رخ کدھر ہے اور ان کی محبت کی سمت کدھر ہے، کس بات پر وہ جمع ہوں گے، کون سی چیز ان کو کشا کشی میں ڈال دے گی یا بکھیر دے گی۔ نتیجہ یہ کہ وہ کسی مسئلۂ خاص کو بھی اصولِ دین اور مصالحِ شرعیہ کے تحت خوب جانچتے اور پھر کارکنوں کے ذہن کے تحریکی مزاج کا بھی صحیح ناپ تول کرتے۔ پھر جب وہ کوئی بات کہتے تو لوگوں کے چہرے روشن ہو جاتے اور دل کھل اٹھتے اور ان میں کام کرنے اور آگے بڑھنے اور قربانیاں دینے کی اسپرٹ جاگ جاتی۔ سب کے دل جمع ہو جاتے۔ بہت ہی کم کبھی ایسا ہوا کہ کچھ جزئی امور پر کارکنوں کا فوری طور پر پورا پورا اطمینان نہیں ہوا، لیکن پھر بھی وہ تھوڑی بہت افہام و تفہیم ہو جانے پر جادۂ فرض پر خوش خوش متحرک ہو گئے، یعنی اوپر سے نیچے تک رشتۂ اعتماد بحال رہا۔ اندریں صورت تمام کارکن یہ سمجھتے تھے کہ مولانا مودودیؒ خود کوئی بیان دیں، فیصلہ ہو یا مجلسِ شوریٰ میں کوئی بات طے ہو، ہم سب کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور ہمیں اہمیت دی جاتی ہے۔ کم سے کم یہ تو بالکل طور طریق نہ تھا کہ کارکنوں کی تحقیر کر کے انہیں کوئی ادنیٰ درجے کی چیز قرار دیا جائے یا یہ ظاہر کیا جائے کہ کارکنوں کا ذہن یا نقطۂ نظر کچھ بھی ہوا کرے، فیصلہ کرنے والے تو ہم ہیں جس پر انہیں لازماً عمل کرنا ہوگا۔ سوچنے اور بات کہنے کا یہ انداز ہی خطرناک ہے۔ یہ ہماری خاص طرز کی تنظیم کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ ہم تو اپنے ہر کمزور ساتھی کو بھی احساس دلانا چاہتے ہیں کہ تم بہت اہم ہو اور ہم تمہیں ساتھ لے کے چلیں گے اور تم جو جذبات و احساسات رکھتے ہو اور جو کچھ تم نے لٹریچر اور تنظیم سے حاصل کر کے اپنا ذہن بنایا ہے، اس کا ہم پورا لحاظ رکھیں گے۔ تم اس مشینری کا لازمی حصہ ہو۔ تم سوال بھی کرو، مشورے بھی دو، اعتراض بھی اٹھاؤ، پریشانی بھی ظاہر کرو۔ ہمیں تمہارے اس تعاون کی ضرورت ہے۔ یہ طرزِ عمل تھا جو مولانا مودودیؒ

نے اختیار کیا اور میں یا کوئی اور جس نے ان کے ساتھ کام کیا ہو، وہ اس کے گواہ ہیں۔

ایسی بہت سی باتیں ہیں مولانا مودودیؒ کے متعلق جاننے کی اور پوچھنے اور بتانے کی! افسوس کہ میرے قویٰ بھی محدود ہیں، وقت بھی محدود ہے اور ترجمان کے صفحات بھی محدود ہیں۔

مولاناؒ مجالسِ عصر میں

مولاناؒ کے جذبۂ محبت نے جواباً ان کے ہر رفیق اور قاریٔ ترجمان القرآن میں بھی ایک جذبۂ محبت پیدا کر دیا تھا۔ اسی طرح مولانا کو اپنے اوپر اعتماد تھا (علم کے پہلو سے بھی اور فکر اور اخلاق کے پہلو سے بھی) اور اس بنیادی اعتماد نے ساتھیوں میں بھی اعتماد ابھار دیا تھا۔ اس دوطرفہ اثر و تأثر نے ایک اہم تجربے کو وجود دیا۔ یہ تھیں مولانا مودودیؒ کی مجالسِ عصر۔ لوگ نمازِ عصر سے پہلے ہی آنا شروع ہو جاتے، لان میں چٹائیاں بچھی ہوتیں، ان پر دھوپ میں لیٹتے اور بیٹھتے۔ باہر سے جو حضرات لاہور میں آتے اُن کا بھی یہ پروگرام ہوتا کہ عصر کو ۵-اے ذیلدار پارک (اچھرہ[1]) جانا ہے۔ اذان ہوتی، سب وضو کرتے جماعت کے وقت پر مولانا تشریف لاتے اور جب تک آخری دو تین سال کا دورِ معذوری شروع نہیں ہوا (جس میں وہ کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے) مولاناؒ خود ہی امامت کراتے، دعا ہوتی۔ پھر کرسی پر تشریف رکھتے۔ دفتر کے کئی اصحاب، اچھرہ کے متعدد محبّ اور کارکن، لاہور سے شائقین کی خاصی بڑی تعداد جن میں نوجوان زیادہ ہوتے، مولانا کے گرد حلقہ بند ہو جاتے اور کوئی اعلیٰ ہو یا ادنیٰ کسی بھی قدیم یا جدید، علمی یا سیاسی، دینی یا سائنسی موضوع پر مولانا سے بے تکلف سوال کرتا اور جواب سنتا۔ مستشرقین اور لادینیت پسندوں اور اشتراکیوں کے اٹھائے ہوئے تازہ ترین شوشے زیرِ گفتگو آتے، فیملی پلاننگ اور عطیۂ چشم (قرنیہ) کے علاوہ عائلی قوانین اور عیدین اور رویتِ ہلال کے مسئلے پوچھے جاتے، امیرِ جماعت یا شوریٰ کے صادر کردہ فیصلوں پر گفتگو ہوتی، مذہبی جماعتوں اور ان کے شہرت یافتہ عالموں کی طرف سے کوئی شگوفہ پھوٹتا تو اس پر بھی غور ہو جاتا۔ بعض امور لطیفوں کی شکل میں بیان ہوتے، بعض موقعوں پر مولانا کسی سوال کا جواب لطیفے میں دیتے۔ شہر اور بیرونی علاقوں میں جن

---

(۱) ''۵-اے ذیلدار پارک'' کے نام سے مولانا کی عصری مجالس کی کچھ مختصر روداد یں (ڈائری کی طرز پر) البدر پبلشرز، اردو بازار کی طرف سے دو حصوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ جنہیں ڈاکٹر رفیع الدین اور مظفر بیگ ایڈیٹر ''آئین''، لاہور نے مرتب کیا ہے۔

جن جماعتی سرکلروں یا پالیسیوں یا حکومتی کارروائیوں سے کسی طرح کے تأثرات پائے جاتے وہ سب مولانا کے سامنے آجاتے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ مولانا مسائل پر غور کرتے وقت بہم شدہ معلومات سے استفادہ کرتے۔

اس مجلس میں کبھی کسی غریب اور اَن پڑھ اور نوعمر فرد پر اس خوف کا آسیب سوار نہیں ہوا کہ مولانا کسی سوال یا اعتراض یا تنقید پر کوئی ایسا ردِ عمل تو نہ دکھائیں گے جو ان کی طرف سے سائل کے لیے ڈانٹ یا تضحیک کی صورت اختیار کر لے۔

مولانا کی شخصیت کے حسن کا یہ وہ پہلو تھا کہ جو لوگ کبھی اتفاقاً بالمشافہ ان سے مجلسِ عصر کے وقت ملاقات کرتے وہ یہ سارا نقشہ دیکھ کر حیران رہ جاتے اور مولانا کے متعلق غلط فہمیوں اور بدقیاسیوں پر ان کے قائم شدہ زنگ آلود تصورات ٹوٹ گرتے۔

اس مختصر مضمون میں میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، مولانا کے قریب رہنے والے ایک تحریکی کارکن کی حیثیت سے کیا ہے۔ امید ہے کہ میری یہ گزارشات بہت سے احباب کے لیے کم از کم اس حیثیت سے مفید ہوں گی کہ دین کی راہ میں بہ حیثیت قائد کسی خادمِ دین کو متاعِ محبت واعتماد کی کتنی ضرورت ہے۔

اپنا جائزہ و اِحتساب

سچا داعی تو وہ ہوتا ہے جس کے اندر ہی اندر پمفلٹ بھی موجود رہتے ہیں اور پوسٹر بھی، وہ خود اپنے آپ کو ڈیوٹی پر مامور اور ذمہ دار سمجھتا ہے، وہ ہر روز اپنے ضمیر کے راستے سے خدا تک پہنچتا ہے۔ اور وہ اپنی محفل خود آراستہ کر لیتا ہے۔ بدلے ہوئے حالات میں وہ کام کرنے کی راہیں خود ایجاد کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خود ہی اُکساتا ہے اور از خود حرکت کرتا ہے۔

اصول اور مقاصد متعین ہیں، دین کا معلمانہ اندازِ کار بھی واضح ہے کہ زیادہ سے زیادہ افراد کو حق کا شعور دلانا ہے۔ دینی لٹریچر کا ایک ذخیرہ بصیرت کی روشنی پانے کے لیے موجود ہے، ہر قسم کے حالات میں کام کرنے کے مختلف تجربوں کا سرمایہ ساتھ ہے، مخالف نظریات اور اداروں اور تحریکوں سے تعارف حاصل ہے، فتنوں کا اندازہ ہے تو پھر ایک سچے داعی کو اگر اسکیمو لینڈ میں بھی اُتار دیا جائے تو وہ کام کرنے کا راستہ نکال لے گا۔

ضرورت باہر سے کسی چیز کی اتنی نہیں ہے، جتنی اندرون کو زندہ و منور کرنے کی ہے۔

اپنی تدریجی غرقابی کا الزام

رفیقِ عزیز! کہیں ایسا تو نہیں کہ خود تمہاری شخصیت کے شاخ سار میں ناکارگی اور سہل انگاری نے آشیانے بنا لیے ہوں، خود تمہارے اندر جذبۂ بیتاب موجود نہ ہو، خود تمہارا ایمان تمہیں پوری طرح روشنی نہ دیتا ہو، خود تمہارا ضمیر افیوں خوردہ ہو، خود تم نے زندگی میں بہت سے نمایاں قسم کے تضاد پال لیے ہوں اور ہر قسم کے حالات اور عناصر کے ساتھ تم نے سمجھوتے کر لیے ہوں؟

تمہارا حال اگر خدانخواستہ اس پیراک کا سا ہو جس نے جسم کے ساتھ بھاری پتھر

باندھ رکھے ہوں اور ہاتھوں اور پیروں کو زنجیروں سے جکڑ رکھا ہو تو پھر کوئی مودودیؒ، کوئی سید قطبؒ اور کوئی خمینی یا کوئی نظامِ جماعت تمہیں ڈوبنے سے بچا نہیں سکتا، لیکن ستم ظریفی ہوگی، اگر تم نیچے ہی نیچے جاتے ہوئے اپنی تدریجی غرقابی کا الزام دوسروں پر رکھو۔

قومیں اور تحریکیں اور جماعتیں وہی کامیاب ہوتی ہیں جن کا ہر فرد سب سے پہلے اپنی جگہ یہ سوچتا ہے کہ میرا فرض کیا ہے اور آیا میں اپنا فرض پورا کر رہا ہوں؟ جہاں جہاں فرد کے اندر ذاتی ذمہ داری کا یہ احساس موجود ہوتا ہے، وہاں یہ ضرورت نہیں پڑتی کہ آدمی اپنی کوتاہیوں کا بوجھ اُٹھا اُٹھا کر دوسروں پر ڈالے اور اس تلاش میں رہے کہ کس کس پر کتنا کتنا یہ بوجھ ڈالا جا سکتا ہے۔

براہِ کرم اپنا پورا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھانے کی کوشش کیجیے۔

کچھ اور خطرات

رفیقِ عزیز! کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے اندر کچھ ہم سفروں کے لیے کینہ وکد کا مخفی اڈہ ہو اور انہیں سامنے رکھ کر ایسے موضوعات ڈھونڈو، ایسی بحثیں چھیڑو اور ایسے مصرعے اٹھاؤ، جن کی زد اُن پر پڑ سکتی ہو۔

کہیں تمہارے اندر کچھ افراد کے لیے انتقامی رجحانات کی لہریں تو نہیں اٹھتیں کہ جن کے تھپیڑے اُن افراد ہی کو نہ لگتے ہوں بلکہ ساتھ ساتھ دین کی دعوتی سرگرمیوں کو بھی تلپٹ کر دینے والے ہوں۔

کہیں تمہارے اندر ایسی کدورتیں اور بیزاریاں تو موجود نہیں ہیں جن کی وجہ سے جو کچھ کام ہو رہا ہو، اُسے بھی نقصان پہنچتا ہو۔ اور ایک چھپی ہوئی بیماریٔ دل کی چھوت آہستہ آہستہ دوسروں کو بھی لگتی رہتی ہو۔

کدورتوں اور بیزاریوں کا حساب ایسے دوستوں کی فہرست مرتب کر کے لگایا جا سکتا ہے جن کے قریب جانے اور ربط وضبط رکھنے اور جن کے لیے کلمۂ خیر کہنے سے آدمی اجتناب کرتا ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے سر میں کچھ بننے اور آگے بڑھنے اور بڑھ کر کچھ پا لینے اور بنا لینے کا سودا موجود ہو۔ کچھ شہرت کا لپکا، کچھ پبلسٹی کا چسکا، کچھ کیمرے کی چشم بلوریں کی مسحوریت، کچھ اپنے لیے مقامِ اعتبار (Goodwill) حاصل کرنے کا جنون اور کچھ اپنا نقش اُجاگر کرنے کا خبط۔

یہ سب آسیب ہیں۔ کہیں یہ آسیب تو سایہ نہیں ڈال رہے۔ بہ ظاہران محرکات کے تحت آدمی قوت سے بڑھ کر تگ وتاز کرتا ہے مگر اصلی مقصد کے لحاظ سے کوئی خاص مؤثر پیش قدمی نہیں ہوتی۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ جہاں کہیں کوئی مخالف مل جائے اس پر تمہیں پیار آتا ہو اور ایسے لوگوں کے ٹیڑھے نظریات سے فوراً ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہو۔ یہ بھی غلط عوامل کا نکاس ہے۔

پیارے ساتھی! ان ساری باتوں کو سامنے رکھ کر اپنا ذہنی تجزیہ خود کرو۔ اور اپنی نیت کے چشمے کو گدلا کرنے والی ہر چیز کو باہر نکال پھینکو۔ یہی راہِ فلاح ہے۔ کیوں اپنے آپ کو خراب کرتے ہو اور اپنے ساتھ دوسروں کو مشکلات میں ڈالتے ہو۔

کدورتیں اور نفرتیں اور مخفی انتقامی جذبے ذہن کی کمین گاہوں میں چھپ کر وار کرنے والے رہزن ہیں۔ یہ منفی قوتیں اسلام کے کسی سپاہی کے لیے سخت ضرر رساں ہیں۔ اِن کی وجہ سے اصل دعوت اور اصل مقصد کو جو نقصان پہنچتا ہے اور خدا کی راہ میں محنتیں کھپانے والے اچھے بھلے سپاہیانِ حق کے اندر جو اضطراب اور انتشار پیدا ہوتا ہے، آخرت میں اس کا حساب کتاب ہونا ہے۔ آج خود ہی آڈٹ کر کے دیکھ لو کہ تمہارے حساب کتاب کے اس کھاتے کی میزان درست ہے؟

یہاں تو آدمی اپنے رویوں کا ذہنی و جذباتی پسِ منظر چھپا سکتا ہے، خوب صورت تاویلیں کرسکتا ہے، پُر زور دلائل دے سکتا ہے، بہترین لفاظی کرسکتا ہے، مگر آخرت پر ایمان رکھنے والوں کو تو اپنے مرعوب کُن دلائل اور خوش نما تاویلوں کے پسِ منظر میں کام کرنے والے مخفی عوامل کو اچھی طرح شناخت کر لینا چاہیے اور اس کا اندازہ بھی کر لینا چاہیے کہ وہاں کی عدالت میں اعمال کے عیاں اور پنہاں پہلوؤں کو واضح کر کے کیسی جرح کی جائے گی۔ اور کیا اُس جرح کا سامنا کیا جاسکے گا۔

ڈوبتوں کو بچاؤ

دیکھو کہ جس خطۂ زمین کو تم نے مسجد کی مانند قرار دیا تھا، کیوں کہ یہ اسلامی نظام کے لیے وقف ہو چکی ہے، اُس کے گرد خطرات منڈلا رہے ہیں اور اس کے اندر سیاسی گھٹن کے علاوہ اخلاقی بحران پھیلا ہوا ہے۔ دولت پرستی، زرِحرام کی چاٹ، رشوت، خیانت، قانون شکنی، کام

چوری، کم زوروں پر ظلم، مجبوروں کا استحصال، ڈاکے اور اغوا، اسراف اور تبذیر، فحاشی اور جنس پرستی، طبقاتی، فرقہ وارانہ اور علاقائی نزاعات جیسے کتنے ہی روگ پھیلے ہوئے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ایک سیلابِ بلا ہے جو ٹوٹ پڑا ہے۔

عزیز ساتھی! تمہارا کام یہ ہے کہ ذہن سے سارے پراگندہ خیالوں کو جھٹک دو اور کوئی ساتھی ملے تو بہت اچھا، نہ ملے تو تنِ تنہا نکل کھڑے ہو، کہیں سے رہنمائی اور مشورہ حاصل ہو تو بہت خوب، ورنہ قرآن و حدیث سے رہنمائی لو اور صحت مند دینی لٹریچر سے مشورہ طلب کرو۔ ایک ایک اور دو دو کر کے، سروسامان کے ساتھ بھی اور بے سروسامانی کے عالم میں بھی خدا کی راہ میں قدم بڑھاؤ۔

ڈوبتوں کو بچاؤ، جو ابھی تک ڈوبنے سے بچے ہوئے ہیں ان کو محفوظ بلند مقامات پر پہنچاؤ۔ جو محفوظ ہو گئے ہیں اُن کو روحانی غذا دو۔ جو بیمار ہیں اُن کو دواخانۂ ایمان واخلاق سے ادویہ فراہم کرو۔ جو وَبازدگی کے خطرے میں ہیں اُن کو خوفِ خدا کے انجکشن لگاؤ۔

کام اتنا ہی نہیں، تمہاری ذمہ داری یہ بھی ہے کہ سیلاب کی آفت سے بچ نکلنے والوں کو تم جہاد کے لیے تیار کرو۔ جہاد کے لیے اوّلاً صحیح اعتقاد کی ضرورت ہے، جہاد کے لیے اتحاد کی ضرورت ہے اور جہاد کے لیے اجتہاد کی ضرورت ہے۔ اسلام میں کوئی لمحہ ایسا نہیں آتا کہ فریضۂ جہاد ساقط ہو جائے۔ کبھی تلوار سے جہاد، کبھی زبان و قلم سے جہاد، کبھی جسم اور مال سے جہاد اور کبھی دل و دماغ سے جہاد۔

اُٹھو! کتنے بھاری فرائض تم کو بلا رہے ہیں۔

سب سے پہلی صف جہاد[1]

ایک عجیب جماعت جو ہو گزری

اس زمین پر، اس آسمان کے نیچے آج سے پہلے بھی ایک جماعت ہو گزری ہے جس جماعت میں قلیل تعداد میں لوگ جمع ہوئے، لیکن ایسے اوصاف کے ساتھ جمع ہوئے، ایسی ذمہ داریاں اٹھا کر جمع ہوئے کہ وہ جماعت جب اٹھی تو اس نے اس پوری دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔

ایک شہر کا نہیں،

ایک ملک کا نہیں،

آس پاس کے تمدنوں کا نہیں،

بلکہ یہ کہ اس جماعت کے قافلے کے قدم ایک طرف دریائے ڈینیوب کے ساحلوں پر تھے اور دوسری طرف اس کے قدم دریائے والگا کے ساحل پر، تیسری طرف اس کا ایک پڑاؤ جمنا کے کنارے پر تھا۔

یہ ایک فوج گزری ہے جس کی یادگار ہم سب لوگ ہیں۔ یہ ایک جماعت تھی۔ اس جماعت کو ایک کلمۂ طیبہ پر ایمان حاصل تھا۔ اس کے سامنے ایک نصب العین تھا اور یہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیار کردہ جماعت تھی۔ یہ امتِ وسط کی حیثیت سے اٹھائی گئی تھی۔ یہ شہداء علی الناس بن کر اٹھنے والے لوگ تھے اور ''اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ'' کے مقام پر فائز تھے۔

---

(۱) یہ ایک تقریر ہے جو جماعت اسلامی صوبہ پنجاب کے زیر اہتمام اپریل ۱۹۸۷ء کو منصورہ لاہور میں منعقد ہونے والے اجتماعِ عام میں کی گئی۔

کھیتی کی طرح انھوں نے ایک ایک سوئی، ایک ایک کونپل زمین سے نکالی۔
پھر وہ کونپل مضبوط ہوتی گئی۔
پھر وہ اونچی ہوئی۔
پھر وہ اس طرح چھا گئی کہ وہ اپنے کاشت کرنے والوں کو بڑی بھلی لگتی تھی۔

تو یہ اس طرح کی کھیتی کی مثال تھی۔ لیکن اس کا ایک خاص مقصد تھا۔ یہ جماعت کہاں سے کہاں تک پہنچی۔ اس کی داستان بہت طویل ہے جس کو مختصراً میں نے آپ کے سامنے یہاں بیان کیا۔ یہ کس تیزی کے ساتھ چند سالوں کے اندر اس کرۂ ارض کے ہر معروف گوشے میں پہنچ گئی اور اقتدار کے ساتھ، اخوت کے ساتھ، علم کے ساتھ پہنچی اور بڑے بڑے کارناموں کے ساتھ پہنچی، لیکن اس پر بھی پھر اک دورِ زوال آیا۔

اس تاریخی واقعہ میں صرف ایک بات البتہ طے کرنی ہے، وہ یہ کہ اس جماعت کے اندر اتنی بڑی قوت کیسے پیدا ہوگئی؟ اس کو میں اس گفتگو میں واضح کرنا چاہتا ہوں۔

دورِ زوال

یہ جماعت جب دورِ زوال سے دوچار ہوئی تو اس پر نہ صرف تاتاریوں کے حملے ہوئے، نہ صرف صلیبیوں نے یورش کردی، نہ صرف اس کے اندر طرح طرح کے باہمی تصادم پیدا ہوئے، نہ صرف یہ کہ اس کے اندر سے اس کے دین کے خلاف اور اس کے اقتدار کے خلاف اور اس کی یک جہتی کے خلاف فتنے اُٹھے، بلکہ اس کے اندر سے تفرقہ کی وبا نمودار ہوئی۔ اس کے اندر کئی کئی گروہ بندیاں بن گئیں۔ ہر گروہ بندی نے الگ اپنا ایک گھر بنالیا۔ الگ ایک مورچہ بنالیا اور پھر آپس میں محاذ آرائیاں شروع ہوگئیں اور یہ برسوں تک چلیں اور شدّت اختیار کرتی چلی گئیں۔

اُدھر ایسی آفات کی زد میں آئی ہوئی اس جماعت پر آخری دور میں جو سب سے بڑا عذاب آیا وہ یہ تھا کہ مغربی قومیں نئی قوتوں کے ساتھ سامراجیت کے علم لے کر ان کے اوپر ٹوٹ پڑیں۔ جہاں جہاں مسلمان آباد تھے، جہاں وہ اقتدار میں رہے تھے اور جہاں وہ اقتدار میں نہیں تھے، ہر اس جگہ سامراجیت پہنچی اور اس نے مکر وجور کی ساری قوتوں کے ساتھ دوسری تمام قوموں سے بڑھ کر مسلمانوں کو کچل دینے کی کوشش کی، کیوں کہ مسلمانوں کے اندر وہ قوت موجود تھی، جس

قوت کے ذریعے یہ آئندہ بھی ملک اور دنیا میں انقلاب لا سکتے تھے۔

سامراجی یورش اور اس کے چڑھاؤ کے دور میں مسلمانوں نے بڑی بڑی تباہیاں دیکھیں جن میں لوگ پس گئے۔

اس کے خون سے زمینیں جگہ جگہ خون رنگ ہوگئیں۔

پھانسیاں لگ گئیں۔

پھانسیوں سے لوگ لٹک گئے۔ یہاں اس سرزمین پر جو کچھ ہوا اس کو اگر آپ یاد کریں تو آپ کو اندازہ ہوسکتا ہے کہ کیا ہوا۔

مہدی سوڈانی کی تحریک کے ساتھ کیا ہوا؟

دوسرے ملکوں میں کیا ہوا؟

اس قوم کا جوہرِ زندہ

یہ سارا کچھ اس قوم پر سے گزرا، لیکن اس میں ایک چیز باقی رہی، وہ یہ کہ اس نے مصیبتوں اور کمزوریوں کے باوجود باطل کی مقاومت کی اور مقابلہ کیا اور اس کے خلاف مزاحمت کی۔ کہیں بھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نے ہم آہنگی کرلی ہو اور اس نے سر جھکا دیا ہو اور اس نے اپنے آپ کو دوسروں کے حوالے کر دیا ہو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کھڑی کی ہوئی جماعت کے انتہائی زوال یافتہ لوگوں میں بھی اگر ایمان کی رتی تھی تو وہ اس موقف پر جمے رہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ظلم کی قوتوں کے سامنے جھکنے نہیں دیا۔

دوسرا یہ کہ ان ساری ناکامیوں، دکھوں اور اذیتوں کے بعد ان کے اندر جذبۂ احیاء پیدا ہوا کہ ہم پھر وہی جماعت بنیں گے، وہی انقلاب لائیں گے اور پھر وہی تبدیلی پیدا کریں گے، یعنی ؎

ہم پھر وہی نغمہ گائیں گے!

یہ دنیا کی واحد قوم ہے جس میں اتنی بڑی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد بھی جذبۂ احیاء زندہ رہا۔ یعنی یہ ایمان وشعور کارفرما رہا کہ وہ اپنے آپ کو دوبارہ اپنے پیروں پر پوری طرح کھڑا کرسکتی ہے جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑا کیا تھا۔

رسول اللہؐ کی جماعت کی خصوصیات

آیئے! ذرا سوچیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر اُٹھنے اور حضورؐ سے تعلیم و تربیت پانے والی جماعت کی غیر معمولی قوت کا راز کیا تھا؟ اس کا راز یہ تھا کہ جو لوگ، جو ہستیاں اس میں شریک ہوتی تھیں، جن سے یہ جماعت مرکب تھی ان ہستیوں نے ایک کلمے کے اوپر سودا کر لیا تھا، اپنے جان و مال کا اور اپنی پسند و ناپسند کے اختیار کا، صرف ایک چیز کے بدلے میں کہ خدا کی خوشنودی حاصل ہو اور خدا کی جنت میں جگہ ملے۔ پھر اپنی ساری چیزیں انھوں نے لا کر ڈھیر کر دیں۔ جماعت کے آگے، تحریک کے آگے، اس انقلابی مہم کے آگے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھائی تھی۔ بیعت کی اور بیعت کے اندر یہ معاہدہ کیا کہ ہم نے اپنا سب کچھ پیش کر دیا۔ قرآن کریم میں اس کا ریکارڈ موجود ہے۔

یہ میں اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ وہ جو ساری تبدیلی واقع ہوئی تھی وہ اس وجہ سے واقع ہوئی تھی کہ وہاں جان و مال کا سودا کر کے آنے والے لوگ موجود تھے جنھوں نے ہمہ تن اپنے آپ کو پیش کر دیا تھا اور ان کے ذریعے وہ تبدیلی آئی جس تبدیلی کے اثرات سے تاریخ آج بھری پڑی ہے۔

غیر منظّم قوتیں

لیکن اگر آپ یہ چاہیں کہ اصل فوج یعنی ہمہ وقت ہر قسم کی قوتیں لگانے والی فوج تو محاذ پر موجود نہ ہو اور اگر ہو تو بڑی قلیل تعداد برائے نام ہو لیکن محاذ کے پیچھے اسلام کے شائق، عام نعرہ باز، اسلام کو پسند کرنے والے اور غلبۂ اسلام کو چاہنے والے موجود رہیں۔ بکھرے بکھرے، متفرق، جن میں سے کسی کا جی چاہے تو وہ چار پیسے خدا کی راہ میں خرچ کر دے، کسی کو شوق ہو تو کوئی کتاب لے کر پڑھ لے، کسی کا جی چاہے تو وہ جلسے میں شریک ہو جائے، کسی کا جی چاہے تو وہ کہیں ووٹ دے آئے، کسی کا جی چاہے تو وہ کلمہ خیر مخالفوں میں یا دوستوں میں بیٹھ کر کہہ دے۔ اور اس میں یہ آزادی ہے کہ وہ کیا کام کتنا کرے اور کتنا نہ کرے۔ اس کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے، کوئی حساب لینے والا نہیں ہے اور وہ پابند نہیں ہے اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔ وہ اس امر کا بھی پابند نہیں ہے کہ کوئی آدمی اس کو حکم دے سکے کہ اس کام کو یوں کرنا ہے، اس کام کو فلاں

وقت کے لیے روک دینا ہے اور فلاں وقت پر شروع کرنا ہے۔ یہ حکم دینے والا کوئی نہیں کہ فلاں کے ساتھ تمہیں مل کر چلنا ہے اور فلاں کے ساتھ مل کر نہیں چلنا ہے۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔

اس طرح کے آزاد رضا کاروں کے بل پر اگر دنیا کا نظام چل سکے تو میرا یہ خیال ہے کہ کسی ملک میں کسی فوج کی ضرورت نہیں۔ تمام لوگ رضا کارانہ طور پر کہیں کہ جب کوئی حملہ ہوگا تو ہماری فوج حاضر ہے، ہمارا مال حاضر ہے اور ہم پروپیگنڈہ بھی کرتے رہیں گے اور دعائیں بھی دیتے رہیں گے، لیکن یہ آپ جانتے ہیں کہ اس طرح کے رضا کاروں کی ٹیم کے اوپر اور کسی بکھری ہوئی قوت کے اوپر کسی ملک کے دفاع کا انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ محرک قوت جو ہمدردوں، خیر خواہوں اور رضا کاروں سے اُن کے اپنے آزاد جذبے سے کچھ مشقتیں، کچھ خدمتیں انجام دلاتی ہے۔ وہ اپنا کام کرتی رہے اور اس سے پوری مہم چل جائے یہ ممکن نہیں، البتہ اصل فوجی قوت اگر محاذ پر موجود ہو اور کافی تعداد میں موجود ہو اور کافی سامانِ جنگ اور وافر اسبابِ رسد کے ساتھ موجود ہو تو اس کو تھوڑی بہت بھی مدد اگر باہر سے پہنچتی رہے اور آس پاس سے اس کو تعاون حاصل ہوتا رہے تو وہ بہت بڑی مضبوط قوت بن جائے گی اور نتیجہ خیز ثابت ہوگی۔

محبوں اور حامیوں سے اپیل

میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ میں ان لوگوں کی کوششوں کی کسی طرح بھی ناقدری کرنا چاہتا ہوں۔ جو لوگ جماعت میں کسی وجہ سے اگر شامل نہیں بھی ہیں تو اس کے باوجود وہ اپنی جان و مال سے اس کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، پس میں ان کی قدر کرتا ہوں اور ان کے لیے شکر گزاری کا جذبہ رکھتا ہوں، لیکن خدمتِ اسلام کا یہ مرتبہ آئیڈیل نہیں ہے۔ یہ وہ مقام نہیں ہے جس مقام پر آپ وہ مقصد حاصل کر سکیں جس مقصد کا ذکر میں نے اشارۃً پہلے کیا ہے۔ آپ کو بتایا ہے کہ ایک جماعت یہ کام اس دنیا میں کر کے ابھی ابھی گزری ہے، ہم اس کے پس ماندگان ہیں۔ اس جماعت کا ٹھیک تصور اگر ذہن میں آسکے تو پھر آپ کا کام یہ ہے کہ متفرق قوتوں کی شکل میں رہنے کے بجائے آپ جمع ہو کر اپنی قوتوں کو ایک مرکز پر لائیں اور ایک مرکز پر لا کر ایک نظام سمع و طاعت میں دیں۔ ایک امیر ہو جس کے پاس ایک سوئچ ہو۔ وہ اس سوئچ سے بجلی کی جس بتی کو چاہے روشن کر دے جس کو چاہے بجھا دے۔ لاؤڈ سپیکر کو چاہے چلانا ہو چلا دے، بند کرنا ہو بند

کر دے، لیکن اس کے سوئچ بورڈ کے دائرے سے آزاد قسم کی جتنی مشینیں چل رہی ہیں اور جتنی قوتیں کام کر رہی ہیں وہ اس کے کسی کام کی نہیں ہیں، اُس مشن کے لیے مفید نہیں جس مشن کے لیے ایک نظامِ جماعت کام کر رہا ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ حقیقی فیصلہ کن قوت بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنے آپ کو احیائے دین اور نفاذِ شریعت کے لیے اٹھنے والی جماعت کی رکنیت کے مقام پر لائیں اور اس مقام پر نہایت مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہوں اور اس کا حق ادا کریں۔ اس جماعت کی رکنیت کسی بیڈ منٹن کلب کی رکنیت کے برابر نہیں ہے، یہ کسی کاروباری فرم میں حصہ داری نہیں ہے۔ یہ کسی سیر و تفریح کی مجلس کی شرکت نہیں ہے۔ یہ کوئی سیاسی قسم کی پارٹی بازی اور گروہ بندی اور جتھہ بندی اور کسی فرقہ کی گروہ بندی نہیں ہے کہ جس میں آپ آئیں اور آپ کا نام لکھ دیا جائے اور اس میں آپ شریک ہو جائیں، بلکہ یہ نورِ ایمان کو اپنے اندر جذب کر کے شعوری طور پر پورے اسلام کو اپنے اوپر اور دنیا پر نافذ کرنے کا پروگرام ہے۔ اس پروگرام کو لے کر جن لوگوں کو اٹھنا ہو وہ اس جماعت کی طرف بڑھیں اور اس جماعت کی رکنیت کو قبول کریں۔

رکنیت کی ذمہ داریاں

رکن ہونے کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ رکنیت میں جب نام لکھوالیا تو آدمی یہ سمجھے کہ وہ منزل تک پہنچ گیا۔ کئی متفق ایسے ہمارے سامنے ہیں جن کے متعلق میں جانتا ہوں کہ رکنیت سے پہلے وہ زیادہ سرگرم تھے، لیکن رکنیت میں آنے کے بعد انھوں نے یہ محسوس کیا جیسے منزل پالی اور منزل پالینے کے بعد جیسے ان پر نیند طاری ہوگئی ہو۔ شاید ان اونگھتوں کو ٹھیلنے کا یہ بہانہ بھی مل گیا ہے کہ پہلے کے مراد پا جانے والوں میں غلط رویے دکھائی دیں۔

حقیقت یوں نہیں ہے کہ رکنیت اختیار کرنے کے بعد آپ فارغ ہو گئے۔ اللہ کے رجسٹر میں آپ کے نام لکھ دیئے گئے ہیں اور یہ کہ آپ کا ایک مرتبہ مقرر ہو گیا ہے اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ خوب سمجھ لیجیے کہ آپ کے رکن بننے کے بعد آپ کی ذمہ داریوں کا اصل آغاز ہوتا ہے اور یہ ذمہ داریاں اگر آپ پوری کریں گے تو خدا کے ہاں آپ کا مقام بنے گا۔ یہ پوری نہیں کریں گے تو یہ مقام نہیں بنے گا، چاہے ہم دنیا والے آپ کو سر آنکھوں پر کیوں نہ بٹھائیں اور آپ کے تقوے کے گُن کیوں نہ گائیں۔

ایمان واسلام کا اپنے اوپر نفاذ

مثلاً پہلی ذمہ داری ایک صاحبِ ایمان کی اور کسی بھی اسلامی نظامِ جماعت کے صحیح کارکن کی یہ ہے کہ وہ ایمان اور اسلام کو اپنے اوپر نافذ کرے۔ ایمان اور اسلام کو اپنے اوپر نافذ کرنے کے معنی کیا ہیں؟ میں اس کو آپ کے سامنے ایک نئے انداز میں پیش کرتا ہوں۔ یہ ہجرت کرنا ہے دراصل ایک طریقِ زندگی سے دوسرے طریقِ زندگی کی طرف، ایک طرح کی عادات سے دوسری طرح کی عادات کی طرف، ایک طرح کے افکار سے دوسری طرح کے افکار کی طرف، ایک طرح کے حالات سے دوسری طرح کے حالات کی طرف، تو یہ ایک پورا ٹرانسفارمیشن ہے جس سے آدمی اپنی زندگی کو گزارتا ہے۔ یہ ہجرت جس کا احادیث میں ذکر ہے اس کے متعلق حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے افضل ہجرت کی یہ تعریف فرمائی ہے کہ تو ہر اس بات سے ہجرت کرے جسے تیرا رب ناپسند کرتا ہے۔[1] جس خدا کی ناپسندیدہ چیزیں ہی نہ چھوڑیں تو ہجرت کا ہے کی۔ پس یہ ایک مکمل تغیرِ فکر وعمل ہے۔ اصل ہجرت کا آغاز آدمی ایمان لانے کے ساتھ کرتا ہے اور اگر یہ ہجرت وہ نہیں کرتا بلکہ جن اعمال میں، جن فتنوں میں اور جن مصیبتوں میں وہ پہلے سے پڑا ہوا ہے اور جن دل چسپیوں میں اس کو پہلے دل چسپی تھی انھیں سے وابستہ رہتا ہے تو پھر دراصل اس نے وہ ہجرت ہی نہیں کی جو ایمان واسلام قبول کرنے کے بعد ہونی چاہیے۔ افکار، اقوال اور اعمال سب میں ایمان کی وجہ سے واقع ہونے والی یہ مکمل تبدیلی آج کم ہی ذہنوں کی گرفت میں آتی ہے۔ اس طرح کے کایا پلٹ دینے والے ایمان کا آج عام طور پر تصور کرنا مشکل ہو رہا ہے۔

جس انسانی زندگی میں ایمان داخل ہو جائے اس میں عبادات بھی پیدا ہونی چاہئیں، اس میں ذکر بھی پیدا ہونا چاہیے۔ اس میں علم بھی پیدا ہونا چاہیے، اس میں اخلاق بھی آجانے چاہئیں۔ اس میں پابندیٔ نظامِ اوقات بھی اور شائستگیِ اطوار بھی اور خیر وخوبی کی ہر دوسری چیز بھی اس میں آجانی چاہیے۔ اور یہ احساس بھی آجانا چاہیے کہ میرے ذمے کیا ذمہ داریاں ہیں۔

---

(۱) مسند احمد ج:۲، ص:۱۶۰ روایت عبداللہ بن عمرو العاص

ذمہ داریِ دعوت

اپنے فکر و کردار کی درستی کے بعد بڑی ذمہ داری دعوت کی ذمہ داری ہے، یعنی ہر سچا مسلمان اور ہر رکنِ جماعتِ اسلامی داعی الی اللہ اور داعی الی الحق ہے۔ اگر وہ یہ نہیں ہے، اگر اس کام کو چھوڑ کے، کاغذات تہ کر کے اور اس فائل کو بند کر کے بیٹھ جاتا ہے تو دراصل وہ اپنی بڑی ذمہ داری کو ترک کر دیتا ہے جس کے لیے اس کو کھڑا کیا گیا ہے۔ اس میں سب سے پہلا مخاطب اپنا وہ خود ہے جیسا کہ پہلے میں ذکر کر چکا ہوں۔ اپنے آپ کو دعوت دے۔ اپنے آپ کو اس انحراف سے بچائے، اپنے آپ کو خدا اور رسولؐ کے راستے پر لے کر چلے اور اپنے گھر پر توجہ کرے اور اپنے آس پاس اور اپنے معاشرے میں نگاہ کو پھیلاتا چلا جائے خواہ جہاں تک بھی جا سکتی ہو۔ یہ کئی دائرے مختلف ہیں۔

ایک دائرہ،

دوسرا دائرہ،

پھر تیسرا دائرہ،

یہ سب دائرے پھیلتے چلے جائیں گے۔ کسی جگہ کام رُکے گا نہیں۔ پھر یہ کہ دعوت دینے کا کام مختلف سطحوں پر انجام دیا جائے گا۔ شہریوں کی سطح پر، دیہاتیوں کی سطح پر، بہت پڑھے لکھے لوگوں میں، ان پڑھ لوگوں میں، وکلا میں، دانشوروں میں، اساتذہ میں، نوجوانوں میں، بوڑھوں میں، بچوں میں، عورتوں میں، نوجوان خواتین میں، ہر دائرے کے اندر اس دعوت کو نفوذ کرنا چاہیے۔ اس کے لیے محرّکِ اوّل بہ ہر حال کارکن ہوتا ہے۔ مختلف طریقوں کا مطلب یہ ہے کہ یہ دعوت ادب سے بھی دی جائے، علم سے بھی دی جائے، دماغ سے بھی دی جائے، مال سے بھی دی جائے اور ہر وہ طریقہ اور ہر وہ ذریعہ جس ذریعے سے آپ اپنا یہ دعویٰ، یہ پیغام دوستوں تک منتقل کر سکتے ہیں، اسے کام میں لائیں۔ یہ کام مختلف سطحوں پر اور مختلف شکلوں میں ہونا چاہیے، کہیں انفرادی طور پر، کہیں گروہ بنا کر، کہیں جتھے بنا کر، کہیں وفد بنا کر، کہیں کیمپ لگا کر، کہیں سفر کر کے، کہیں دور دراز جا کر کسی دوسرے مقام پر کام کر کے، ہر اس طریقے سے اس دعوت کو پھیلانا اور ہر کسی کی سمجھ کے مطابق بنانا لازم ہے۔ کچھ لوگ ایک سطح کی زبان میں کام

کریں تو کچھ دوسرے لوگ دوسری سطح کی زبان میں بولیں۔ کچھ لوگ ایک سطح کی زبان میں پیغام پھیلائیں۔ دیہاتی علاقوں میں بالکل دیہاتیوں کی سمجھ بوجھ کے مطابق مثالیں واضح کریں، کچھ ان کے قریب کے ماحول کو نظر میں رکھ کر بات کریں۔ اس طرح سے ہر قسم کے لوگ ہر قسم کے ماحول کو سامنے رکھ کر کام کریں۔

شاہدِ حق بننا

دعوتِ حق پر کاربن ہونے والے کارکن جماعت اور رکن جماعت کی تیسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اللہ کا گواہ بن کر اور حق کا شاہد بن کر اٹھے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہی یہی ہے: **يَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَآءَ** ؕ یعنی شہداء علی الناس (آل عمران: ۱۴۰)

یہ بہترین منصب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دیا ہے۔ خوش قسمت ہے جسے نصیب ہو جائے۔ وہ اُس کا ''شاہد'' بن کر اٹھے اور زندگی بھر جہاں بھی رہے یہی شہادت دے اور زندگی کا خاتمہ ہو تو بھی اسی شہادتِ حق پر اس کی موت ہو۔ یہی بہترین زندگی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے۔ بندۂ مومن کا خدا کی گواہی دینے کے لیے اٹھنا، اس کے لیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا، اس کے لیے اپنے اعمال کے ذریعے سے بھی، اپنی زبان کے ذریعے سے بھی، اپنے تعلقات اور رابطوں کے ذریعے سے بھی، اپنی دل چسپیوں اور مشاغل کے ذریعے سے بھی ہر طرح سے لوگوں کو متاثر کرنا اور جہاں کہیں بھی منکرات سامنے آئیں اُن منکرات سے قوم اور انسانیت کو بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا ـــــ جو کچھ امکان میں ہو اور حدِ جواز میں ہو، لیکن اس سے زیادہ قوت اگر درکار ہو تو انتظار کرنا اس وقت کا جب زیادہ قوت حاصل ہو جائے اور معاشرے کی زیادہ بڑی خرابی کو دور کیا جا سکے۔ یہ سارا کام شہادت علی الناس کی تعریف میں آتا ہے۔ اس سارے کام کو سیاست میں بھی اور پارلیمان میں بھی اور عام دائروں میں بھی، جن میں آپ کام کرتے ہیں، انجام دیا جانا ہے۔

اس شہادت کے دیے جانے کے معنی یہ ہیں کہ ایک رکن جماعت یا ایک مومنِ خالص اپنے کردار اور اپنی گفتار کے ذریعے سے اپنے آپ کو دنیا کے سامنے اس طرح واضح کر دے کہ میں ایک مختلف چیز ہوں۔ وہ یہ محسوس کرا دے۔ اپنے گردوپیش اور اپنے آس پاس کے لوگوں کو،

اپنے رشتہ داروں کو، اپنے پڑوسیوں کو، اپنے گاہکوں کو، بیچنے اور خریدنے والوں کو کہ میں دوسروں سے مختلف چیز ہوں۔ میرے دفتر میں اگر کوئی آئے گا تو وہ یہاں ایک مختلف فضا پائے گا۔ کسی اور دفتر میں جائے گا تو وہاں دوسرا رنگ دیکھے گا۔ جب تک آپ شہادت علی الناس کا یہ تقاضا نہ پورا کریں، آپ کو دیکھتے ہی، آپ سے ملتے جلتے ہی، آپ سے رابطہ پیدا کرتے ہی، آپ سے معاملات شروع کرتے ہی، آپ کی ایک جداگانہ شخصیت نبیؐ پاک کے رنگ میں رنگی ہوئی سامنے نہ آئے اور یہ محسوس نہ ہو کہ یہ آدمی سارے ماحول سے مختلف ہے۔ اس وقت تک آپ شہادتِ حق کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے۔

کُوۡنُوۡا اَنۡصَارَاللّٰہِ

تو ایک ذمہ داری یہ ہے کہ آپ کو ممتاز کردار سرگرمیوں اور رویوں کے ساتھ حزبُ اللہ کی صف میں اپنے آپ کو کھڑا کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مجاہد بننا ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے:

کُوۡنُوۡۤا اَنۡصَارَاللّٰہِ

اللہ کے مددگار بنو اس مہم میں

کس مہم میں؟

اس کا ذکر میں کر دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دشمن یہ چاہتے ہیں:

یُرِیۡدُوۡنَ لِیُطۡفِئُوۡا نُوۡرَاللّٰہِ بِاَفۡوَاھِہِمۡ

''ان کی کوشش یہ ہے کہ خدا کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔''

وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ٥

''لیکن اللہ تعالیٰ اپنے دین حق کے نور کو مکمل کرنا چاہتا ہے اگر چہ کفار کو ناپسند لگے۔''

اس میں بڑی شدّت سے بیان کی۔ اللہ تعالیٰ نے ٹھان لیا ہے کہ وہ اپنے نور کو فروزاں تر کر کے رہے گا۔ جن مسلمانوں کے سامنے یہ بات رکھی گئی تھی، انھیں دراصل یہ سکھایا گیا تھا کہ تم یہ بات لے کر اٹھو کہ اگرچہ دشمن اندھیروں کو غالب رکھنے کے لیے پورا زور لگائیں گے، لیکن

تمھیں بہ ہر حال اندھیروں سے لڑکر، اُن کے پُرزے اُڑا کر، ساری فضا کو خدا کے نور کی جگ مگاہٹ سے مالا مال کر دینا ہے۔ اس سے کم تر کوئی مقام تمھارے لیے نہیں ہے۔ وہ نور جہاں اُبھرتا نظر آئے گا۔ وہ فنون کی شکل میں نظر آئے گا، گفتار کی شکل میں، اعمال کی شکل میں، وہ ہر شکل میں جگ مگائے گا۔ اللہ کی شمع روشن ہوگی اور اندھیرے شکست کھائیں گے۔ یہ عزم لے کر آپ کو اٹھنا ہے۔ اُسی شدّت کے ساتھ، اُسی تشدید کے ساتھ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تاکید کر کے فرمایا ہے:

وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝۸ (الصّف:۸)

اللہ کو بہ ہر حال اپنے نور کو پورا کرنا ہے، چاہے یہ کافر لوگ یا منکر لوگ کتنا ہی انکار کریں اور کتنا ہی اس سے گریز کریں۔

اسی حقیقت کو دوسری طرح فرمایا کہ اللہ نے تو دینِ حق اور نظامِ حق اور نظامِ ہدایت کو اس لیے بھیجا ہے دنیا میں کہ اس کو غالب کر دیا جائے، چاہے مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔

یہاں پھر وہی بات دہرائی گئی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اس دین کو اور اس نظامِ قانون کو دنیا میں غالب کر کے دکھایا جائے۔ یہ غالب کرنے کی مہم وہ مہم ہے جس کے لیے مجاہدانہ تگ و تاز کی ضرورت ہے۔ اور ایمان لانے والا آدمی اصل میں پہلے دن ہی دائرہ جہاد میں قدم رکھ دیتا ہے۔ اس کی دعوت بھی جہاد ہے، اس کی ہجرت بھی جہاد ہے، اس کا صرفِ مال بھی جہاد ہے، اس کا صبر سے سب مصیبتیں سہنا بھی جہاد ہے اور اس کا میدانِ جنگ میں جا کر سر کٹانا بھی جہاد ہے۔ یہ ساری چیزیں جہاد ہیں اور ہاں سیاست کے پیچ و خم سے عہدہ برآ ہونا بھی اس کا جہاد ہے۔

سمع و طاعت

اب آگے چلیے،

میں یہ سمجھتا ہوں کہ تحریکِ اسلامی کا ادنیٰ ترین آدمی بھی اتنا شعور رکھتا ہے کہ وہ نظامِ سمع و طاعت کے اندر اپنے آپ کو کسنے کے لیے پیش کر دے یعنی یہ کہ اپنی ساری متاع، اپنا سارا وقت، اپنی ساری سرگرمیاں، اپنی ساری دل چسپیاں، اپنا سب کچھ، نظمِ جماعت کے سامنے رکھ دے کہ مجھے جدھر کا حکم دیا جائے گا اور انسانی قوتوں اور ذمہ داریوں کے اندر جدھر بھی مجھے راستہ بنا کے دیا جائے گا کہ اِدھر جانا ہے، میں ادھر جاؤں گا۔ اس نظامِ سمع و طاعت کا چلنا اس کے بغیر

ممکن نہیں ہے کہ آپ کے اندر اپنے امراء کے لیے احترام پایا جائے، امیر جماعت کے لیے، نائب امراء کے لیے، قیمین کے لیے، دوسرے تمام ماتحت اصحابِ امر، حتیٰ کہ مقامی امیر یا مقامی قیم کے لیے بھی آپ کے اندر ایک طرح کا احترام پایا جانا چاہیے۔ ایک طرح کی محبت پائی جانی چاہیے۔ نفرت نہیں پائی جانی چاہیے۔ ایک دوسرے کے خلاف حملہ آور نہیں ہونا چاہیے۔ نفرت نہیں پائی جانی چاہیے۔ ایک دوسرے کے خلاف حملہ آور نہیں ہونا چاہیے، لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ارکان و کارکنانِ تحریک بھیڑ بکریاں بن جائیں۔ میں اس کی سخت تردید کرتا ہوں کہ کسی شخص کو کسی عہدے پر پہنچ کر بت بننے کا حق حاصل ہے۔ ہماری جماعت میں یہ حق کسی کو حاصل نہیں ہے، جو بات کہنی ہو، جو بات جہاں گرفت کرنے کی ہو اس کو ضرور کہیے۔ اِس لیے میں یہ کہنا چاہتا ہوں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہ ایک رکن جماعت کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ پوری تحریک ایک ٹرسٹ ہے جس کا وہ ٹرسٹی ہے۔ آپ کے دستور میں بھی یہ لکھا ہوا ہے۔

تحریک کے ٹرسٹی

خوب ذہن نشین کر لیجیے کہ آپ تحریک کے ٹرسٹ کے ٹرسٹی ہیں!

اس کے سپاہی ہیں،

نظامِ جماعت کے آپ سنتری ہیں،

آپ بیت المال کے محتسب ہیں،

اپنے شعوری ذمہ دارانہ مقام پر ایک رکن کو ہونا چاہیے نہ کہ بے شعوری اور جمود کے کسی دوسرے ادنیٰ مقام پر۔ تحریک کے ٹرسٹی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تحریک پر نگاہ رکھیں کہ جس اصول و مقصد پر یہ قائم کی گئی ہے اس کے مطابق اس کو چلنا چاہیے۔ دیکھتے رہیے کہ جو منزلیں پہلے سے بتائی گئی ہیں، وہی منزلیں راہ میں آتی ہیں یا نہیں۔ ایک ایک منزل پر سوچیں اور ایک ایک قدم پر نظر ڈالیں کہ جو سفر آپ نے طے کیا ہے، ٹھیک انھی خطوط پر طے کیا ہے جنھیں پہلے بیٹھ کر اطمینان سے سوچا تھا، کتاب وسنت کی روشنی میں سوچا تھا۔

اگر کوئی خلل محسوس ہو

اگر اس ٹرسٹ میں کوئی فرق آپ پائیں تو اوّل تو ممکن ہے کہ آپ کو مغالطہ لگا ہو، ممکن

ہے آپ غلط فہمی سے دوچار ہوئے ہوں۔ آپ کی غلط فہمی رفع ہوسکتی ہے، لیکن یہ کہ اس کو پیش ضرور کردیں۔ مجھ سے اگر کہہ دیں کہ تم نے فلاں جگہ تحریک سے انحراف کیا ہے، یہ میرا فرض ہے کہ میں محبت سے بیٹھ کر آپ کو جواب دوں کہ صاحب! میں نے اپنی طرف سے یوں سوچا اور یوں کیا اور یوں نہیں کیا۔ یہ دوطرفہ عمل ہے۔ یعنی آپ اس کے ٹرسٹی ہیں۔ اس کا مجھے بھی ٹرسٹی ماننا چاہیے آپ کو۔ آپ ٹرسٹی ہیں، میں آپ کے ساتھ کھڑا ہوں، یہاں پر سارے کام اس طرح چل رہے ہیں کہ آپ کی مرضی سے، آپ کی ووٹنگ سے اور آپ کی رائے دہی سے۔ اور یہ سب کچھ مبنی ہے ایسی محکم دلیل وبیّنہ پر جس کا سرچشمہ کتاب وسنت ہے۔ دلیل امرا واہلِ منصب کی طرف سے بھی ـــــ اور دلیل ارکان اور ''ٹرسٹیوں'' اور محتسبین اور ناقدین کی طرف سے بھی اور اپنے درجے میں کارکنان کی طرف سے بھی۔ حتیٰ کہ ہر مسلمان ہم سے پوچھ سکتا ہے کہ تم واضح کرو کہ تم نے فلاں کام کتاب وسنت کے مطابق کیا اور کتاب وسنت کے منصوص اصولوں کے تحت احیائے اسلام کے لیے جس متفق علیہ ـــــ اور برسوں سے متفق علیہ طریق پر کام ہورہا تھا اور جو جماعت کے امتیازی وجود کی روح ہے اور جس سے اس کا تشخص قائم ہے، اسے توڑے پھوڑے بغیر کیا؟

آپ نظامِ جماعت کے سنتری ہیں، یعنی نظامِ جماعت کے پورے سلسلہ کار کو دیکھتے رہیے۔ نہ یہ کہ ایک بار حلفِ رکنیت لینے کے بعد ہمیشہ کے لیے غافل ہوکر بیٹھ رہنا اور احوالِ جماعت سے بے تعلق ہوجانا یا کسی رکن کا آنکھیں بند کرلینا اور پھر سوچنا کہ اچھا اوکاڑہ میں یہ ہوجائے، اچھا ساہیوال میں وہ ہوجائے، اچھا مرکز میں یہ ہوجائے اور خود بہ خود ہوجائے۔ اس کے معنی یہی ہوئے کہ ان سب امور کو چھوڑ کر ہر رکن بیٹھ جائے۔ ایسا ہو تو میرا خیال ہے کہ اس کے بعد تحریک کو خراب ہونے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ آپ جس چیز کو محسوس کریں، ایمان داری کے ساتھ، ضمیر کی گہرائی کے ساتھ اور اس احساس کے ساتھ کہ اس میں غلطی ہوسکتی ہے اس چیز کو لازماً اپنے ذمہ داروں کے سامنے رکھیں۔ یہ دیکھ لیں کہ اس کا تعلق کس دائرۂ ذمہ داری سے ہے۔ جس دائرے میں دستور اجازت دیتا ہے اسی میں اس کو لائیں۔ اپنے آپ کو مغالطوں سے نکالیں یا دوسروں کو مطمئن کریں۔

بیت المال کی نگرانی

تیسرا یہ کہ بیت المال پر بھی آپ کی نظر ہونی چاہیے۔ مقامی بیت المال سے لے کر آخری بیت المال تک ہر جگہ آپ یہ دیکھیں گے کہ کیا مصارف اٹھ رہے ہیں۔

اوّلاً، اہلِ مناصب پر کیا مصارف اٹھ رہے ہیں؟

ثانیاً، اشیاء و وسائل پر کیا مصارف اٹھ رہے ہیں؟

کوئی نظام چلتا ہے تو کتنے میں چلتا ہے۔ کس طرح چلتا ہے؟

مصارف کا اوسط تناسب فی رکن کیا ہے اور سالانہ مصارف کی تعداد کے مقابلے میں دعوت و تحریک اور اس کے ارکان و کارکنان میں کس رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے کوئی اندازہ ہونا چاہیے کہ کتنے مصارف سے ایک آدمی ہاتھ آتا ہے۔

یہ ساری نگہداشت کرنا کہ ارکان کی اخلاقی حالت کیا ہے، ارکان میں اگر کسی جگہ جمود موجود ہے تو کیوں ہے؟ لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہیں تو کیوں کرتے ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی آپ کو خبر داری رکھنی چاہیے۔ آپ کے سامنے کوئی نجویٰ کرے۔ آپ کے سامنے کوئی شخص دوسرے کی غیبت کرے تو اسے روک دیجیے۔ پھر پوچھیے کہ صاحب! غیبت آپ نے کس لیے کی۔ آپ متعلقہ شخص سے مل کر کیوں نہ بات کر سکے اور اس طرح اگر کوئی چغلی کھانے کے لیے آتا ہے، وہ آ کے ایک تیسرے فریق کے متعلق اگر کسی کو کچھ کہتا ہے کہ فلاں شخص یہ کرتا ہے اور اس سے یہ سرزد ہو رہا ہے، تو ایسی صورت میں اس کے لیے لازم ہے کہ جو صاحب مخاطب ہوں وہ تیسرے فریق کو بھی وہاں بلائیں، ورنہ اگر وہ نہیں بلائیں گے تو یہ چغلی ہوگی۔ سنانے والا چغلی سنائے گا اور سننے والا چغلی سنے گا۔ خوب سمجھ لیں کہ یہ گناہ کا کام ہے اور اس کا بوجھ اٹھانا آپ کی ذمہ داری ہے۔ اگر ہمارے اخلاق احوال اور نظریاتی شعور میں کوئی بڑا خلل آنے لگے تو آپ آگاہ کریں ذمہ دار طبقے کو کہ یہاں آگ لگ رہی ہے۔[1] ٹھیک ہے اس کے بعد اگر آپ کو گالیاں سننا پڑیں تو گالیاں سنیں۔ یا آپ کو آگے سے جواب ملے کہ غلط کہتے ہو، ہر طرف پھول

---

(۱) بات کے اصل مخاطب جب بات نہ سنیں، یا سرسری توجہ دیں، یا دلیل سے مطمئن نہ کریں، یا بات کرنے والے کو ناپسندیدہ معتوب قرار دے دیں یا بات کرنے کے مواقع پر راستے نہ کھلے رہیں تو پھر اچھے افراد کی احتیاطوں کے باوجود غیبت اور چغلی اور نجویٰ اور عام چرچوں کی وبائیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ پھر جو بچنا چاہتا ہے وہ بھی نہیں بچ سکتا۔

کھل رہے ہیں تو کہہ دیں کہ مجھے تو صرف کانٹے نظر آ رہے ہیں۔

اگر مجھ سے آپ بات کریں اور میں آپ کو ڈانٹ دوں تو آپ میری ڈانٹ سننے کے بعد کہیں کہ یہ خدا کے حکم کا تقاضا ہے، میں اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔ یہ ذمہ داریاں ہیں ٹرسٹی کی جن کو آپ اچھی طرح نگاہ میں رکھیں، کیونکہ قیامت کے دن ''ٹرسٹی'' کی جواب دہی بھی بڑی سخت ہوگی۔

سچی خیر خواہی

جماعتی زندگی اور نظامِ سمع و طاعت اور تنقید و احتساب میں سچی خیر خواہی بنیادی چیز ہے، یعنی جب کسی سے بات کریں، مثلاً کسی رکن کی اصلاح کے لیے یا اس کی بھلائی کے لیے بات کریں یا تنقید کی بات کریں، اپنے سے بڑے عہدیدار کے سامنے کوئی بات کریں، اگر امیر جماعت کے متعلق کوئی بات کریں، تو اوپر سے نیچے تک جس مقام پر بھی آپ کو بات کرنی ہو اپنے اندر جذبۂ خیر خواہی پیدا کریں۔ اسے شگفتہ قسم کا جذبۂ خیر خواہی آپ کہہ سکتے ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ جناب مجھے یہ محسوس ہوا ہے۔ ضدم ضدّا کی کوئی بات نہیں۔ ایک غیر واضح بات کو واضح کر دیجیے۔ اس کے بعد جو جواب ملتا ہے، اسے سنئے، اسے سمجھئے اور کوئی مناظرہ و مکالمہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کیجیے، بلکہ یہ سمجھیے کہ آپ نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی، مگر بے اطمینانی باقی رہے تو گفتگو جاری رکھیے، صمٌّ بکمٌ ہونا مطلوب نہیں۔ آپ کا مطمئن ہونا ضروری ہے۔

درپیش نقشۂ احوال

مشرق سے لے کر مغرب تک ہر طرف سامراجی قوتیں اکٹھی ہیں اور اس بات پر متفق ہیں کہ احیائے اسلام کی تحریک کو سر نہ اٹھانے دیں۔ ان باتوں کا تحریری ریکارڈ موجود ہے۔ اخباروں اور رسالوں میں یہ چیزیں چھپ چکی ہیں اور کتابوں میں چھپنے کے علاوہ جو دوسرے ذرائع سے معلومات مل سکتی ہیں وہ ساری بھی ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں اور جو کچھ عملی رویہ عالمی قوتوں کا ہے وہ بھی آپ میں سے ہر شخص کے سامنے ہے۔

مصر میں دیکھ لیجیے،

یہاں دیکھ لیجیے،

ترکی میں دیکھ لیجیے،

انڈونیشیا میں دیکھ لیجے،

کسی اور جگہ دیکھ لیجیے۔ ان سامراجی قوتوں نے ایسی اسکیم بنائی ہے کہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہی مسلمان قوتوں کو کچلوا دیں۔ مسلمانوں ہی کو سیکولرازم کا علم بردار بنائیں۔ اور مسلمانوں ہی کے ذریعے سے ان مسلمانوں کو جو اسلام کا احیاء چاہتے ہیں، کچلوا دیں۔ وہ نوجوان تنظیمیں ہوں یا وہ باقاعدہ سیاسی جماعتیں ہوں، یا وہ بڑے لیڈر ہوں اور کسی بھی طرح اثر انداز ہو رہے ہوں، حتیٰ کہ لڑکیاں ہوں۔ ان سب کے خلاف محاذ آراستہ ہیں۔ اب ترکی میں یہ جنگ یوں ہو رہی ہے کہ لڑکیاں سر پر دوپٹہ لے کر یونیورسٹی میں قدم نہیں رکھ سکتیں۔ اس کے ردِعمل میں وہاں لڑکوں نے سروں پر پگڑیاں باندھنا شروع کر دیں۔ کہ اچھا تم یہ نہیں کرنے دیتے ہو تو اب بتاؤ ہم پگڑیاں باندھ کر آئیں گے، لڑکیاں بھی آ رہی ہیں اسکارف یا دوپٹے لے کر۔ دراصل میں اس کش مکش کا تصور دلانا چاہتا ہوں جس کا ہم سامنا کر رہے ہیں۔

اسلام کے خلاف مسلمانوں کی مزاحمت

یہ اتنی بڑی کش مکش ہے کہ ہمارے اپنے ملکوں میں ہمارے اپنے اندر لادینیت کے داعی اور مبلغ کام کررہے ہیں۔ اخباروں میں لکھ رہے ہیں۔ تمام ذرائع ابلاغ پر چھائے ہوئے ہیں۔ ہر طرف سے ان کی آواز آتی ہے، ان کے خیالات آتے ہیں اور ہم ان سے کچھ نہ کچھ متاثر ہوتے ہیں۔ متاثر ان معنوں میں کہ یہ لوگ بار بار ہمارے سامنے آتے ہیں، ہمارے ذہنوں پر بوجھ ڈالتے ہیں۔ یہ سب ہو رہا ہے۔

پھر یہاں حکمرانوں کے بعد اداکاروں، فن کاروں، گلوکاروں، ایکٹروں اور کرکٹروں (صنفِ نازک، اس میں لیڈیز فرسٹ کے اصول پر اہمیت رکھتی ہے) کی تصویروں، انٹرویوز اور خبروں کا ایک سیلاب ہے جس میں ہمارے دل و دماغ غرق ہو رہے ہیں۔ مدّعائے اعداء یہ ہے کہ یہ طبقے معاشرے کی صفِ اوّل میں رہیں اور اہلِ دین اور اہلِ شرافت اور بڑی بڑی عوامی خدمات انجام دینے والے عناصر صفِ آخر میں پھینک دیئے جائیں۔ لباسوں میں نئی تراش خراش، بالوں کے ڈیزائنوں اور میک اَپ کے فنون پر صفحے کے صفحے چھپتے ہیں۔ اور اس مہم کے اثرات ونتائج بہت واضح ہیں۔

اسمبلیوں میں جو باتیں ہوتی ہیں، آپ ان کو دیکھیں، وزراو عمائد کی زبان سے جو ہوتی ہیں ان کو آپ ملاحظہ فرمائیں، ان سب میں یہ چیز جھلک رہی ہے۔ اور دوسری طرف یہاں سیاست کی وہ شطرنج بچھی ہوئی ہے کہ ساری بازی بادشاہ اور وزیر کے لیے ہو رہی ہے اور پیادے دونوں طرف مارے جاتے ہیں۔ سالہا سال سے کئی شاہ و وزیر جیتتے ہیں اور پھر بدلتے ہیں۔ کبھی ایک جیت جاتا ہے، کبھی دوسرا جیت جاتا ہے۔ شاہ اور وزیر سلامت ہیں، باقی پیادوں کی خیر نہیں۔

یہ ہے سیاست یہاں کی جس کا خلاصہ میں نے بیان کیا ہے۔ باقی معیشت اور معاشرت کا یہ عالم ہے کہ یہاں جاگیرداری اور وڈیرہ ازم اور ان کے ساتھ بیوروکریسی ان قوتوں نے مل کر ایک ایسا گٹھ جوڑ بنایا ہے جس گٹھ جوڑ کے قابو میں سارا ملک آیا ہوا ہے اور یہاں ظلم کی ایک چکّی ان قوتوں کے ہاتھوں سے چل رہی ہے، جس چکّی میں محنت کش عوام اور غریب لوگ پس رہے ہیں۔ اور برسوں سے ان کا خاکہ اڑ رہا ہے اور کوئی اس کو روکنے والا نہیں ہے۔

انقلابی عزم کی ضرورت

میں یہ کہتا ہوں کہ آج سے آپ لوگ یہ عزم لے کر اٹھیں اور آگے بڑھیں کہ ہم اس ظلم کی اور خباثت کی اور فحاشی اور عیاشی کی چکی کو روکیں گے۔ آپ وقت کے لحاظ سے بالکل نہ گھبرائیں۔ خدا کے دین کے کام میں وقت کا اور ٹائم ٹیبل کا کوئی حساب نہیں۔ یہاں تو حساب ہے کام کی مقدار کا۔ آپ مجھے سال میں، دو سال میں اتنے زور سے کام کر کے دکھایئے جیسا دعوتِ حق کا تقاضا ہے تو اسلامی انقلاب کی تکمیل میں زیادہ مدّت نہیں لگے گی۔

میں نے لاہور میں ایک دفعہ تجویز پیش کی تھی جس میں میں نے کہا تھا کہ اپنے لیے طے کریں کہ ہر آدمی پچاس آدمیوں سے سال بھر میں ملاقاتیں اور گفتگوئیں کرے گا یعنی تقریباً ہر ہفتے میں ایک آدمی سے۔ لیکن اس تجویز کو قبول نہیں کیا گیا اس کے بعد خدا کے دین سے کامیابی کا ٹائم ٹیبل پوچھنا چہ معنیٰ دارد؟ میں یہ کہتا ہوں کہ اگر یہ اوسط بھی آپ رکھ سکیں جو اگرچہ بہت کم ہے اور اس کو بڑھایا جا سکتا ہے تو اس کے مطابق بھی آپ اپنی قوت کو دوگنا چوگنا کر کے خدا اور امیر جماعت کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔ رائے عامہ اگر اس رفتار سے تیار ہوتی جائے تو یہ بالکل بے معنیٰ باتیں ہیں کہ انقلاب نہیں آ سکتا۔ کہنا یہ چاہیے کہ دراصل کوئی طریقہ اس کو روکنے کا نہیں۔

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ انقلاب نہ آئے۔
کسی توڑ پھوڑ کی ضرورت نہیں ہے۔
کسی فساد کی ضرورت نہیں ہے۔
کسی ہنگامے کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر آپ زیرِ سطح خاموش کام کر کے رائے عامہ کی اتنی تیاری کے لیے کمر بستہ ہوں اور امید کی جا سکتی ہے کہ نئے آدمی بھی اٹھ کھڑے ہوں گے تو آپ یقین جانیے کہ اس ملک میں پھر انقلاب کو روکا نہیں جا سکتا اور میں یہ کہتا ہوں کہ آپ کام کریں تو وہ وقت بہت قریب آ سکتا ہے۔

اوپر کے عرض کردہ معیارِ کار کو چھوڑ کر بدرجۂ آخر میں یہ عرض کر دوں گا کہ اگر آپ میں سے ہر شخص سال میں ایک آدمی دین کا اتباع اختیار کر کے اعلائے کلمۃ اللہ کا کام کرنے والا فراہم کرتا رہے تو بھی بہت جلد مہم سر کی جا سکتی ہے، لیکن اگر آپ یہ سمجھیں کہ بہت سے دفتر کھول کر، بہت

سے عہدہ دار اور ہمہ وقتی کارکن بھرتی کر کے اور بہت سے جلسے اور جلوس کر کے بازی جیتی جا سکتی ہے تو پھر یہ ایک ایسا خواب ہے جس کی عملاً تعبیر کبھی سامنے نہ آئے گی۔

اِتمام کا کام

آخر میں یہ کہوں گا کہ اسلامی تحریک اور اسلامی انقلاب یا جہادِ انقلاب کی اس مہم کو چلانے کے لیے جو اصل قوت درکار ہے وہ مکمل اور مضبوط ارکان کی ہے۔ باقی سارے محبوں اور حامیوں اور متفقوں اور ہم دردوں کا تعاون آپ سے آپ حاصل ہوگا۔ گاڑی چلانے والی اصل قوت ارکان کی قوت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ مسئلہ بالکل صاف تھا۔ کچھ لوگوں کو پوری طرح اللہ کے ساتھ ہو کے چلنا ہے اور کچھ لوگوں کو خدا اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین کی مخالفت کرنی ہے۔ ایک طرف مومن اور دوسری طرف کافر۔ بعد میں ایک تیسری قسم منافقین کی نمودار ہوئی، مگر مومن بہ ہر حال ایک ہی سانچے کے لوگ تھے جنھوں نے مال و جان سب کچھ خدا سے سودا کر کے بیچ دیا۔

آج ہماری مشکل یہ ہے کہ اصل ابتدائی جماعت کے بکھر جانے کے بعد مسلمانوں کی کئی اقسام پیدا ہوگئی ہیں۔ ہم خواہش رکھتے ہیں جو کوئی بھی دین کی جس حد تک خدمت کر سکتا ہے کرے، مگر ہماری خواہش یہ بھی ہے کہ تحریک انقلابِ اسلامی کو اول درجے کے اہلِ ایمان، رکنیت کی پوری پوری ذمہ داریوں کے ساتھ چلائیں۔ کم سے کم PILOT اسی قوت کو ہونا چاہیے۔ آخر میں میں سارے مسلمان بھائیوں کو دعوت دیتا ہوں کہ خدمتِ دین کے لیے پورے دل و جان کے ساتھ اٹھو اور معیاری کام کرنے کے ارادے سے اٹھو۔ ہم آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

لیکن جو اصحاب فوری طور پر فرنٹ لائن پر نہ آ سکیں وہ محاذ نمبر ۲ قائم کر کے احیائے اسلام کے معرکہ کو قوت پہنچائیں۔ اور بعد میں آہستہ آہستہ دین کی حقیقت، اسلامی نصب العین اور غلبۂ دین کے طریقِ کار کو سمجھ کر قدم آگے بڑھائیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو اپنی نیتوں، ارادوں، ذوق و شوق، سعی و جہد اور خدماتِ حق کی خدا کے ہاں بہت بڑی جزا حاصل ہو جائے۔
